مولانا ظفر علی خاں

بحیثیت صحافی

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
ایم اے، پی ایچ ڈی

مکتبۂ اسلوب کراچی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

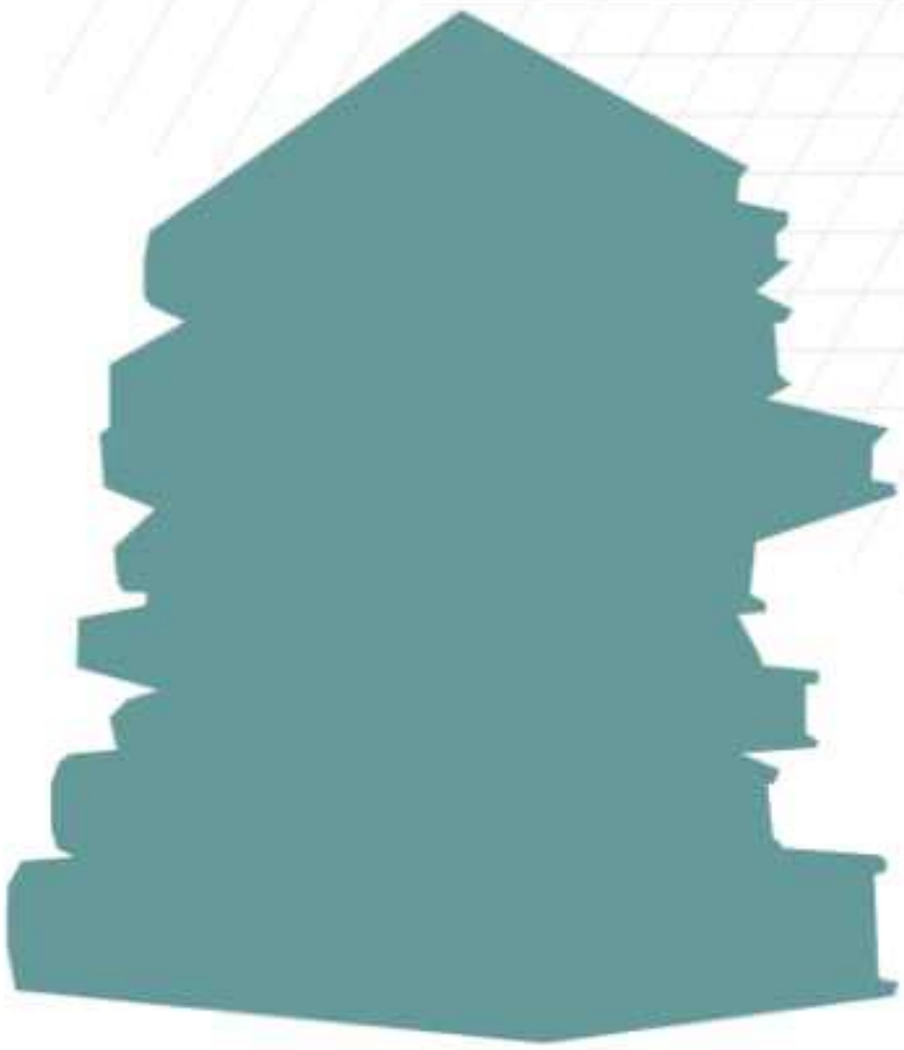

[illegible] اقبال [illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا ظفر علی خاں

بحیثیت صحافی

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
ایم اے، پی ایچ ڈی

مکتبۂ اسلوب کراچی

130/08

اشاعت اوّل	۱۹۸۵ء
کتابت	نسیم اختر ہمایوں
طابع	عظیمی پرنٹرز ناظم آباد کراچی
قیمت	پینتالیس ۴۵ روپے

مکتبہ اسلوب
پوسٹ بکس ۲۱۱۹۔ کراچی ۱۸

اِنتساب

اُستادِ المعظّم جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام مُصطفیٰ خان صاحب مدظلّہ
سابق صدر شعبۂ اُردو، سِندھ یُونیورسٹی، حیدرآباد سندھ
کے نام

فہرست

حرفِ آغاز۔ ۱۰
تمہید۔ ۱۶
برِصغیر کی ابتدائی صحافت۔ ۲۰
اُردو صحافت ۱۸۵۷ء کے بعد۔ ۲۹
اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ۔ ۳۲
اخبار انجمن پنجاب، لاہور۔ ۳۴
مرقعِ تہذیب، لکھنؤ۔ ۳۵
ریاض الاخبار، سیتاپور۔ ۳۶
اودھ پنچ، لکھنؤ۔ ۳۷
ہندوستانی، لکھنؤ۔ ۴۰
مہذب، لکھنؤ۔ ۴۱
رفیقِ ہند، لاہور۔ ۴۲
پیسہ اخبار، لاہور۔ ۴۲
وکیل، امرت سر۔ ۴۴
اُردو رسائل۔ ۴۸
خیر خواہِ ہند، مرزاپور۔ ۴۸
فوائد الناظرین و قِران السعدین۔ ۴۸
محبِ ہند۔ ۴۸
رسالہ دہلی سوسائٹی، دہلی۔ ۴۹
تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ ۴۹

مخزن الفوائد - ۵۰
رسالہ حسن ، حیدر آباد دکن - ۵۱
انیسویں صدی کے چند دیگر رسائل ۔ ۵۱
اردوئے معلّیٰ ، علی گڑھ - ۵۳
"دکن ریویو" اور "افسانہ"- ۵۴
دکن ریویو کے مضامین - ۵۵
ظفر علی خاں کی اداریہ نویسی - ۶۰
سالِ نو اور ہم - ۶۰
ظفر علی خاں کی اہم نظمیں - ۶۹
پنجاب ریویو - ۷۲
اردو اخبارات کی اشاعت کا پس منظر - ۷۴
ہفتہ وار "زمیندار"- ۸۰
ظفر علی خاں کی ادارت - ۸۲
زمیندار کے چند اہم عنوانات - ۹۴
زمیندار کا اجرا لاہور سے - ۹۹
روزنامہ "زمیندار"- ۱۰۵
اداریے - ۱۰۶
صحافتی برادری ۔ ۱۰۸
مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری کے چند نمونے - ۱۱۲
"زمیندار" کے دوسرے شعرا - ۱۱۴
نظر بندی اور "ستارۂ صبح" کا اجرا - ۱۱۸
"ستارۂ صبح"- ۱۲۱
ادارتی ذمہ داریاں - ۱۲۱
اداریے - ۱۲۴
نظمیں - ۱۳۰
لفظ سازی - ۱۳۱
"ستارۂ صبح" سے سبکدوشی اور حیدر آباد روانگی - ۱۳۲

مولانا محمد علی کا نقطۂ نظر۔ ۱۳۳
"زمیندار" کا دُوسرا دَور۔ ۱۳۶
اداریے۔ ۱۳۶
مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بعض اداریے۔ ۱۴۱
مولانا کے مضامین۔ ۱۵۲
تبصرہ۔ ۱۵۲
شعر و سخن۔ ۱۵۳
دُوسروں کے مضامین۔ ۱۵۳
خلافت کانفرنس، پٹنہ۔ ۱۵۴
اختلافات کے سال۔ ۱۵۴
زمیندار کا پہلا صفحہ ۱۹۲۷ء میں۔ ۱۵۷
ظفر علی خاں کے قلم سے اداریے۔ ۱۶۷
علمی مضامین۔ ۱۶۸
نظمیں۔ ۱۷۰
۱۹۲۸ء کے اداریے۔ ۱۷۸
۱۹۲۹ء کے اداریے۔ ۱۸۴
منظومات۔ ۱۸۶
مضامین۔ ۱۸۸
۱۹۳۱ء کے اداریے۔ ۱۹۱
۱۹۳۲ء۔ ۱۹۴
حصۂ نظم۔ ۱۹۵
مضامین۔ ۱۹۶
منتخب اداریے۔ ۱۹۷
علمی مضامین۔ ۲۰۵
۱۹۳۳ء۔ ۲۰۵
اداریے۔ ۲۰۵
علمی مضامین۔ ۲۰۵

حصۂ نظم - ۲۰۶
فکاہات - ۲۰۶
۱۹۳۴ء - ۲۰۷
نظمیں - ۲۱۱
فکاہات - ۲۱۲
تبصرہ - ۲۱۲
۱۹۳۵ء - ۲۱۶
۱۹۳۶ء - ۲۱۹
قابلِ ذکر اداریے - ۲۱۹
فکاہات - ۲۲۰
مضامین - ۲۲۰
۱۹۳۷ء - ۲۲۰
اداریے - ۲۲۱
حصۂ نظم - ۲۲۱
فکاہات - ۲۲۱
۱۹۳۸ء - ۲۲۱
۱۹۳۹ء - ۲۲۳
۱۹۴۷ء - ۲۲۴
صحافتی اصطلاحیں - ۲۲۵
مذہبی اصطلاحیں - ۲۲۷
ظفر علی خاں کے اہم مضامین - ۲۲۷
ظفر علی خاں بحیثیت نقاد - ۲۲۸
ایک اہم سوال اور اُس کا جواب - ۲۲۸
مولانا ظفر علی خاں اکابر و معاصرین کی نظر میں - ۲۳۲
علامہ اقبال - ۲۳۲
علامہ سید سلیمان ندوی - ۲۳۲
سر رضا علی - ۲۳۲

مولانا غلام رسول مہر۔ ۲۳۲
عبدالمجید سالک ۔ ۲۳۳
آل احمد سرور ۔ ۲۳۳
ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ ۲۳۴
پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ ۲۳۴
حکیم احمد شجاع ۔ ۲۳۴
مولانا الطاف حسین حالی ۔ ۲۳۵
مولانا شبلی نعمانی ۔ ۲۳۵
رئیس احمد جعفری ۔ ۲۳۵
مولانا صلاح الدین احمد ۔ ۲۳۵
ہندوستان میں سنسر شپ کی تاریخ اور زمیندار کی ضبطیاں ۔ ۲۳۶
زمیندار، الہلال اور ہمدرد ۔ ۲۴۳
خاتمۂ کلام ۔ ۲۴۵
کتابیات ۔ ۲۵۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

صحافت ایک ایسی وادی ہے کہ ایک غلام مُلک کی اس وادیٔ خارزار میں نہ قلم چلایا جاسکتا ہے اور نہ ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ قلم کی ایک جُنبش مُلک میں تہلکہ مچا سکتی ہے اور سوتوں کو جگا بھی سکتی ہے۔ آزاد مُلکوں کا ذکر نہیں لیکن غلام مُلک میں یہ منزلِ بڑی کڑی ہے اور ثباتِ قدم کے لیے بے خوف دِل، پُرزور قلم کی ضرورت ہے، جہاں ہتھکڑیوں کی جھنکار اور طوقِ گراں بار بھی لکھنے والے کو اُس کے مقصد سے نہ ہٹا سکے اور قید و بند اُس کے عزم و عمل میں رکاوٹ نہ بن سکے تاکہ جو وہ لکھنا چاہتا ہے، وہ لکھے اور پوری جُرأت کے ساتھ لکھے۔ وہ زمانے کے ہاتھوں میں نہ کھیلے بلکہ زمانہ اُس کے (قلم کے) ہاتھوں میں کھیلے۔ جب بے باکی آبلہ پائی کی دعوت دے تو وہ اُس کی دعوت کو قبول کرلے، اولوالعزمانہ انداز میں اپنے قلم کا سفر جاری رکھے اور پکار پکار کر کہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ افگنِ عشق؟

پاک و ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں صحافت کو پھُولنے پھلنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا اور اِس وادی میں آگے بڑھنے والوں کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر رکاوٹ پیدا کی گئی اور برطانوی حکومت کے اِستقلال کے لیے یہ بات ضروری سمجھی گئی کہ صحافت کو آزادیٔ قلم کا ذریعہ نہ بننے دیا جائے۔ اس طرح اُنیسویں صدی کے آخر میں جب سیاسی زندگی نے کروٹیں لینی شروع کیں اور باشعور لوگوں نے انفرادی و اجتماعی زندگی میں گھٹن سی محسُوس کی اور اخبارات کے ذریعے اپنی آواز ایوانِ حکومت تک پہنچائی تو مُسلمانوں کو خصُوصاً اِس کا نشانہ زیادہ بننا پڑا۔ اس کا آغاز اُس وقت سے ہُوا جب محسن الملک نے اُردو کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی تو اُن کی زبان بندی کر دی گئی۔ بیسویں صدی کے آتے آتے جب عام طور سے سیاسی شعور نے اپنے قدم آگے بڑھانے شروع کر دیے اور صحافت کے ذریعے عوام میں سیاسی زندگی کے آثار نظر آنے لگے تو بیدار مغز قوم (یعنی اربابِ حکومت) نے یہ اندازہ

کرلیا کہ مشرق (ہندوستان) میں صحافت کو آزاد چھوڑ دینا گویا بغاوت کا راستہ بنا دینا ہے اور اس بغاوت کا فرو کرنا ایک دشوار تر کام ہے، لہٰذا صحافت کے سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھنے کے لیے دُہری عنان کی ضرورت ہے۔ ایک سنسر شپ کی عنان، دُوسری ضبطیٔ صحافت کی عنان، تب ہی غلام دیسی ممالک کا یہ گھوڑا قابو میں رہ سکتا ہے۔

مُسلمانوں کے سر سے سرسیّد کا دَورِ مفاہمت گزرا اور محسن الملک کا دورِ تنازعت آیا۔ محسن الملک نے سیاستِ حاضرہ کو ریاستی ماحول میں نہ صرف دیکھا بلکہ مُسلمانوں کی آزادی کو آئینی پابندیوں میں زیادہ سے زیادہ جکڑے ہوئے دیکھا تھا۔ اُن کی فراست نے عملی میدان میں قدم رکھا اور تحفّظِ زبان اور تحفّظِ ملّت کے لیے جو قدم اُٹھائے، اُس کے دُور رس نتائج کے لیے مواقع پیدا ہو گئے اور نئی نسل نے جدید تعلیم پاکر، انگڑائی لے کر، کمرِ ہمّت کو کس کر آگے بڑھنے کی قسم کھائی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کے ضمیر کی پاکیزگی نے اُن کو عملاً اُس میدان میں اتار دیا تو اُس بیڑے کو اٹھانے کے بعد اُن کے نزدیک قومی زندگی کے احیاء کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ اُٹھے اور عزم و ہمّت کے ساتھ اُٹھے، اُن کے جذبۂ ایثار نے ان کے قلم میں وہ توانائیِ عمل پیدا کر دی، جس نے پاک و ہند کے مستقبل کو بدل کر رکھ دیا اور غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔

ان نوجوانوں میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ جن میں سے ہر ایک نے اپنی پوری توانائیوں کو عزّتِ قوم کے حصول کے لیے صَرف کر دیا۔ یہ تینوں علی گڑھ کالج سے نکلے، اور تینوں میں اخلاص کا جوہر عمل کے آئینہ میں چمک رہا تھا۔ ان تینوں کی توانائیاں ہندوستان کے مُردہ جسم میں رُوح ڈالنے کے کام آئیں۔ چوں کہ مولانا ظفر علی خاں کو اپنے دونوں ساتھیوں سے زیادہ اپنے قلم کے جوہر دکھانے کے مواقع ملے، اس لیے اُن کے اخبار نے ان کے اداریوں کے ذریعے فکر کے نئے دریچے کھول دیے۔ اُن کی شاعری نے جہاں ادب میں گُل بُوٹے سجائے، وہاں صحافت میں حریفوں کی نبرد آزمائی کے نئے نئے مواقع بھی پیدا کیے اور سیاسی معاملات کے لیے رَمز و کنایہ کی زبان (شاعری) اختیار کی۔

آئندہ صفحات میں مولانا ظفر علی خاں کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے مجھے اس اَمر کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ ان کے صحافتی کارناموں پر تبصرہ یا اظہارِ خیال مجھ جیسے ہیچمدان کے لیے جوئے شِیر لانے سے کم نہیں، اس لیے کہ ان کی صحافتی زندگی نے پورے پچاس سال تک قلم کے زور سے دِلوں پر حکومت کی ہے۔ اربابِ خِرد

سے دادِ قلم بھی لی اور بے تکان حکومت پر تنقید بھی کی۔ اُن کا یہ کارنامہ اُردو ادب و صحافت کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصّہ بن چکا ہے۔ اخبار زمیندار کے کارناموں نے حیاتِ ملّی کے احیاء کے لیے جو کام کیا ہے اُس کو مفصّل طور پر پیش کرنا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بندۂ عاجز نے خُدا کا نام لے کر جب قدم آگے بڑھایا تو معلوم ہُوا کہ ظفر علی خاں کے چاہنے والے اُن اربابِ قلم کے سامنے تھک کر بیٹھ گئے جو ظفر علی خاں کی زندگی میں ان سے ادبی معرکوں میں ذک اٹھا چکے تھے اور قلم کے زخم اُن کے دِلوں میں ہرے تھے۔ مولانا کے اپنے بھی اس ادبی سرمائے کی کماحقہٗ حفاظت نہ کر سکے اور زمیندار ردّی کے مول کوڑیوں میں بِک گیا۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم جیسی بالغ نظر شخصیت کو اعتراف کرنا پڑا کہ زمیندار اب عنقا ہو گیا ہے۔ حریفوں نے اخبار زمیندار کو اس طرح چھپا دیا کہ نئی نسل کو اس اخبار کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو سکے، اور دوستوں نے اس کو ایسا سینے سے لگا کر رکھا کہ پُرانے حکیموں کی طرح اُن کے نسخے رفاہِ عام کے کام نہ آ سکے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا:

"اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

اور بات یہاں تک جا پہنچی کہ ایک بزرگ نے یہ فرما کر دم لیا کہ ظفر علی خاں کا صحافت سے کیا تعلق؟ مَیں نے عرض کیا کہ یہی بات تو قابلِ تحقیق ہے۔

خُدا کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے شورش کاشمیری مرحوم کو، کہ اُن کے اخلاص و محبّت نے میری ہمّت بڑھائی اور مجھے حیدر آباد خط لکھا کہ آیئے، میرے پاس جو کچھ بھی ہے (زمیندار کے پرچے) وہ سب آپ کے لیے حاضر ہیں۔ چناں چہ انھوں نے وعدہ ایفا کیا اور اپنے قیمتی سرمائے کو میرے مطالعہ کے لیے پیش کر دیا۔

جسٹس (ریٹائرڈ) سیّد جمیل حسین رضوی صاحب مرحوم اور جسٹس (ریٹائرڈ) عطاء اللہ سجّاد صاحب نے میری حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ ثانی الذکر موصوف نے اپنے قیمتی وقت میں سے کئی گھنٹے اس سلسلے میں مجھے عنایت کیے۔ مَیں اِن دونوں بُزرگ شخصیتوں کا انتہائی شکر گزار ہُوں۔

جناب چودھری غلام حیدر صاحب مرحوم برادر مولانا ظفر علی، اور ابو ظفر نازش سابق ایڈیٹر "زمیندار" کا مَیں بے حد ممنون ہُوں کہ اِن دونوں بُزرگوں کے سبب مجھے راہ نمائی ملی۔

پنجاب یُونی ورسٹی ریسرچ سوسائٹی میں "ستارۂ صُبح" اور "زمیندار" کے ۱۹۲۸ء

تک کے پرچے محفوظ ہیں۔ بزم سوسائٹی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں اور ڈاکٹر جہانگیر خاں صاحب، سابق ڈائرکٹر ریسرچ سوسائٹی کے لطف و کرم کا بھی، کہ اُن کے سبب یہ تمام پرچے میرے مطالعے میں آئے۔

اس کے بعد لاہور کی وہ گلیاں بھی یاد رکھے جانے کے قابل ہیں جہاں پھر پھر کر میں نے "زمیندار" کے پرچوں کو دل کے ٹکڑوں کی طرح جمع کیا۔ اُن صاحبان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے اپنے پاس جمع کردہ "زمیندار" کے قیمتی سرمائے سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ شاید علم کو میراث سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی اور میرے پاس اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے تہی دامنی کا سرمایہ تھا اور بس!

تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے کسی کا انکار ہمت شکنی کا باعث نہیں بنتا۔ تحقیق کے کام کا پہیہ آگے چلتا رہتا ہے۔

جو کچھ مواد مل سکا، جو سرمایۂ ادب اکٹھا کیا، اسے پیش کرنے میں جو محنت کی ہے اس کا اندازہ صاحبانِ خرد لگا سکیں گے۔

البتہ کوئی کام اس دُنیا میں حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ شرط اس بات کی ہے کہ تحقیقی مسائل کو پیش کر دیا جائے تاکہ نظر کے سامنے آنے کے بعد یہ کام آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مہمیز بن سکے اور صاحبانِ نقد اپنی صلاحیتوں کے سبب موضوع زیرِ نظر کو تحقیق و تنقید کے سہارے آگے بڑھا سکیں۔

میں محترم مسعود علی (نبیرۂ مولانا ظفر علی خان) اور ان کی والدۂ محترمہ (بیگم اختر علی خاں) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کے ساتھ شیخ کرامت علی (آف گجرات) کا بھی جنھوں نے میری مدد کرنے میں اخلاقاً کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جن جن حضرات نے قلمی تعاون فرمایا اُن میں حسن ریاض مرحوم ایڈیٹر "منشور"، حکیم نسیم احمد صاحب، حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" اور مولانا غلام رسول مہر مرحوم میرے شکریے کے خصوصی طور پر مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو اور بزرگوار ہستیاں قابلِ ذکر اور قابلِ شکریہ ہیں۔ ایک قاضی اختر جوناگڑھی مرحوم، کہ اُن کی علم پروری نے مجھے اس کام کی رغبت دلائی تھی۔ اور کام آگے بڑھا تھا کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ایسے ذی علم، علم دوست، علم پرور انسان اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم، کہ اپنی ہمہ گیر شخصیت اور منکسر المزاجی کے ساتھ علم و فضل کا مجسمہ تھے اور اس کام کو اپنی نگرانی

ہیں شائع کرانا چاہتے تھے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔

مَیں اَرباب علم سے اپنی کوتاہیوں کے لیے معذرت خواہ ہوں، اور راہ نمائی کا بھی طالب ہوں۔ ظفر علی خاں کا یہ شعر آج بھی حقیقت ہے :

حریف لشکرِ باطل شدن شئے دِگرست
نہ ہر کہ کلک بگیرد ظفر علی بشود

مَیں اس سلسلے میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر انسان میں کچھ خصوصیاتِ مزاج اُس کی خامیاں بن جاتی ہیں اور کچھ خصوصیات اُس کی اچھائیاں۔ ظفر علی خاں مرحوم بھی اس سے خالی نہ تھے۔ بہت سے لوگوں کو ان کے سیاسی رُجحانات اور میلانات سے اختلاف تھا لیکن اسلام کی شدید محبت کے سبب وہ ایک پُرعزم انسان تھے اور اُن کا نظریہ تھا کہ انسان کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ اقدارِ زندگی کے لیے کسی راستے کو اختیار کرے تو اُس پر استقامت کا اظہار کرے۔

ظفر علی خاں دین کے علاوہ سیاسی رُجحانات میں مستقلاً ایک مسلک پر نہیں رہے۔ لیکن مُسلم لیگ کے لیے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ گویا اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے وہ اپنے مرکز سے ایک اِنچ نہیں ہٹے۔ مَیں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ جرح و تعدیل سے گریز کیا ہے اس لیے کہ ان کی صحافتی زندگی کو بعینہٖ پیش کرنا میرا فریضہ تھا۔ مَیں ذاتی طور سے یہ ضروری نہیں کہ اُن کی ہر بات سے متفق ہوں۔ مجھے جرح و تعدیل کا حق حاصل ہے، لیکن میں نے اس حق کو اس لیے استعمال نہیں کیا کہ اس حق کو ان کی زندگی میں استعمال کرنا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کا شافی جواب دے سکتے۔ اب یہ بات تاویلات کی نذر ہو کر رہ جائے گی۔ یہ اربابِ فہم کا کام ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچ سکیں۔

یہاں یہ بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، چوں کہ صحافت میں مولانا کی شاعری کا محور سیاست تھی، اس لیے شاعری کے ماله و ما علیہ پر ایک علیحدہ کتاب " مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر" میں تفصیلاً اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ لہٰذا اس کتاب میں صرف صحافت پر گفتگو کی گئی ہے اور شاعری کا بیان محض ضمناً آیا ہے۔

اخبار " زمیندار " اور مولانا کے مرتب کردہ جرائد کے تمام شمارے مجھے دستیاب نہیں ہو سکے، اِس لیے مَیں نے زیرِ نظر کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ انھیں پرچوں کی بنیاد پر لکھا ہے جو میری نظر سے گزرے۔ تلاش و تحقیق جاری ہے، اگر باقی ماندہ پرچے مل گئے تو مَیں اپنی اس کتاب میں آئندہ ضروری اضافے کر دُوں گا۔ میرا ارادہ مولانا کی تمام نثری تحریروں،

(اداریے، علمی و ادبی مقالے، مزاحیہ مضامین اور تراجم وغیرہ) کو کتابی صورت میں مدوّن کرنے کا ہے۔ قارئینِ کرام اس سلسلے میں اگر میری معاونت فرمائیں تو مَیں بے حد ممنوّن ہوں گا۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جن دنوں اس کتاب کی کتابت ہو رہی تھی، مَیں آشوبِ چشم میں مبتلا تھا۔ اسی دوران میں آنکھوں کا اپریشن بھی ہوا۔ ان حالات میں مَیں نے کتابت پر نظر ڈالی، اِس لیے امکان ہے کہ کتابت کی کچھ غلطیاں اِس میں رہ گئی ہوں۔ اس کوتاہی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اِن شاءاللہ اگلے ایڈیشن میں یہ غلطیاں دُور کر دی جائیں گی۔

مَیں نے عاجزانہ کوششوں کو پیش کرنے کی جو سعیِ نامتام کی ہے، اس کی کوتاہیوں پر مَیں نادم اور اربابِ علم و نظر سے خطاپوشی و اصلاح کا مستدعی ہوں۔

خاکسار

نظیر حسنین زیدی

المہدی

۳ ڈی ـــــ ۲۵/۱۱

ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

تمہید

اخبار خبر کی جمع ہے اور لغوی معنی آگاہی اور تواریخ کے ہیں - خبر کا لفظ حدیث نبوی ؐ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے -

سابقاً[1] اصطلاحِ قانونی کے بموجب ملک انگلستان میں لفظ اخبار کا کئی معنوں میں استعمال تھا -

(۱) وہ کاغذ جس میں ملکی خبریں اور واقعات درج کیے جائیں

(۲) وہ کاغذ جو ۲۶ دن یا کچھ کم عرصے کے بعد شائع ہو اور اس میں بالخصوص اشتہارات درج ہوں -

(۳) وہ کاغذ جس میں عام خبریں اور واقعات مع آرا کے مرقوم ہوں - اور سلطنتِ متحدہ کے کسی حصہ میں فروخت کے لیے ۲۶ روز یا کچھ کم عرصہ کے بعد یا تو کسی وقت معین پر چھپے اور اسے مختلف کالموں میں یا اس کے حصوں کو نمبروں میں تقسیم کیا گیا ہو - اور حجم اُس کا دو تختوں سے زیادہ نہ ہو - اور اُس کی قیمت بھی ۶ پنس یعنی ۴ آنے سے کم ہو - یہ تعریفات اور شرائط اُس پر محصول لگائے جانے کی غرض سے مقرر ہوئی تھیں - لیکن اب یہ تعریفات از کار رفتہ ہو گئی ہیں اور اخبار کے معنوں میں اُس سے کہیں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے -

حال کی اصطلاحِ قانونی کے بموجب اخبار کے یہ معنی ہیں کہ کوئی کاغذ بوقتِ الشیوع جو متضمن اخبار عام کے مطبوع ہو -

(۴) تعریف مذکورہ بالا فی الحقیقت مختصر طور پر جامع اور مانع ہے لیکن ضرورتاً ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اخبار کے پرچوں کی نسبت کچھ اور صراحت کریں -

اخبار کے پرچوں میں کوئی قید اندراج مضمون کی نہیں ہے - ہر قسم کے مضامین ان میں لکھے جاتے ہیں - ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار میں زیادہ تر مضامین ذیل ہوا کرتے ہیں :

۱ - اشتہارات مفید عام و خاص - ۲ - عام خبریں - ۳ - آرٹیکل یعنی جو امور غور طلب ہوں، ان پر اہلِ ملک کی رائے - ۴ - مضامین علمی - ۵ - انتظامِ ملکی پر بحث - ۶ - ریویو، کیفیتِ حسن و قبح اُن کتب و رسائل اور اخبارات کی، جو جدید تصنیف یا شائع ہوئے ہوں - ۷ - مذہبی و دینی معاملات -

۸۔خلاصہ قوانین واحکام سرکاری۔ ۹۔ وہ مناظرے جو فیمابین دو اخبار نویسوں کے کسی اُمرِ خاص کی نسبت پیدا ہوں گے۔

اخبار نویسی یا صحیفہ نگاری دراصل اس تجسس کی رہینِ منت ہے جو انسانی زندگی کا اقتضا ہے۔ کہ وہ گرد وپیش کے حالات سے باخبر رہنا چاہتا ہے اور انفرادی اُمور اجتماعی سرگرمیوں سے باخبر رہ کر اپنی فلاح وبہبود کے لیے نئے نئے راستے ڈھونڈتا ہے۔ اور خبروں کی غایت یہ ہے کہ ان چیزوں کی بروقت اطلاع ہو جائے جو واقعات ہونے والے ہیں اور جو ہو چکے ہیں۔ ان کے نتائج سے آگاہی حاصل ہوتی رہے۔ خبروں کی اشاعت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تاریخِ تمدّنِ انسانی۔ ابتدائی زمانے میں خبروں کی اشاعت کے مختلف طریقے تھے۔ خبریں ایک شہر سے دُوسرے شہر اور ایک مُلک سے دوسرے مُلک میں مسافروں اور سیاحوں کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ بادشاہوں کے پاس سرکاری ذریعوں سے خبریں فراہم کی جاتی تھیں۔ اور حکومت کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے تھے وہ اعلانات اور فرامین شاہی کے ذریعے مُلک کے طُول وعرض میں مشتہر کئے جاتے تھے۔ فوری خبریں پہنچانے کے لیے کبوتروں اور ہرکاروں سے کام لیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت نے بھی ایک قسم کے تحریری اخبار جاری کئے تھے۔ چناں چہ اورنگ زیب کی فوج کے سپاہیوں کو بھی اس قسم کے اخبارات بہم پہنچائے جاتے، اور ان کے لکھنے والوں کو خبریں بڑی آزادی سے پیش کرنے کی اجازت تھی۔ ہر صُوبے کے صدر مقام میں مغل بادشاہوں کا دفترِ معلومات رہتا تھا۔ وقائع نویس نظم ونسق کے حالات کا اخبار تیار کرتا۔ سوانح نویس عام مُلکی خبریں فراہم کرتا۔ جس میں روزمرّہ کے واقعات اور افواہیں تک درج کی جاتی تھیں۔ یہ سرکاری وقائع ہوتے تھے اور دہلی بھیجے جاتے تھے۔ وہاں ان کا خلاصہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا۔ اس طرح وہ اپنی سلطنت کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے علاوہ نجی اخبارات بھی ہوتے تھے۔ جو تاجروں اور امیروں کے ملازم ہوتے تھے اور ان کے مطلب کی خبریں لکھ لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔

صحافت کا پیشہ دِل چسپ بھی ہے اور دِقّت طلب بھی۔ اخبار نویسی کے فن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جن صلاحیتوں اور خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اس سے عام لوگ آگاہ نہیں (بالکم سے کم جس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا تھا، عام لوگ آگاہ نہیں تھے) اخبار سنڈے ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر لیونارڈ ریس کا خیال ہے کہ اخبار نویس میں چار صفات کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی تعلیم، مشاہدہ، قوتِ امتیازاور احساسِ ذمّہ داری۔ تعلیم ایک بنیاد ہے جس پر زینہ بہ زینہ ترقی کر کے اخبار نویس اپنے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔ مشاہدہ کی قوت صحافت میں ہر قدم پہ درکار ہے، اور قوتِ امتیاز سے وہ ضروری اور غیر ضروری باتوں میں تمیز کرتا ہے۔ اور احساسِ ذمّہ داری ہی اس میں محنت

کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ رات دن کام کی لگن، وقت پر اخبار شائع ہونا، خبروں کی مناسب انداز میں ترتیب، اپنی رائے کا تنقیدی جائزہ بھی اخبار کو کامیاب بناتا ہے۔ صحتِ دماغی اس کے ساتھ ایک لازمی چیز ہے۔ تاکہ انسان صحیح نتیجہ پر جلد از جلد پہنچ سکے۔ اس لیے کہ اخبار نویس کی ایک غلطی بھی اس کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

اخبار کو رائے عامہ کا ترجمان کہا جاتا ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اپنی آواز موثر طریقہ پر لوگوں تک یا حکومت تک پہنچا سکیں اور حکام کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی طرف متوجہ کریں جو پبلک کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے والا ہو۔ قانون اور تہذیب کے حدود کے اندر حکومت اور پبلک اداروں کی نامناسب کارروائیوں پر تنقید کریں۔ اس طرح اخبار نویس کا کام رائے عامہ کو بیدار کرنا اور ان کی راہ نمائی کرنا ہے۔ وہ اپنی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ تمیز سے کام لے کر ایک نئی قوت سے، جس کا ایک حصہ خلقی ہوتا ہے، اور ایک حصہ کسبی، حالاتِ زمانہ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس وسیع ترین مضمون کو اپنے الفاظ میں ایسے جامع انداز میں پیش کرتا ہے جس سے حالات کا صحیح علم بھی ہو جائے اور ان حالات میں اخبار نویس کی رائے بھی لوگوں تک پہنچ جائے۔ صحتِ واقعات اور صحتِ جزئیات کے ساتھ خبروں کا انتخاب کرنا ایک اچھے اخبار نویس کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اہمیت اور افادیت کے نقطۂ نظر سے خبروں کو مقدم و مؤخر رکھنا اور انھیں اس طرح مرتب کرنا کہ ان کی افادیت نمایاں ہو، ایک اخبار نویس کی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ ان تمام امور کو سامنے رکھ کر خبروں کو مرتب کرنے اور شائع کرنے ہی سے اخبار اخبار کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریس عوام تک اپنے خیالات پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اور موجودہ دور میں جو صنعتی انقلاب آیا ہے اس کے سبب سے پریس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ قانونی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ عوام کی تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی اخبار کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اخبار عوام کی تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے اور عوامی پریس بذاتہٖ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے سوسائٹی حکم دیتی ہے اور انسانی مفاد کے لیے اپنے لائحۂ عمل کو بدلتی ہے۔ اس لیے اخبار میں اہم بات یہ نہیں ہے کہ خبریں کم ہیں یا زیادہ۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کس انداز سے پیش کی گئی ہیں۔ تمام خبروں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ ایک درمیانی طبقہ کا آدمی اپنے گرد و پیش کی تمام معلومات کا احاطہ کر سکے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ اخبار چوں کہ عوام تک آواز پہنچانے کی ایک ایجنسی ہے اور سوسائٹی کے مسائل پیچیدہ در پیچیدہ ہونے کے سبب اس کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے ایک اخبار کی قومی و ملی ذمہ داریاں اب پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ صحیح معنوں میں اسے پبلک کا خادم بن کر اس کی خدمت کا جذبہ بروئے کار آنا چاہیے۔ عوامی ذہن تک رسائی حاصل

کرنا اس کے اہم اثرات میں سے ہے۔ اس لیے اخبار مفید اور تعمیری ادارے کا کام دے سکتا ہے اور بہت طاقت ور خدمت کا آلہ بن سکتا ہے۔

چوں کہ تمام انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر دوسروں میں دِل چسپی لیتے ہیں اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اخبار اس ذوقِ علمی اور حصولِ معلومات کے لیے ایک خارجی ذریعہ کا کام دیتا ہے اور اپنی بہترین اور تازہ معلومات کے ذریعے وہ عوام کی توجہ اور التفات حاصل کرتا ہے۔ چوں کہ اس پیشہ میں انسان کے ذخیرۂ معلومات کی وسعت، تنوّع اور جدت کی ضرورت ہوتی ہے اور اخبار نویس کو تمام واقعات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا پڑتا ہے اس لیے ایک اخبار نویس کے لیے خصوصی قابلیت درکار ہوتی ہے تاکہ اس کا نقطۂ نظر اور اس کا رجحان قطعی طور سے تمام واقعات کو یک جا کر کے ایک نتیجہ نکال سکتا ہو۔ اخبار نویس یا کالم نگار اپنے تجربات سے اس گیرائی اور گہرائی کا حامل ہو جو تخلیقی کارناموں سے نہ صرف عوام کے سامنے ایسی چیزیں رکھے جو اُن کی بہبود و بہتری کے لیے ہوں بلکہ وہ عوام کی نمائندگی اس انداز سے کرے کہ عوام اس اخبار کو اپنے دِل کی آواز سمجھیں اور وہ صحیح معنوں میں قوم کا ترجمان ہو۔[۹]

حواشی:

[۱] ۔۔ مجلۂ علمی، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان۔ لاہور۔ ۱۹۶۴ء

[۲] ۔۔ ایضاً

[۳] ۔۔ ڈاکٹر جارج فوکس: نیو سروے آف جرنلزم۔ بارنس اینڈ نوبل۔ امریکہ۔ ص ۶۶-۱۶۲- ۱۹۶۲ء

[۴] ۔۔ ماڈرن جرنلزم۔ پٹمین اینڈ سنز۔ لندن۔

[۵] ۔۔ رحم علی ہاشمی: فنِ صحافت۔ انجمن ترقّیٔ اُردو، دہلی۔ ص ۵۶۔ ۱۹۴۳ء

[۶] ۔۔ ایضاً۔ ص ۵۵

[۷] ۔۔ ڈاکٹر جارج فوکس: نیو سروے آف جرنلزم۔ محولہ بالا۔ ص ۵

[۸] ۔۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷

[۹] ۔۔ ایضاً۔ ص ۱۷۷

برِّصغیر کی ابتدائی صحافت

ہندوستان میں اخبار نویسی کی داغ بیل اُس گروہ نے ڈالی تھی جو ایسٹ اِنڈیا کمپنی کا مخالف تھا۔ اٹھارویں صدی کے یہ اخبار کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں چھپتے تھے۔ ان اخباروں میں کمپنی کی مخالفت کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ اُس دَور میں دیسی زبان کا کوئی اخبار شائع نہیں ہُوا بلکہ ہندوستان کے یہ اخبارات رنگ ڈھنگ، مزاج اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی ولایتی اخباروں کا چربہ ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے مالک اور ایڈیٹر بھی انگریز ہی ہوتے تھے اس لیے اٹھارویں صدی کی اخبار نویسی کو ہندوستان کی بدیسی اخبار نویسی کہیں تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔[1]

پہلا بنگلا اخبار ۱۸۱۶ء میں نکلا۔ اس کا نام انگریزی میں "بنگال گزٹ" اور بنگلا میں بقول عبداللہ یوسف علی "بنگال سماچار" تھا۔[2] پھر ایک دیسی اخبار "سماچار درپن" کے نام سے ہفتہ وار اخبار کلکتہ سے نکلا۔ یہ اخبار مارشمین نے ۲۳ مئی ۱۸۲۸ء کو جاری کیا تھا۔ یہی پہلا دیسی اخبار تھا جس میں باشندگانِ مُلک کو خود غرضی اور بے حِسّی کے خواب سے بیدار کیا گیا۔ گورنر جنرل مارکوئس آف ہسٹنگز نے اس کا پہلا نمبر دیکھ کر اظہارِ خوشنودی کا ایک پروانہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا اور ان کی جُرأتِ رندانہ کو سراہا اور ایڈیٹر کی درخواست پر تین چوتھائی محصول بھی معاف کر دیا۔ یہ اخبار ۱۸۳۹ء تک جاری رہا۔[3]

دسمبر ۱۸۲۱ء میں ایک بنگلا ہفتہ وار اخبار منگل کی صبح کو "اخبار سمبد کمودی" (خبروں کا مہتاب) کا اجرا ہُوا۔ دیسی زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جس کو ایک ہندوستانی نے خالص مُلکی و قومی نقطۂ نظر سے نکالا تھا۔ اس اخبار میں مذہبی، سماجی اور سیاسی معاملات، مُلکی واقعات، مقامی و بیرونی خبریں اور واقعاتِ حاضرہ پر دلچسپ تبصرے اور غیر مطبوعہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے مالک رام موہن رائے تھے اور اُس کے ایڈیٹر بھوانی چرن بنرجی تھے۔ اس اخبار کا چندہ دو روپے ماہانہ تھا۔ دیسی اخبار کے اجرا سے انگریزی اخبار کی مخالفت شروع ہوگئی۔ انگریزی اخبار کو اس بات کا ڈر تھا کہ بنگلا اخبار بھی کہیں فتنہ انگیزی پر نہ اُتر آئے۔ اِس لیے کچھ دنوں کے

بعد لارڈ منٹو نے کہا تھا کہ اگر ساری رعایا ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کو انتہائی آزادی دینے کو ترجیح دیتا۔ مگر چوں کہ وہ ہمارے ہم وطن نہیں ہیں اس لیے اس سے زیادہ خطرناک چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی۔[۱]

مارچ ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے "مرأۃ الاخبار" کے نام سے فارسی کا ایک اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا پہلا نمبر ۲۰ راپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "جام جہاں نما" کلکتہ کا دوسرا نہیں بلکہ پہلا اخبار تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۷ رمارچ بروز بدھ اردو زبان میں شائع ہوا۔ محمد عتیق "جام جہاں نما" کو دوسرا مطبوعہ فارسی اخبار بتاتے ہیں اور نیشنل آرکائیوز، دہلی میں جام جہاں نما کا جو نمبر انھوں نے دیکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مئی ۱۸۲۲ء کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں جام جہاں نما کا پہلا یا دوسرا نمبر شائع ہوا ہو گا۔ اس کے اجرا کا مقصد انگریزی اخباروں کی خبریں فارسی میں چھاپنا نیز کمپنی کے علاقوں اور ملک کے دوسرے حصوں کی خبریں فراہم کرنا تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اور اس کی مالک کلکتہ کی ایک انگریز کاروباری کمپنی تھی۔ اس کی قیمت تین روپے ماہانہ بشمول اردو ضمیمہ تھی۔ اس اخبار کو کمپنی بہادر کی سرپرستی و حمایت حاصل تھی۔ کمپنی کے سرکاری اشتہارات، خبریں اور صاحبانِ والاشان کی تقرری و تبدیلی کی اطلاعیں اس اخبار میں چھاپی جاتی تھیں۔ اس اخبار نے اپنی زندگی کے چھٹے سال ایک مضمون مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف شائع کیا تھا۔ یہ بات کمپنی کے ارباب حل و عقد کو بڑی ناگوار گزری اور انھوں نے اخبار کی سرکاری امداد بند کر دی۔[۲] اس طرح یہ اخبار نیم سرکاری حیثیت سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا انداز خالص نجی اور ملکی اخبار کا ہو گیا۔ اب دبی زبان سے اخباروں کی آزادی کی حمایت کی جانے لگی اور خبروں کے انتخاب کا جو گھٹا گھٹا سا انداز تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی تحقیق کے مطابق جام جہاں نما" جس کی تاریخ اجرا ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء تھی۔ اس کا اردو دَور بے حد مختصر تھا اور یہ جون ۱۸۲۲ء تک فارسی اخبار ہو گیا تھا۔ اور ایک[۳] سال کے بعد اس نے پھر اردو کی طرف رجوع کیا چناں چہ فارسی اخبار کو جاری رکھتے ہوئے "جام جہاں نما" کا اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا۔ فارسی اخبار کے ساتھ اس کی قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ماہانہ تھی اور صرف اردو ضمیمہ کی قیمت دو روپے ماہانہ تھی۔ چوں کہ اردو ضمیمہ الگ بھی خریدا جا سکتا تھا اور اس کا مواد عام طور پر فارسی اخبار سے الگ ہوتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اردو کا جام جہاں نما بذاتِ خود ایک مستقل اخبار[۴] تھا۔ اس طرح یہ اخبار چار سال آٹھ مہینے جاری رہا۔ لیکن یہ مانی ہوئی بات ہے کہ یہ اخبار اپنی جگہ پر فارسی اخبار کا ضمیمہ بھی تھا اور ضمیمہ کو کسی بھی صورت میں مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی۔[۵] البتہ اس اخبار

میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ جو انگریزی یا فارسی سے ترجمہ کئے جاتے تھے۔ مسٹر ڈی کاسٹا کی اردو غزلیں بھی اردو جامِ جہاں نما کی زینت ہوتی تھیں اور ان کا تخلص بھی ڈی کاسٹا تھا۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

کل ہم تمھارے کوچہ میں آئے چلے گئے — ہے ہے ہزار اشک بہائے چلے گئے
کچھ رنج و غم کا حال نہ پوچھو کہ کیا ہوا — اُلفت کو یارو ہم تو نبھائے چلے گئے
ہم ہی فقط ہیں دل جو گوانتے ہیں ورنہ سب — آکر جہاں میں کچھ نہ کمائے چلے گئے

(جامِ جہاں نما۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۲۷ء)

جہاں تک خبروں کا تعلق ہے اس کے چار صفحوں میں ایک نہ ایک مضمون ہوتا اور عام طور پر غزل بھی۔ اس کی وجہ سے خبروں کی گنجائش کم رہ جاتی تھی۔ چناں چہ ایک پرچہ میں پانچ چھ سے زیادہ خبریں نہ ہوتی تھیں۔ نیز اُن کے ماخذ اور ذریعہ کا کبھی ذکر نہ کیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ خبریں بھی غیر دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ چوں کہ یہ اخبار یورپین خریداروں کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا۔ اس لیے خریداروں کے نقطۂ نظر سے بھی اردو میں خبروں کی کوئی اہمیت نہ تھی یہی وجہ تھی کہ اردو اخبار میں خبروں کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔ البتہ یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے تاریخِ انگلستان کا ترجمہ شروع ہوا جو دس جون ۱۸۲۷ء تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد ۱۷ر جون ۱۸۲۷ء سے تاریخ عالمگیری کا ترجمہ شروع ہوا جو ۲۳ر جنوری ۱۸۲۸ء تک جاری رہا۔ اس طرح اردو کا یہ پہلا اخبار (جو اگرچہ مستقلاً پہلا اخبار نہ تھا) چار سال آٹھ مہینے جاری رہ کر ۲۳ر جنوری ۱۹۲۸ء کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔[۹]

مرآۃ الاخبار اور جامِ جہاں نما کے بعد ایک فارسی ہفتہ وار "شمس الاخبار" ہے جو کلکتہ سے نکلنے والا تیسرا ہفتہ وار فارسی اخبار تھا۔ اس اخبار کی ضخامت ۱۲ صفحات ہوتی تھی۔ اور ٹھاکر منی رام کے ذاتی چھاپے خانے سے چھپتا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں یہ اخبار اس کے ایڈیٹر کے بیان کے مطابق اپنے ہم وطنوں کی بے حسی اور لاپروائی کا رونا روتے ہوئے ختم ہو گیا۔[۱۰]

اخبار سیرام پوری ۱۸۲۶ء کے اوائل میں سیرام پور سے پادریوں کی طرف سے جاری کیا گیا۔ اس اخبار کو ایک سو ساٹھ روپے ماہانہ کی سرکاری مدد بھی ملی کہ جس کے معاوضہ میں اس کی ۱۲۰ کاپیاں گورنمنٹ میں بھیجی جاتی تھیں۔ یہ اخبار مئی ۱۸۲۸ء تک جاری رہا۔ اور حکومت کی مالی دشواریوں کے پیشِ نظر جب بنگلا فارسی اخباروں کی مالی امداد بند کر دی گئی تو یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ "آئینۂ سکندر" ہفتہ وار اخبار ۱۸۳۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے ۱۴ صفحات تھے۔ اسی اخبار میں مرزا غالب مرحوم کا کلام ان کے پرانے دوست مولوی سراج احمد کی وساطت سے چھپا تھا۔ اور یہ اخبار مرزا صاحب کے مطالعہ میں آتا تھا۔ چناں چہ اس اخبار کے بارے میں مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اپنی رائے کا اظہار

130108

کیا ہے اور اس اخبار کے خریدار بنانے کی بھی سعی کی ہے۔[۱۱]

"عالم افروز" ۲۲ مارچ ۱۸۳۳ء کو یا اس کے بعد مولوی وہاج الدین کی ادارت میں ہفتہ وار کی صورت سے شنبہ کو نکلا۔ جس کے ۱۶ صفحات تھے۔[۱۲]

۱۸۳۳ء میں "لدھیانہ اخبار" امریکن مشن پریس لدھیانہ سے نکلا۔ یہ اخبار بھی ہفتہ وار تھا۔ اس کی قیمت تین روپے ماہانہ تھی۔ یہ آج کل کے رسالہ سائز کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر غیر ممالک کی خبریں ہوتی تھیں مُلکی خبریں بہت کم ہوتی تھیں۔[۱۳]

اس طرح کلکتہ اور آگرہ سے مختلف فارسی اخبارات نکلتے رہے۔ مثلاً "سلطان الاخبار" ۱۸۳۵ء میں کلکتہ سے نکلا اور ۱۸۶۲ء تک جاری رہا۔ "زبدۃ الاخبار" آگرہ سے ۱۸۳۳ء میں نکلا۔ "آئینۂ سکندری" فروری ۱۸۳۱ء میں بھی کلکتہ سے جاری ہُوا۔ اور اخبار "ماہ عالم افروز" بھی ۱۸۳۳ء کے وسط میں نکلا۔ اسی طرح "ماہِ منیر" بھی کلکتہ سے فارسی میں ہفتہ میں تین بار نکلتا تھا۔ اس کا اجرا یکم جنوری ۱۸۴۹ء کو ہُوا اور اس اخبار کی قیمت دو روپے ماہانہ تھی۔ اس کے علاوہ "احسن الاخبار" بمبئی سے ۹ نومبر ۱۸۴۴ء کو اور "سراج الاخبار" دہلی سے ۱۸۴۱ء میں جاری ہُوا۔ یہ اخبار بہادر شاہ آخری تاج دار مغلیہ کے دربار کا روزنامچہ یا سرکاری گزٹ تھا جس کی ضخامت آٹھ صفحات ہوتی تھی۔ اس اخبار کے ابتدائی حصّہ میں بادشاہ کے روزانہ کے معمولات کا اجمالی ذکر تاریخ وار کیا جاتا تھا۔ یہ روزنامچہ ساڑھے پانچ یا پانچ صفحے کا ہوتا تھا۔ باقی ڈھائی تین صفحوں میں مُلکی اور غیر ملکی خبریں درج کی جاتی تھیں۔ یہ اخبار اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم اور اٹھارویں اور انیسویں صدی کی نسبتاً جدید وقائع نگاری کا یہ ارتقائی اور آخری نمونہ تھا۔ جو مطبوعہ شکل میں موجود پایا گیا ہے۔ بہادر شاہ کی صاحب قرانی کا اگرچہ عملاً خاتمہ ہو چکا تھا مگر جملہ لوازمات اب بھی باقی تھی۔ انھی میں وقائع نویس کا ایک عہدہ بھی تھا اور مصلح الدین سیّد ابو القاسم مغلیہ سلطنت کے آخری وقائع نویس تھے جن کے اہتمام سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔[۱۴]

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اُردو صحافت کا آغاز بھی فارسی صحافت کی بنیاد پر ہُوا۔ اور مذکورہ بالا جتنے بھی فارسی میں اخبار نکلے۔ ان سب میں ہندوستانی اخبار نویسی کا دراصل سنگِ بنیاد رکھا۔ چوں کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک فارسی ہی ہندوستان کی سرکاری زبان رہی اور کمپنی کے سارے کام فارسی ہی میں چلائے جاتے تھے۔ اس لیے فارسی اخبارات بھی عوامی اخبار کہلائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ایڈیٹر "جامِ جہاں نما" نے یہ بالکل صحیح کہا تھا کہ "قدر شناس جن کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق پائی، اُردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے۔ اور اہلِ ہند اُردو جنھوں کی زبان ہے وے فارسی تحریر چاہتے ہیں"۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں کمپنی نے ہندوستان میں

عملاً مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ جو اب تک اس ملک میں مغل حکمرانوں کی تھی۔ اپنی اس امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی جائے۔ جو مغل دَور کی یادگار تھی۔ چناں چہ ۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس اقدام کا قدرتاً اُردو کی نشوونما کا خوش گوار اثر ہُوا۔ عدالتوں میں فارسی کی جگہ اب اُردو میں کام ہونے لگا۔ یہی سبب تھا کہ آہستہ آہستہ اُردو زبان کے اخباروں نے فارسی زبان کے اخباروں کی جگہ لے لی۔ چناں چہ "آگرہ اخبار" کے نام سے ۱۸۳۲ء میں دیسی زبان کا اخبار جو فارسی رسم الخط میں ڈاکٹر جان ہنڈرسن نے شائع کیا۔ وہ چند مہینوں تک فارسی اخبار نکالنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ فارسی کا اخبار کامیاب نہ ہوگا۔ چناں چہ "آگرہ اخبار" کو انھوں نے نومبر ۱۸۳۲ء میں فارسی سے انگریزی کا اخبار بنا دیا۔[۱۵]

شمالی ہند میں اُردو چھاپہ خانوں کا دَور ۱۸۱۴ء سے شروع ہُوا اور لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کے عہد میں بہت صَرف اور تکلف کے ساتھ ایک مطبع کھولا گیا۔ جس میں سب سے پہلے مناقب حیدری عربی زبان میں اور محامدِ حیدری فارسی میں ۱۸۲۲ء میں شائع ہُوئیں۔ "جامِ جہاں نما" کے بعد دہلی کا پہلا اخبار "دہلی اخبار" تھا جس کا اجرا ۱۸۳۷ء میں ہُوا۔ چوں کہ "جامِ جہاں نما" کی حیثیت ایک ضمیمہ کی تھی اس لیے مولوی محمد حسین آزاد کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "دہلی اخبار" اُردو زبان کا پہلا اخبار تھا۔[۱۶] جب یہ بات تصدیق تک پہنچ چکی ہے کہ "جامِ جہاں نما" کی حیثیت ایک ضمیمہ کی تھی تو اس کو مستقلاً اُردو کا پہلا اخبار کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہر حال یہ ابتدائی کوشش تو ضرور تھی لیکن دہلی اخبار" کی اوّلین حیثیت اپنی جگہ پر قائم ہے —— بقول ڈاکٹر محمد صادق شمالی ہند میں اُردو صحیفہ نگاری کا آغاز مولوی محمد باقر سے ہُوا۔ اُردو کے پہلے صحافی وہی ہیں۔[۱۷] "۱۸۳۶ء میں جب پریس کو آزادی ملی تو انھوں نے دہلی سے پہلا اُردو اخبار جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک مطبع بھی قائم کیا۔ اس کا نام پہلے جعفریہ اور پھر " اُردو اخبار پریس" تھا۔ یہ پریس انھیں مسٹر ٹیلر کی بدولت ملا۔ اور انھوں نے یہ پریس خرید کر اپنے اخبار" دہلی اُردو اخبار" کی بنا ڈالی۔ اس اخبار کا سائز ۱۲×۸ انچ ہوتا تھا۔ اخبار کے بالکل اوپری حِصّہ پر جلی قلم سے اخبار کا نام لکھا جاتا تھا۔ اور اس کے نیچے نمبر اور تاریخ کی سطر کے اُوپر اس کی قیمت ماہوار دو روپے اور بیس روپے سالانہ درج ہوتی تھی۔ یہ اخبار دو کالموں میں چھپتا تھا۔ پہلے کالم کی پہلی سُرخی "حضورِ والا" ہُوا کرتی تھی اور اس سُرخی کے تحت قلعہ معلیٰ کی خبریں چھاپی جاتی تھیں۔ اخبار کے بعض نمبروں میں حضورِ والا کی خبریں آخری صفحہ پر بھی درج ہوتی تھیں۔ اس کے بعد دوسرا کالم "صاحب کلام بہادر" ہوتا تھا کہ جس کے تحت ریذیڈنٹ بہادر اور دُوسرے صاحبانِ ذی شان کی خبریں چھاپی جاتی تھیں۔[۱۸] اس اخبار کی دو اور خصوصیتیں ہیں جس

کی وجہ سے یہ اُردو صحافت اور اُردو ادب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت اور اہمیت کا مالک ہے۔ وہ پہلے صحافی تھے جنھوں نے آزادی کا بیج صحافت کی سرزمین میں بویا اور انگریزوں کے چڑھ آنے پر فتویٰ ان کے مطبع میں شائع ہوا۔ "کہ شہر والوں پر جہاد فرض ہے اور فرض عین ہے۔ اور بستی والوں پر بھی اور اطراف و جوانب پر بھی۔ فرض کفایہ ہے۔ اگر شہر کے لوگ سُستی کریں تو ان پر فرض عین ہے۔" یہ اشتہار ان کے مطبع سے چھپا اور یہ ان کی گرفتاری اور سزا کے لیے کافی تھا۔ دہلی اُردو اخبار کی ایڈیٹری غدر سے کچھ سال پہلے مولانا آزاد سے متعلق تھی اس لیے ان کا بھی وارنٹ کٹا۔ دورانِ غدر میں اس اخبار کے نام "دہلی اُردو اخبار" کے ساتھ "اخبارِ ظفر" کا اضافہ کر دیا گیا تھا جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ باغیوں کو دہلی اُردو اخبار کی ہمدردی حاصل تھی۔ مزید یہ ہُوا کہ مسٹر ٹیلر کے واقعۂ قتل نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

دُوسری خصُوصیت دہلی اُردو اخبار کی یہ تھی کہ وہ اپنے اثر و رسُوخ کی بنا پر خبر رسانی کے تمام ذرائع پر دسترس رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہر سے آنے والے اخبارات کے اقتباس بالالتزام شائع ہوتے تھے۔ دہلی اُردو اخبار لوگوں کی رضا کارانہ نامہ نگاری سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا۔ اور صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ تعلیمی و تمدّنی زندگی سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی چھاپا کرتا تھا۔ غرض ان لوگوں کے لیے جو خبروں کے پیاسے تھے، یہ اخبار ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

اس اخبار نے صحیح معنوں میں رائے عامہ کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور چاہے نرم لہجے میں سہی، لیکن اس کے باوجود اُس نے اکثر سچی باتیں ہی کہیں۔ اس طرح دربار معلّیٰ کے نظم و نسق پر بھی نکتہ چینی سے گریز نہیں کیا۔ اسی طرح اس اخبار نے ہندُو مُسلم فسادات کی خبریں بھی غیر جانب دارانہ انداز سے چھاپیں۔ یہ اخبار تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ اور تعلیم کی خبریں بطور خاص شائع کرتا تھا۔ اس میں ادبی مضامین اور ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی غزلیں چھپتی تھیں۔ یہ بات اور ہے کہ غالبؔ کی مخالفت میں حدود سے تجاوز کر دیتا تھا۔ البتہ اپنے مخالفین کے خلاف اس اخبار نے لکھنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور اس طرح یہ طنز ذاتیات تک پہنچ جاتا تھا۔ بہر حال یہ بھی اس اخبار کی صاف گوئی تھی کہ جن لوگوں سے اسے اختلاف تھا، وہ اسے ظاہر کرنا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا اخبار کی صحیح پالیسی خیال کرتا تھا۔ اس طرح اس اخبار نے ادبی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے بے حد اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اور مولوی محمد باقر مرحُوم کے علم و فضل اور ان کی سعادت مند بیٹے مولوی محمد حسین کے سبب اس اخبار نے بے حد اہمیت حاصل کر لی ہے۔[۱۹]

"سیّد الاخبار" ۱۸۳۷ء میں سرسیّد احمد خاں کے بھائی سیّد محمد خاں نے جاری کیا تھا۔ اس کے

ایڈیٹر مولوی عبدالغفور قانون سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ان کا اخبار وکیلوں میں بہت مقبول رہا۔[۲۰] سید محمد خاں کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ۱۸۴۶ء میں) اس اخبار کی ذمہ داریاں سرسید احمد خاں پر آپڑیں۔ اس اخبار کی اہمیت اس سبب سے اور بھی ہے کہ سرسید احمد خاں آگے چل کر اردو اخبار نویسی کے نئے دور کا آغاز کرنے والے اور صاحبِ طرز اخبار نویس بننے والے تھے۔ ان کے لیے یہی اخبار اخبار نویسی کا پہلا مکتب تھا۔ اور بقول سر عبدالقادر سرسید احمد خاں نے "سیدالاخبار" میں مضامین لکھ کر اپنی اخبار نویسی کی مستقل بنیاد رکھی۔ سیدالاخبار کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے یہی خصوصیت کافی ہے۔ فنی حیثیت سے اخلاقی، علمی، مذہبی اور تاریخی مضامین ان ہی کی ایجاد ہیں۔ یہ اخبار ۱۸۴۸ء تک جاری رہا۔[۲۱]

دہلی سے دو اور قابل ذکر اخبار نکلے۔ ایک "صادق الاخبار" (اس نام کے دہلی سے کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چار اخبار جاری ہوئے جن میں سے ایک اخبار جو سید جمیل الدین خاں نے ۱۸۵۴ء میں جاری کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بے حد مقبول رہا۔ اور اس اخبار کی کاپیاں بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں بھی پیش ہوئیں۔

"بہرحال ۱۸۳۶ء کے بعد چند سال کے اندر اندر متعدد اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے۔ ان میں فوائد الناظرین، قران السعدین، سعد الاخبار ایسے اخبار ہیں کہ جو پہلے اردو اخبار کی اشاعت کے اندر ہی شائع ہوئے۔ اور اتنے مشہور ہوئے کہ اب تک ان کا ذکر کتابوں، رسالوں اور مقالوں میں محفوظ ہے گارسین دتاسی کے بیان کے مطابق ۱۸۲۹ء کے اردو پریس کے سلسلے میں صرف ایک صوبہ ممالک مغربی وشمالی میں ۲۳ مطابع تھے جن سے ۲۶ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ ان میں ۲۳ ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی اور ایک بنگالی کا۔ اگر اردو کے ان ۲۳ اخباروں میں ان اخباروں اور رسالوں کو بھی شامل کرلیا جائے جو دوسرے صوبوں سے شائع ہوئے ہوں گے تو ان کی تعداد کم از کم پچاس تک ہو جائے گی۔"[۲۲]

دوسرے ہی سال ان مطبعوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ چناں چہ سات آگرہ میں، پانچ دہلی میں، دو میرٹھ میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک کان پور میں، ایک شملے میں، ایک اندور میں اور تیرہ لکھنؤ میں تھے۔

انھی اخباروں میں ایک نہایت ہی اہم اخبار "کوہِ نور" تھا۔ جو ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ یہ پنجاب کا اوّلین اخبار تھا۔ اور اس کو نئے طور کا پہلا اخبار کہا گیا ہے منشی ہرسکھ رائے سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۰ء کے شروع میں لاہور سے یہ اخبار جاری کیا اور اسی سال کے ختم پر اس کے خریداروں کی تعداد ۲۵۷ تھی۔ اس اخبار کی خریداری مدراس، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء میں یہ ہفتہ وار سے روزانہ ہوگیا۔ اس اخبار کو مہاراجگان

کشمیر و پٹیالہ کے علاوہ سرکار کمپنی بہادر کی سرپرستی بھی حاصل تھی[۲۳]۔ یہ اخبار بلا لحاظ مذہب و ملّت ہندوستان کے ہندو و مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں رہا۔ اس طرح جتنے زیادہ عرصے تک یہ اخبار جاری رہا۔ اور لاہور کے تین اخباروں کی ادارت سے جتنے علما اور ادیبوں کو وابستگی رہی، اتنی لکھنؤ کے "اودھ اخبار" کے علاوہ شاید ہی کسی اخبار کو نصیب ہوئی ہو۔ ان اخباروں میں کوہِ نور، "پیسہ اخبار" اور "زمیندار" ہیں۔ کوہِ نور میں بھی نادر علی شاہ، تاج الدین، منشی نول کشور، مرزا واحد، مرزا نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہ حضرات نے ادارت سنبھالی ہے[۲۴]۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران میں بھی یہ اخبار جاری رہا۔ اور منشی ہرسکھ رائے کا وقار بدستور سابق بحال ہو گیا (منشی صاحب کو ایک مقدمہ کے سلسلے میں اغلباً ازالۂ حیثیتِ عُرفی میں تین سال کی سزا ملی تھی)۔ یہ اخبار شروع میں ہفت روزہ تھا، بہت جلد ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ اور کچھ عرصے بعد تین بار۔ ۱۸۸۸ء میں روزانہ ہو گیا لیکن چند ماہ بعد یہ تجربہ ناکام ہوا۔ اسی زمانے میں یہ انگریزی اور اردو، دو زبانوں میں نکلنے لگا۔ ۱۸۹۰ء میں منشی ہرسکھ رائے کے انتقال کے بعد ان کے مطبع اور ان کی بیوہ نے کوہِ نور ہفت روزہ کے طور پر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۴ء میں اسے بند کر دیا[۲۵]۔

"کوہِ نور کا سائز ۱۲×۸ انچ تھا۔ پہلے چھ صفحے ہوتے تھے پھر سولہ صفحے تک پہنچ گئے۔ اس اخبار میں سرکاری اعلانات، صوبائی اور مقامی خبریں، غیر ملکی خبریں، ادبی معلومات، غزلیات اور ادبی مقالے شامل ہوتے تھے۔ ادب سے متعلق باقاعدہ اداریے نہیں ہوتے تھے، لیکن جب ضرورت ہوتی، حالات پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس اخبار کا معیار بلند ہوتا چلا گیا کہ مقامی اور صوبائی خبریں زیادہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ دی جانے لگیں۔ غیر ملکی خبروں کا معیار بھی بہتر ہو گیا اور افغانستان میں تو اس کا خاص نامہ نگار مقیم تھا جو فارسی زبان میں مکتوب بھیجا کرتا تھا اور یہ خط بغیر ترجمہ کئے چھاپ دیا جاتا تھا۔ سیاست، تاریخ، جغرافیہ، مذہب، معاشرہ اور قانون کے موضوعات پر مضامین دیے جاتے تھے۔ لطائف اور غزلیات بھی جگہ پاتی تھیں۔ اشتہارات زیادہ تر سرکاری ہوتے تھے۔ بہرحال تجارتی اشتہار بالخصوص کتابوں کے اشتہار درج ہوتے تھے۔ ۱۸۵۶ء اور اس کے بعد کی فائل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے آزادیٔ مطابع کے عنوان سے ایک شذرہ لکھا اور ضلع کے نظم و نسق پر بھی مضمون چھاپا گیا جس میں حکّام کی بددیانتی، بدنظمی، خویش پروری اور دفتری کاموں میں تاخیر پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ اس اخبار نے مختلف ریاستوں کی اندرونی خرابیوں کا تذکرہ کیا۔ اس اخبار کو اس وجہ سے بھی خاص شرف حاصل ہے کہ اس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تائید کی۔ چنانچہ ۸ر اپریل ۱۸۵۶ء کے شمارے میں ایک نامہ نگار کی طرف سے خبر چھاپی گئی اور نامہ نگار کی طرف سے لوگوں کو

توجہ دلائی گئی کہ کوہِ نور کی یہ رائے بہت درست ہے کہ جیسے انگریزوں نے یونانی اور سنسکرت زبان سے اپنی بھاکا میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے، ویسے ہی اُردو اور فارسی اور انگریزی اور سنسکرت والوں کو چاہیے کہ ہر علم کو ہر ایک زبان سے لے کر اُردو میں ترجمہ کیا کریں"۔ [۲۶]

بقول کیفی صاحب خدا معلوم کوہِ نور میں کیا جادو تھا کہ اس کی پیدائش کے بعد بہت سے اخبار ایسے نکلنے لگے جن کے نام نور سے ترتیب دیے گئے تھے۔ مثلاً دریائے نور لاہور سے، نور الاخبار اور نور افشاں لدھیانہ سے، اسی طرح نور الانوار اور مطلع نور وغیرہ۔ [۲۷]

حواشی :

۱۔ محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی۔ انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ۔ ۱۹۵۷ء۔ ص ۹۲۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۱۲ ۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۳۔ ۴۔ ایضاً۔ ص ۱۴۴۔ ۵۔ ایضاً۔ ص ۱۵۴۔ ۶۔ ایضاً۔ ص ۱۵۸۔ ۷۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں۔ لاہور۔ ص ۳۵۔ ۸۔ امداد صابری: تاریخ صحافت اُردو۔ حصہ اوّل۔ دہلی ۱۹۵۳ء۔ ص ۵۳ امداد صابری کی تحقیق کے مطابق اُردو ضمیمہ کی تاریخ اجرا ۲۳ مئی ۱۸۲۳ء ہے۔ وہ "جامِ جہاں نما" کو اُردو کا پہلا مستقل اخبار نہیں مانتے۔ ۹۔ "جامِ جہاں نما" کا سائز $\frac{۳۰×۲۰}{۸}$ تھا اور یہ اخبار صرف چار صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہندوستانی اخبار نویسی از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۱۶۰۔ ۱۰۔ محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی مجولہ بالا، ص ۱۲۸۔ ۱۱۔ ایضاً۔ ص ۱۶۹، ۱۷۰۔ ۱۲۔ ایضاً ص ۲۳۷۔ ۱۳۔ امداد صابری: تاریخ صحافت اُردو، حصہ اوّل، محولہ بالا۔ ص ۹۱۔ ۱۴۔ محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی، محولہ بالا۔ ص ۲۵۔ ۱۵۔ ایضاً۔ ص ۲۶۴۔ ۱۶۔ ڈاکٹر محمد صادق: اُردو کا پہلا صحافی (مقالہ) مشمولہ "انتخابِ ماہِ نو" (۱۹۵۳ تا ۱۹۵۸ء) کراچی ۱۹۵۸ء۔ ص ۹۴۔ ۱۷۔ ایضاً۔ ۱۸۔ محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی۔ محولہ بالا ص ۲۶۷۔ ۱۹۔ امداد صابری: تاریخ صحافت اُردو۔ حصہ اوّل۔ محولہ بالا، ص ۹۔ ۱۰۸۔ ۲۰۔ ایضاً ص ۲۷۷۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی "سیّد الاخبار" کا اجرا ۱۸۳۵ء کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اُردو نثر کے نمونے، ص ۲۶۔ ۲۱۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، محولہ بالا، ص ۲۶۷۔ بحوالہ سجن لال، دہلی کالج میگزین، حاشیہ ص ۶۵۔ محمد عتیق صدیقی کے نزدیک اس حوالے کی بنیاد پر ۱۸۴۸ء تک یہ اخبار جاری رہا لیکن امداد صابری کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۸۴۹ء کے "فوائد الناظرین" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار اس وقت تک جاری تھا۔ تاریخ صحافت اُردو، حصہ اوّل، محولہ بالا، ص ۱۶۵۔ ۲۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ انیسویں صدی میں اُردو صحافت، بدایوں۔ ۲۳۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اُردو، ص ۹۶۔ ۲۴۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی: اب سے آدھی صدی پہلے کے اُردو اخبار (مقالہ) سہ ماہی "اُردو" دہلی، ۱۹۳۵ء۔ ۲۵۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں۔ محولہ بالا۔ ص ۱۱۴۔ ۲۶۔ ایضاً۔ ص ۱۹۔ ۱۱۸۔ ۲۷۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی: اب سے آدھی صدی پہلے کے اُردو اخبار۔ محولہ بالا۔

اُردُو صحافت ۱۸۵۷ء کے بعد

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد صحافت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے آغاز میں اُردو اخباروں کا لب ولہجہ بہت نرم اور مصلحتِ وقت کے تابع تھا۔ جب حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِنگیں آ گئی تو اخبار ملکی مسائل پر رائے زنی کرنے لگے۔ اس دور میں نکلنے والا سب سے پہلا اخبار ۱۸۵۸ء کے آغاز میں "اودھ اخبار" کے نام سے لکھنؤ سے جاری ہوا جو چند سال بعد روزنامہ بن گیا اور تقریباً نوّے سال زندہ رہا۔ یہ اخبار انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو کے چند اہم اور بڑے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔[۱]

یہ کوہِ نور سے نو سال بعد لکھنؤ سے نکلا۔ منشی نول کشور کی شہرت اس سے قبل "سفیر آگرہ" اخبار نکالنے کی وجہ سے خاصی ہو گئی تھی۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں مطبع نول کشور جاری کیا جو بہت جلد ایشیا کے بڑے بڑے مطابع میں شمار ہونے لگا۔ ہندوستان کی علمی ترقی میں اس مطبع کی کتابوں نے جو اہم حصّہ لیا، اسے کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانہ میں اُردو اخبارات کا سائز عام طور پر ۱۸ × ۲۲/۴ ہوتا تھا۔ اودھ اخبار ۲۲ × ۲۹/۴ پر چھپنے لگا۔ اور ۱۸۷۱ء میں اخبارات کا محصول ڈاک کم ہونے کی وجہ سے وہ ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا۔ "تہذیب الاخلاق" میں سر سید نے لکھا تھا کہ "اودھ اخبار پہلے ہی نہایت با وقعت اخبار تھا اور اب تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہم کو یہ بھی اُمید ہے کہ ہمارے اور ہم عصر وقائع نگار بھی اودھ اخبار کی تقلید کریں گے اور منشی نول کشور کی اعلیٰ ہمتی سے قوی اُمید ہے کہ ان کا یہ اخبار مثل باوقعت انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا۔" سر سیّد کی یہ توقع پوری ہوئی اور ۱۸۷۴ء میں اودھ اخبار روزانہ ہو گیا۔

اودھ اخبار ایک خالص غیر فرقہ وار اخبار تھا، اور اُس کی پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔ کوئی خاص سیاسی مسلک نہیں تھا۔ البتہ اس اخبار میں بڑے بڑے ادیب، شاعر اور انشا پرداز کام کرتے تھے۔ مثلاً مولوی غلام محمد خاں تپش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، احمد حسن شوکت، عبد الحلیم شرر، سیّد امجد علی اشہری،

مرزا حیرتؔ دہلوی اور جالبؔ دہلوی"۔ ۵۳

"زمانہ" نے اس اخبار پر جو تبصرہ کیا وہ اس انداز میں ہے کہ "رتن ناتھ سرشارؔ نے فسانہ کو انگریزی کی چاشنی دے کر ایشیائی ڈھنگ پر ڈالا اور ظرافت کے عنوان سے لکھنؤ کے رسم و رواج کے مختلف پہلوؤں پر دل چسپ مضامین لکھنے لگے۔ پڑھنے والوں نے انھیں اتنا پسند کیا کہ سرشارؔ نے مختلف مضامین کی کڑیوں کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا۔ لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوب صورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرزِ تحریر کی نزاکت، سوال و جواب کی نوک جھوک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی، روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گل کاری، تراشوں کی نئی پھبن اور ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشارؔ کا والہ و شیدا بنا دیا۔"

"زمانہ" کے خیال کے مطابق اخبار نے کوئی نئی تبدیلی نہیں کی۔ دس سال پہلے جو ولایتی تاروں کا نقطی ترجمہ اور پانیر کے مضامین اردو میں چھپتے تھے، وہی حال اب بھی ہے۔ گویا "اودھ اخبار" انگریزی اخباروں کا مترجم ہے۔ اور ترجمہ بھی مناسب نہیں۔ اسٹاف بہترین ہے لیکن اخبار کا ایڈیٹر نئے حالات سے ناواقف ہے۔ پرانی لکیر کا فقیر ہے۔ پالیسی کے اعتبار سے بے سونڈ کا ہاتھی ہے اس کے کسی اصول کا پتہ نہیں۔ ایڈیٹوریل کالم بہت کم ہیں منشی نول کشور صاحب حد سے زیادہ خیر خواہِ سرکار تھے۔ اب اس کو عوام سے ہمدردی نہیں۔ راجہ لوگوں سے پچاس روپے لیتا ہے۔ تعلقہ داروں سے تیس سے پچاس تک اس کی قیمت بہت گراں ہے۔"

اودھ اخبار کو ہندو اخبار کہنا سراسر زیادتی ہو گی۔ کیوں کہ اس اخبار نے مسلمانوں کی تعلیمی بہتری پر بھی مضامین چھاپے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے حق میں مراسلات شائع کئے۔ اسلامی ممالک کی سیاست میں جہاں تک ہو سکا؛ ہمدردانہ انداز میں مفید اور فکر انگیز مضامین لکھے، اور مہر زبیدہ کی تعمیر پر چندہ کی اپیل کئی بار نصف صفحہ میں مفت اشتہار کی صورت میں چھاپی۔"

اس اخبار میں مولانا عبدالحلیم شررؔ کو بھی اپنی جولانیٔ طبع دکھانے کے بڑے اچھے مواقع میسر آئے۔ ان کے مضامین عام طور پر علمی، خیالی اور فلسفیانہ مذاق کے ہوتے تھے۔ ان کی روانیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ چار پانچ دن میں اتنے مضامین لکھ دیتے تھے جو مہینہ بھر اخبار میں شائع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے خیال کے مطابق یہ اخبار ہر لحاظ سے پایہ کا اخبار تھا۔ اس اخبار میں بین الاقوامی خبروں کے پس منظر پر اتنے مضامین چھپتے تھے کہ آج کل کے اردو اخبارات بھی اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ بلاشبہ انگریزی اخبارات سے خبریں لی جاتی تھیں۔ زیادہ تر مضامین یورپی طاقتوں کے ترکیہ کے تعلقات، اور افغانستان کے بارے میں ہوتے تھے۔

بعض مضامین "دی ٹائمز لندن" سے ترجمہ کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی ممالک کی سیاست

پر بعض مضامین اور خبریں قسطنطنیہ کے فارسی اخبار الجوائب سے بھی ترجمہ کی جاتی تھیں۔ اس اخبار کا نمائندہ کلکتہ میں مقیم تھا۔ اور وہ ہندوستان کے اخبارات کو ترکیہ کے حق میں مضامین اور خبریں مہیا کیا کرتا تھا۔ اور ہندوستان سے خبریں اپنے اخبار کو بھیجتا تھا۔ اس اخبار میں اس کے علاوہ معاشرتی اور علمی وفنی موضوعات پر بھی گراں قدر مقالے چھپتے تھے۔ یہ اخبار اصلاحِ معاشرہ کا بھی حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہندوستانی مغربی علوم اور مغرب کی اچھی اچھی باتیں اختیار کریں۔ لیکن وہ مشرقیت کا بھی علم بردار تھا۔ اس کے بعض اداریوں میں قومی مسائل پر بھی بحث ہوتی تھی۔ اور عوام کی روزمرہ کی روایتی شکایات بھی منظرِ عام پر لائی جاتی تھیں۔ اسی طرح اس اخبار میں تہذیب اور اسی قسم کے موضوعات پر مضامین چھپتے تھے۔

غرض یہ کہ اودھ اخبار ہندوستان کی صحافتی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سبب سے اس اخبار میں غیر ملکی اشتہارات بھی چھپتے تھے[۹]

کوہِ نور اور اودھ اخبار کے جاری ہونے کا زمانہ اُردو اخبار نویسی کا انیسویں صدی میں دُوسرا دَور تھا۔ لاہور کے ایک اور اخبار "اخبارِ عام" نے جاری ہو کر صحافتی ادب کا ایک دُوسرا دَور شروع کیا۔ اس سے پہلے جو اخبار تھے ان کی قیمتیں گراں ہوتی تھیں۔ اس اخبار نے اس ضرورت کو محسوس کر لیا۔ جب وہ جاری ہُوا تھا اُس وقت تک اخباروں کو ایک پیسہ محصُول ڈاک کی رعایت نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس نے مع محصُول ڈاک دو روپے قیمت رکھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے چار وَرقوں پر نکلتا تھا۔ پنڈت یال مکند اس کے مالک تھے۔ کوہِ نور کی ملازمت کے دوران انھوں نے اخبار چلانے کا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے ان کو اخبار چلانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا یہ اخبار ننھا سا تھا ویسی خبریں بھی ننھی سی ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ پہلے صفحہ کی خبریں کالم کے ایک لائن کی خبر ہوتی تھی۔ یہ اخبار صرف خبروں کا تھا۔ اس لیے اس کی ابتدائی پالیسی کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ کابل کے امیر شیر علی خاں سے انگریزوں کی لڑائی اور رُوس اور روم کی پچھلی لڑائی کی خبریں لکھ کر اس اخبار نے خوب شہرت حاصل کر لی تھی اور اس وقت اس چھوٹے سے اخبار نے اتنی شہرت حاصل کی کہ بڑے بڑے اخباروں کی اُس کے سامنے قدر نہیں رہی۔

"اخبارِ عام" کا ذکر کرتے ہُوئے ڈاکٹر گوپی چند اپنے انگریزی مقالے میں لکھتے ہیں کہ اخبارِ عام سے پنجاب کی اُردو صحافت میں ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا۔ مَیں نے اس کے چند فائل دیکھے ہیں اور مَیں اس بات سے بے حد متاثر ہُوا ہُوں کہ اس میں خبریں بہت بڑی تعداد میں دی جاتی تھیں۔ یہ اخبار نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک کی بھی تازہ ترین خبریں چھاپتا تھا۔ بلکہ بعض دفعہ تو انگریزی اخبارات اس کی خبریں نقل کرتے تھے۔ ابتدائی دَور میں "اخبارِ عام" کی زبان بہت اچھی تھی۔ اس میں فحش اور واہیات اشتہار اجرت پر بھی نہیں چھاپے جاتے تھے۔ اس کے پہلے صفحہ پر مختصر خبریں اس طرح چھپی ہوتی تھیں

کہ ہر خبر ایک سطر میں آتی تھی۔ اس کے اداریے باقاعدہ نام کی پٹی کے نیچے درج ہوتے تھے غیر ضروری مضامین نہیں ہوتے تھے۔ یہی حال غزلیات کا تھا۔ گویا یہ صحیح اخبار تھا۔ یہ اس لحاظ سے بھی اردو صحافت کے جدید دور کا نقیب اول تھا کہ اس نے ایک پیسہ قیمت رکھ کر اور سادہ زبان استعمال کر کے اخبارات کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں "اخبارِ عام" روزانہ ہو گیا تھا چند سال کے بعد سہ روزہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں پھر روزانہ ہو گیا لیکن ایک سال کے بعد پھر سہ روزہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں بند ہو گیا۔ اس کی روزانہ اشاعت ۱۸۹۷ء میں دو ہزار چھ سو (۲۶۰۰) تک پہنچ گئی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دائرۂ اثر کتنا وسیع تھا اور اس کی اشاعت برابر بڑھ رہی تھی۔"[۵]

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ

۱۸۶۳ء میں سرسید نے ایک ایسی مجلس کی تجویز پیش کی جو ہندوستان میں علم کی توسیع و ترقی کے لیے قائم کی جائے اور وہ قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور عظیم مصنفوں کی انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرائے۔ ۹؍جنوری ۱۸۶۴ء کو سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس غازی پور میں قائم کر دی گئی اور جب اسی سال سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو سائنٹیفک سوسائٹی کے دفاتر بھی وہاں منتقل ہو گئے۔ اور مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" اور یا "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا اور سرسید کی وفات کے بعد بھی باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ پہلے یہ اخبار ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں شائع ہوتا تھا بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی، دونوں فائدہ اٹھاتے تھے۔ پہلے پہل سرسید اس میں سیاسی مسائل پر مضامین اور شذرات لکھتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف حکومت کو ہندوستانیوں کے احساسات اور خیالات سے آگاہ کیا جائے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں میں سیاسی ذوق پیدا کیا جائے۔ اور انھیں طرزِ حکومت سے آشنا کیا جائے۔ بقول حالی اس میں سوشل، اخلاقی اور علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلوں کے، جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملاتِ ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے، بہ ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے ہندوستانی معاشرت، تعلیم اور تاریخ کے بارے میں جو لیکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس میں شائع ہوتے تھے۔

ایک خاص خوبی اس اخبار کی جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھہراتی تھی، وہ یہ تھی کہ اس نے طرزِ تحریر میں اپنے تمام ہم عصروں کے برخلاف کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے

جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، کبھی سنجیدگی اور متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔"

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی اور اس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جانا تھا۔ وہ ہمیشہ بُرے اثر قصّوں اور بے سر و پا قصّوں سے مبرّا دیکھا گیا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ دُنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے آخر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار ہوتی تھیں۔ اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ برابر ۳۲ برس جاری رہا۔ اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخِ معیّن پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چندہ کی آمدنی سوسائٹی میں بالکل نہیں رہی تھی اور وہ پچھلے برسوں میں کئی ہزار کی مقروض ہوگئی تھی مگر سرسید نے جس طرح ہوسکا اس اخبار کو کبھی بند نہیں ہونے دیا۔

اس اخبار کا اُردو صحافت پر اثر

بقول حالی سرسید کی طرزِ تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اسے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کی سادگی اور بے تکلفی کو دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اس کا زور اور تاثیر جو اس کی خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اسی کے دل و دماغ کا حصّہ تھا۔ دوسرے کی تحریر میں اس کا ڈھونڈنا لاحاصل ہے۔ مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلسلہ دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہلِ قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے، اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اسی کے قلم کی بازگشت ہے۔ اور اس کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے مُلک میں جاری تھے ان کا موازنہ ان اخباروں سے کیا جائے جو اس کے بعد جاری ہوئے۔ اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے۔ ان کا مقابلہ ان اخباروں اور میگزینوں سے کیا جائے کہ ان اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا تو معلوم ہو جائے گا کہ سوسائٹی کے اخبار نے ہی ان اخباروں میں ترقی کی رُوح پھونکی ہے۔ کیوں کہ ان کے مضامین جلد جلد شائع ہوتے تھے اور مہینہ میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گزرتے تھے اور یہ سلسلہ ۳۲ برس تک برابر جاری رہا۔" ۲۵

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے پہلے صفحہ پر یہ الفاظ اردو اور انگریزی میں درج ہوتے تھے۔ "جائز رکھنا چھاپا کی آزادی کا، کام ہے ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا آزادی کا کام ایک رعیت کا ہے۔" سرسید ملکی معاملات میں ریاستوں کے حقوق کی حفاظت میں بھی

سیسہ سپر رہتے تھے اور معاشی معاملات پر بھی اظہارِ رائے کرتے تھے۔ اس طرح اس اخبار نے ہندوستان کی صحافت کے وقار کی حفاظت ضروری سمجھی اور جب انگریزی اخبار اردو اخباروں پر نکتہ چینی کرتے تھے، یہ اخبار اُن کا مُنھ توڑ جواب دیتا تھا۔ سرسید نے ایک مرتبہ گورنمنٹ اور ہندوستانی اخبارات کے نام سے ایک اداریے میں جہاں اُردو اخبارات کو تلقین کی کہ وہ حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں وہاں حکومت سے یہ کہا کہ جو مضرتیں صحافت کی آزادی سے پیدا ہوئی ہیں وہ پابندی لگانے سے اور بھی بڑھ جائیں گی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "سرسید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی رکھتی ہیں۔ اوّل اُن کے صحائف کی دیدہ زیبی، ٹائپ کا حُسن اور کاغذ کی عمدگی۔ اس لحاظ سے ان کے اخبار موجودہ ترقی یافتہ یورپ کے اعلیٰ اخبارات اور رسائل سے کسی طرح کم نہیں۔ دوئم ان اخبارات کی مقبولیت ۔ اخبارات میں واقعات اور معاملات پر بے لاگ رائے، جس میں بڑی عاقبت بینی، وسعتِ معلومات اور تعمیری نقطہ نظر جھلکتا ہے یہی ان کے تبصروں کی خصوصیت ہے۔ اور مضامینِ علمی میں سرسید کی مخصوص معقولاتی اسپرٹ اور حیاتِ قومی کی تشکیلِ جدید اور زندگی کی تمدنی اشاعت کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ عقلی اور تجرباتی اصولِ صحافت سرسید کی اخبار نویسی کے خاتمہ کے بعد سے آج تک اُردو اخبار نویسی میں پیدا نہ ہو سکا۔"

بلاشبہ سرسید عوام کے خیالات کی ترجمانی اس انداز سے کرتے تھے کہ انگریزی حکومت کو بے جا غلط فہمی کا موقع نہ مل سکے۔ اس اخبار کی ایک دوسری خصوصیت خبروں کی صحت اور اختصار ہے اور اس کے ساتھ ان کا تسلسل بھی ہے۔ بہرحال انھی چیزوں کے تحت انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو ہندوستان کی صحافت میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج ہندوستان میں "دی ٹائمز" کو حاصل ہے۔ یہ اخبار ۱۸۶۶ء (۳۰ مارچ) سے لے کر ۱۸۹۹ء تک برابر جاری رہا۔

اخبار انجمن پنجاب، لاہور

۱۸۶۳ء میں اس انجمن کی بنیاد پنجاب میں رکھی گئی اور ۱۸۶۵ء میں اس کے مقاصد کو فروغ دینے اور اس کی کارروائی کو ارکانِ انجمن تک پہنچانے کے لیے ایک رسالہ جاری ہوا جس کا نام "رسالہ انجمنِ اشاعتِ مطالب منیدہ پنجاب" رکھا گیا۔ کچھ عرصے اس رسالے کی ادارت محمد حسین آزاد بھی کرتے رہے۔ ۱۸۷۰ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا اور اس کی جگہ "اخبار انجمن پنجاب" معرضِ وجود میں آیا۔ سرکاری اخبار کے مدیر منشی پیارے لال آشوب اور نائب مدیر مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ بقول مصنف اختر شہنشاہی یہ رسالہ یکم جنوری ۱۸۷۰ء میں نکلا۔ سول سیکرٹریٹ کے مطبع میں چھپتا تھا۔ اس میں علمی مضامین شائع ہوتے تھے اور کم موٹے اوراق پر چھپتا تھا۔

"اخبار انجمن پنجاب" ہر جمعہ کو چھپتا تھا۔ اس کی تقطیع $\frac{12\times18}{4}$ تھی اور سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

ہر صفحہ میں تین کالم ہوتے تھے۔ کتابت اور طباعت عمدہ تھی اور صفحہ اوّل پر نام کی پٹی کے نیچے اخبار کے مقاصد اور قواعد درج ہوتے تھے۔ باقی صفحات پر مضامین علمی، منقولات، مراسلات، کریسپونڈینس، مختلف واقعات، ترجمہ اخبارات عربیہ اور ترجمۂ احکامِ گورنر بہادر وغیرہ۔ غرض اس کے مضامین موضوعات کے اعتبار سے تنوع رکھتے تھے مثلاً سائنس، طب، علم وادب، معاشرہ، جغرافیہ، تاریخ، سیاست، معیشت، معلوماتِ عامہ، غرض کہ ہر موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے اور مقامی خبریں بھی بالانتظام شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار بین الاقوامی مسائل کے بارے میں بھی صرف ترکیہ کے معاملات پر کبھی کبھی اظہارِ رائے کرتا تھا۔ بقول پنڈت برج موہن دتاتریا اس اخبار کی اہمیت اس لیے اور بھی ہے کہ اس میں ادارۂ انجمنِ پنجاب کے اس مشاعرہ یا مناظمہ کی مفصّل روداد درج ہے جو ۳۰ر جون ۱۸۷۲ء کو انجمن مذکورہ کی سرپرستی میں ہوا تھا۔[۹]

"اخبار انجمن پنجاب نے اردو صحافت کے مسائل پر بھی کچھ مضمون چھاپے ہیں۔ اس کی اہمیت جدید نظم نگاری کے سبب سے اور بھی بڑھ جاتی ہے"۔[۱۰]

مرقعِ تہذیب، لکھنؤ ۱۸۷۳ء

یہ اخبار "انجمن تہذیب لکھنؤ کا آرگن تھا۔ جو یکم اکتوبر ۱۸۷۳ء کو شائع ہوا جس کے مہتمم منشی گوکل پرشاد رسا منصرم انجمن تہذیب تھے۔ مطبع نول کشور میں کبھی ۱۶ صفحوں پر اور کبھی ۲۴ صفحوں پر چھپتا تھا جس کا سالانہ چندہ ۲ روپے تھا۔ اس اخبار میں انجمن کی روداد کے علاوہ اصلاحی، تعلیمی، تاریخی مضامین درج ہوتے تھے۔ اب تک کسی اخبار میں اپنے دور کے اخبارات کی تعداد اشاعت اور ذریعۂ اشاعت نہیں بتائی گئی تھی، نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ کون سا اخبار زیادہ مقبول ہے۔ اس اخبار نے اس کمی کو پندرہ اپریل ۱۸۷۳ء کے ایڈیشن سے پورا کر دیا۔ اس میں سیکرٹری گورنمنٹ مغربی وشمالی الہ آباد نے ۲۵ر مارچ ۱۸۷۳ء میں ان دیسی اخباروں اور رسالوں کی جو ۱۸۷۲ء میں اضلاع شمالی اور مغربی میں چھپتے تھے، ایک رپورٹ مرتّب کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "۱۸۷۱ء میں ۳۰ اخبار چھپتے تھے اور ان کے کُل ۵۹۴۷ پرچہ جاری ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں ۳۶ اخبار چھپے جن کے ۵۹۱۷ پرچے جاری ہوئے۔ کسی اخبار کے ۳۸۱ سے زیادہ پرچے نہیں چھپے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۴۶۲ پرچے چھپتے ہیں۔ اس کے بعد "دبدبۂ سکندری" رام پور کے ۳۱۶ پرچے چھپتے ہیں۔ ہندوستانی لوگ دبدبۂ سکندری کو سب سے زیادہ لیتے ہیں اور انگریز لوگ آگرہ اخبار کو سب سے زیادہ۔ سال پیوستہ ہندوستانی "لارنس گزٹ" کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ یعنی اس کے خریداروں کی تعداد ۸۲۵ تھی اور اس سال صرف دو سو ہندوستانی اس کے خریدار ہیں۔ ممالک مغربی وشمالی میں پنجاب کی نسبت زیادہ اخبار اس لیے چھپتے ہیں کہ سرکاری مدارس کے استعمال کے واسطے ان کے پرچے خرید

کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باعث سے کچھ ان اخباروں کی زندگی زیادہ نہیں ہوتی کیوں کہ پنجاب کے اخبار بھی جن کو اس قسم کی مدد کم ملتی ہے، ایسے ہی عمدہ ہیں جیسے کہ اضلاع شمال اور مغرب کے"

ریاض الاخبار، سیتاپور

"ریاض الاخبار" سیتاپور سے یکم اکتوبر ۱۸۷۴ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء سے گورکھپور سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کا سالانہ چندہ پہلے ۹ روپے تھا اور اب ۱۲ روپے ۱۲ آنے ہو گیا تھا۔ جو گورکھپور کے مطبع ریاض للاخبار میں چھپتا تھا۔ اس اخبار کے کرتا دھرتا ریاض خیرآبادی تھے۔ اس میں ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ سیاسی اور سوشل معاملات پر خاص پیرائے میں رائے زنی ہوتی تھی اس زمانہ کے اخبارات خبریں کم دیتے تھے۔ مقالات نصائح پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ قصہ کہانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ مقامی حالات اور ملکی سیاسیات پر بہت کم اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ اور جب بھی جرأت کی جاتی تھی تو اس کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا کہ نیازمندانہ حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ لیکن "ریاض الاخبار" نے ایک ایک کر کے ان بندھنوں کو توڑا اور اپنی آزاد خیالی، بے باک گوئی، اور بے لاگ نکتہ چینی سے ایک نیا معیار قائم کیا۔ ریاض الاخبار اگرچہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ شاید کچھ عرصہ تک ہفتہ میں دو بار بھی نکلتا رہا۔ پھر بھی اس میں خبروں پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مقامی حالات اور ملکی سیاسیات پر ریاض کا قلم تیغِ جوہر دار کی طرح چلتا تھا۔ نہ وہ حکام سے دبتے تھے نہ عمائد عالی مقام سے۔ وہ اپنے سامنے ایک اصول رکھتے تھے اور اس کے تحت نکتہ چینی کا سمند ہوا سے باتیں کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ، اودھ اخبار، دِل گداز، زمانہ، آگرہ اخبار آگرہ، نیر اعظم مُرادآباد اور کہاں کہاں سے اخبار جاری نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ریاض الاخبار کا مرتبہ اپنے لٹریچر کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد، نثار حسین شہرت (پیارے یار) سجاد حسین اودھ پنچ کے ایڈیٹر، مولوی عبدالحلیم شرر، سید ناصر علی دہلوی مدیر صلائے عام، اور معلوم نہیں کتنے یادگار اور ٹھوس لکھنے والوں کے نام اُس وقت کی فضا میں گونج رہے تھے جب ریاض الاخبار کا لٹریچر اپنی بہاریں دکھلا رہا تھا۔ گویا ریاض نے جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو میدان خالی نہیں ملا۔ مقابلہ سخت تھا۔ کش مکش پوری تھی لیکن جو خصوصیت ریاض کی انشا پردازی میں تھی، وہ یہ تھی کہ اُس نے کبھی کسی پر ذاتی حملہ نہ کیا نہ کبھی عامیانہ اُردو لکھی۔ ادبیت کے ایسے پہلو نمایاں کئے کہ لوگ باوجود اخبار کے ساتویں دن نکلنے کے ان مضامین کے پڑھنے کے لیے ایسے بے تاب رہتے تھے جیسے آج کل کے روزانہ اخبار کے لیے بے تابی ہوتی ہے۔"[۱۱]

"راجہ صاحب محمودآباد کو عرصہ سے اصرار تھا کہ ریاض لکھنؤ آجائیں اور اس شہر کو اپنی ادبی اور صحافی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ جب اصرار حد سے تجاوز کر گیا تو ۱۹۰۷ء میں وہ گورکھپور سے لکھنؤ

اُٹھ آئے اور ریاض الاخبار یہاں سے نکالنا شروع کیا۔ لکھنؤ آکر انھوں نے کہا تھا:

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب　　　جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

لکھنؤ میں ان کا کام اچھی طرح چل رہا تھا۔ مہاراجہ مرحوم کی قدر دانی، ریاض کی محنت ریاض الاخبار کی مقبولیت نے کامیابی کی ایک نئی شاہراہ آنکھوں کے سامنے کھول دی تھی کہ ایک خانگی مقدمے کی وجہ سے مقدمے کی مصروفیات کے سبب ریاض الاخبار اور پریس سے وہ غافل ہو گئے۔ ان پر یاس اور اضمحلال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر کار ریاض الاخبار انھوں نے بند کر دیا اور خیر آباد میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے[۱۲]۔

ان کی ساری عمر تقریباً اخبار نویسی میں گزری۔ انھوں نے ریاض الاخبار کے علاوہ روزانہ "تار برقی" گل کدۂ ریاض، فتنہ، عطر فتنہ، روزانہ صلح کل اور گل چیں جاری کئے تھے۔ وہ خود محبت کے پتلے تھے۔ انگریزوں سے اُن کو نفرت طبعی تھی اور ان کو بُری نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بے حد پرہیزگار انسان تھے۔ اس کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری نے ان کی صحافت کو اور ان کی صحافت نے ان کی شاعری کو اور بھی چمکایا۔ ان کے کلام میں دل کش پیرائے میں واقعات پر پھبتی، رندانہ بے تکلفی نے ان کے اشعار کو قبولِ عام کا رنگ دے دیا تھا۔ اندازِ بیان کی چستی اور مضمون کی شوخی، زبان کی صفائی، فصاحت اور سلاست کمال درجہ کی تھی۔ نمونۂ کلام:

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید　　　ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں
شگفتہ پھول حسینوں کے ہار کے قابل　　　جو خشک ہوں تو ہمارے مزار کے قابل[۱۳]

اودھ پنچ، لکھنؤ

یہ اخبار ۱۲ جنوری ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ سے جاری ہوا جو ہر پنج شنبہ کو بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ "اس زمانہ کے اخباروں کا نہ کوئی خاص سیاسی و سوشل مسلک تھا نہ کسی مستقل اصول کے پابند تھے۔ محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ البتہ چند اخبار ایسے تھے جن کی نظر عوام کے حقوق پر رہتی تھی۔ مثلاً لارنس گزٹ میرٹھ، شحنۂ ہند میرٹھ، ہندوستانی لکھنؤ اور اودھ پنچ۔ یہ سب اخبار، اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہ اگرچہ ظریف پرچہ تھا مگر سیاسی اور سوشل معرکہ سر کرتا تھا۔ قدیم خیالات کا حامی تھا اور نئی روشنی کے پجاریوں کے مکروہ کرتوتوں کا پردہ فاش کرتا تھا۔ ابتدا سے عوام کے خیالات کی ترجمانی شروع کر دی تھی اور حکومتِ برطانیہ کی ملک اور قوم دشمن حرکتوں کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں لکھتا تھا اور عوام کا ساتھ دیتا تھا۔"[۱۴]

زمانہ لکھتا ہے کہ "اس نے جاری ہو کر اُردو زبان کو ظرافت کے چٹخاروں سے بھر دیا۔ اگرچہ اس کی قیمت عوام سے مع محصول ڈاک ۱۲ روپے ۱۳ آنے تھی اور اردو کے ایک ہفتہ وار اخبار کے لیے یہ قیمت بہت تھی۔ پھر بھی اس کے خریدار دس بارہ ہزار تک پہنچ گئے تھے اس کی مقبولیت

کا یہ عالم تھا کہ اُس کے چٹکلے اور مضامین سب جگہ درج ہوتے تھے۔ اُس کی نقل پر کتنے ہی پنچ نکلے۔ لیکن اودھ پنچ کا ڈھنگ اس وقت بھی بہت اعلیٰ تھا جیسا ولایتی پنچوں اور اُس قسم کے دوسرے اخباروں میں اعلیٰ معیار ہوتا تھا۔ اُس کی خصوصیات حسب ذیل تھیں۔

۱۔ بہت آزادی سے لکھتا تھا اور خوب دل لگی کرتا تھا۔

۲۔ وہ جانتا تھا کہ کس قسم کی پالیسی مُلک کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ وہ رعایا کا ہمیشہ طرف دار رہتا تھا۔ گو ظرافت سے کام لیتا تھا مگر ظرافت میں مُلک کے مشہور مدیروں کی رائے کا نچوڑ ہوتا تھا۔

۳۔ اُس کی زبان صاف اور صحیح تھی جس کے چار پانچ مضامین اودھ پنچ میں چھپ گئے۔ وُہ سمجھتا تھا کہ اُسے اچھی اُردو لکھنے کی سند مِل گئی۔

۴۔ اُس کو اچھے اچھے مضامین نگار مِلے اور کتنے ہی اہلِ قلم اُس کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ابتدا میں اسی میں تھے۔ نمبر دو حضرت کسمنڈوی جن کی زبان کی صفائی اور عبارت کی فصاحت و بلاغت پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالتی تھی۔ نمبر تین مرزا ستم ظریف کہ اُن کی تحریروں سے تو پیٹ میں بَل پڑ جاتے تھے۔ اگر لکھنؤ کی باتیں لکھتے تو اُمراء اور عوام کی زندگی کا نقشہ اس انداز سے کھینچتے کہ پڑھنے والوں کو لطف حاصِل ہوتا۔ مثلاً لوگ بٹیر کس طرح لڑاتے ہیں۔ مقدمہ باز عدالتوں میں کس طرح مقدمہ کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے بانکے نوجوان کس ٹھاٹ اور ٹھسّے سے نکلتے ہیں۔ غرض وہ روزمرّہ کی زندگی اور عام باتوں کو اس انداز سے لکھتے کہ پڑھنے والے اور سُننے والے تڑپ جاتے۔ ان کے مضامین محاورات کے خزانے اور فصاحت کے ڈھیر تھے۔

۵۔ بعض لوگوں کی ایک آن تھی کہ جب بھی لکھا، اودھ پنچ کے لیے لکھا۔

۶۔ جو شخص دُوسرے اخبار میں لکھتا تھا اودھ پنچ میں اس کا مضمون نہیں چھپتا تھا۔

۷۔ اودھ پنچ اس مُلک کے تہواروں اور خوشیوں کو نہیں بھُولا۔ وہ سب کے متعلق لکھتا۔ خود بھی لطف اُٹھاتا اور دُوسرے بھی محظوظ ہوتے۔ بڑے دن کی ڈالی، نئے سال کے ساقی نامے اس کے بندھے ہُوئے مضامین تھے۔ اُس کے ساقی ناموں میں سال بھر کے واقعات ہوتے تھے۔ ہولی میں وہ ہولی کے مضامین شائع کرتا۔ یہ اتحاد کا حامی تھا۔ اور کانگریسی خیال کا تھا۔ اس اخبار نے ہندُو مسلمانوں میں میل کی کوشش کی اور وہ ان اخباروں کا کبھی ساتھی نہیں ہُوا جنھوں نے گروہ بندی کی، طرف داری کی اور دوسروں کی مخالفت کو بہادری سمجھا۔ اس کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دُنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس پر اُس کا قلم نہ اُٹھتا ہو، روزمرّہ کے چھوٹے موٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ساتھ۔ اودھ پنچ میں صحتِ زبان کے متعلق اور شعرا

کے کلام پر اصلاح دینے اور اعتراضات جڑنے اور مباحثہ چھیڑنے کا سلسلہ مہینوں نہیں بعض دفعہ سال ہا سال چلا۔[۱۵] اس اخبار میں مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری پر بھی اعتراضات ہوئے اور ان کی ایک ایک سطر ایک ایک شعرِ دیوان، مقدمہ شعر و شاعری، رباعی پر اعتراضات ہوئے اور اس اخبار میں یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ اودھ پنچ کا آخری تاریخی معرکہ گلزارِ نسیم کے سلسلہ میں ہوا۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے گلزارِ نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراضات کئے تھے اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مثنوی دراصل آتشؔ کی ہے اور یہ نام اس پر فرضی ہے۔ یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا اور اخبار میں گل افشانیاں ہوتی رہیں۔[۱۶]

اودھ پنچ نے اردو کی جو خدمت کی ہے اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ظرافت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے پڑھنے اور سننے والے اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی، وہ مہینوں لوگوں کی زبان پر رہتی اور دور دور تک مشہور ہو جاتی اور ان کا جو نشانہ بنتے وہ دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔ اور دیکھنے والے ان کی بے بسی پر ہنستے تھے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس مذاق کے عادی تھے۔ اس وقت مذاق اور ظرافت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس اخبار نے ریاستوں کی خوشامد اور چاپلوسی سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت پسندی کا پردہ فاش کیا۔ اس کے مضامین کے علاوہ نظم کا حصہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ادبی خزانہ ہے اس نے بے انصاف لوگوں اور حاکموں کو بھی بے نقاب کیا۔[۱۷]

"منشی سجاد حسین صاحب اردو اخبار نویسی میں ایک خاص طرزِ مذاق اور ظرافت کے موجد تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور اپنے رنگ کے استاد تھے۔ انھوں نے آزادی اور ایمان داری کو ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیا۔ منشی صاحب اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے اور ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ جب تک زندہ رہیں اپنی آنکھوں سے اودھ پنچ کی موت دیکھیں۔ انھوں نے بڑی جانکاہی کے ساتھ اس کو پروان چڑھایا تھا۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں فالج کے دورے نے ان کی صحت و تندرستی کو خاک میں ملا دیا۔ بولنے کی طاقت تو قریب قریب ختم ہو گئی تھی، چلنا پھرنا جاری تھا، اور دماغ بھی کام کرتا تھا۔ انھوں نے بال مکند گپتا کو لکھا تھا کہ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ہی سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منھ سے لکھوا سکتا ہوں۔ کچھ لوگ ہمت کر کے نکال لیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار لبِ گور ہوں جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار اس لیے نکالتا ہوں کہ جیتے جی نہیں مر سکتا۔ ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔ اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو، ہاں گزشتہ زمانے میں کچھ تھا۔"[۱۸]

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اودھ پنچ کی تین نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور ایک نمایاں کمزوری کا۔ نمبر ۱۔ اس میں مزاحیہ صحافت کو نہایت شوخ انداز میں پیش کیا۔ اور مزاحیہ صحافت ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گئی جس کا اثر سارے برِ عظیم پر ہوا۔ نمبر ۲۔ یہ پہلا اردو اخبار تھا جس میں رائے زنی پر کسی چیز کے مضحکہ خیز پہلو کو نمایاں کرنے اور مخالف کو ذلیل کرنے کے لیے کارٹون کا حربہ باقاعدگی سے استعمال کیا۔ نمبر ۳۔ اس نے سیاسی اور معاشرتی مسائل اور بین القومی سیاست پر تند و تیز اور بے باک انداز میں تبصرہ کیا۔ نمبر ۴۔ اودھ پنچ سے بقول ان کے اردو صحافت کو ایک نقصان بھی پہنچا کہ اس نے مزاح میں ابتذال اور پھکڑپن کو فروغ دیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہی رنگ اختیار کر لیا۔ اور پھر اس کی تقلید میں جو پنچ اخبار ہندوستان کے طول و عرض میں نکلے۔ انھوں نے پھکڑپن، ابتذال اور فحش نگاری میں انتہا کر دی۔ یہ رنگ صحافت تیس پینتیس سال تک مسلط رہا۔ اور اس کے بعد اِصلاح ہوئی۔"[19]

یہ اخبار منشی صاحب کے انتقال سے دو سال قبل ۱۹۱۲ء میں بند ہو گیا۔ اس کا سائز ۱۲½ × ۹ انچ ہوتا تھا۔ اس میں آٹھ صفحات ہوتے تھے۔ ہر صفحہ پر تین کالم اور کالم میں پینتیس ۳۵ سطریں ہوتی تھیں۔[20]

ہندوستانی ہفتہ وار ۱۸۸۳ء

وہ اخبارات جنھوں نے اخبار نویسی کی ایک غرض قائم کی اور ایک پالیسی جاری کی، ان میں لکھنؤ کا "ہندوستانی" اخباروں میں پہلا اخبار ہے۔ اس اخبار نے یہ بتایا کہ اردو اخبار کس راستہ چلیں اور کیا لکھیں۔ جس طرح کلکتہ کے ہندوستانی اخباروں کی پالیسی قائم کرنے والا "امرت بازار پتری کا" اور "ہندو پیٹریاٹ" ہے ویسے ہی اردو اخباروں میں "ہندوستانی" اخبار ہے جس نے اردو اخبار نویسوں کو اخبار نویسی کی غرض بتائی۔ شروع میں وہ اُردو، ہندی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ اور ہیتھو میں شائع ہوتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ "ہندوستانی" ہر ہفتے تین سو خبریں دیتا ہے۔ اور یہ سچ مچ چھوٹی موٹی خبروں کا اخبار ہے۔ پھر اس نے ہندی کو رخصت کیا اور اب یہ اُردو میں نکل رہا ہے۔ پہلے ہفتے میں دو بار پھر تین بار نکلنے لگا۔ اور اس کی ضخامت بڑی کر دی گئی تب ہی یہ قابلِ تذکرہ ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں :

۱۔ شروع ہی سے مُلکی معاملات پر ہاتھ ڈالا۔ مُلکی معاملات پر آرٹیکل لکھے۔ ہر معاملے پر اُس کی رائے ضرور ہوتی تھی۔ اُس کے سال بھر کے نمبروں کا مجموعہ سال بھر کی سب مُلکی اور دُوسری خبروں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اُس کی فائل سال بھر کے واقعات کا ایک خاص مجموعہ ہوتی ہے۔ "ہندوستانی" سے پہلے اردو اخباروں میں یہ بات کسی کو حاصل نہ تھی۔ مدراس میں کانگریس

کے پریذیڈنٹ مسٹر گھوش کی تقریر کا پورا ترجمہ "ہندوستانی" کے ایک نمبر میں نکل گیا۔ پارلیمنٹ کی باتیں، ولایت میں ہندوستان کے متعلق تقریریں، بڑے لارڈ صاحب اور ہندوستان کے دوسرے حکام کی تقریریں جس قدر ہندوستانیوں کے جاننے کے لائق ہیں، وہ سب اس میں شائع ہوتی ہیں۔

۲۔ وہ آزادی سے لکھتا ہے۔

۳۔ تہذیب کا خیال رکھتا ہے۔ گرے ہوئے واقعات کی خبر شائع نہیں کرتا۔ نامعقول بات کا جواب معقول طریقہ سے دیتا ہے، ورنہ خاموش رہتا ہے"۔[۲۱]

اس کے ساتھ اور بھی اخبار نکلے جو اپنے فرض کو خوب پہچانتے تھے۔ یہ لاہور کا مشہور ہفتہ وار اخبار "رفیق ہند" تھا جس کے متعلق ہم آئندہ صفحہ پر روشنی ڈالیں گے۔

مہذب، لکھنؤ

انیسویں صدی کا یہ اخبار ۱۸۹۰ء میں مولوی عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ سے ہفت روزہ جاری کیا جو مواد اور خیالات کے لحاظ سے ایک اعلیٰ پائے کا اخبار تھا۔ اس کا غالب حصہ اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا اور قومی اور بین الاقوامی خبریں مختصر انداز میں دی جاتی تھیں۔ مولانا شرر سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے حامی نہ تھے لیکن ملکی سیاست کے بارے میں ان کی یہی پالیسی تھی کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا جائے۔ حکومت کی خیر خواہی کا دم بھرا جائے، اور دیسی ریاستوں کے بارے میں ذرا کھل کر لکھا جائے۔ ہندو مسلم چپقلش پر شرر نے جو شذرات وقتاً فوقتاً لکھے، ان میں واضح طور پر دو قومی نظریہ کی طرف بھی بعض اشارے ملتے ہیں۔

"مہذب" میں ادبی، علمی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور دینی ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے اور یہ پرچہ $\frac{۲۲×۱۸}{۴}$ سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔"[۲۲]

شرر کی ادبی زندگی کا آغاز بھی صحافت کے ذریعے ہوا تھا اور منشی احمد علی کسمنڈوی کی صحبت میں انھوں نے اخبارات میں مضامین بھیجنا شروع کیے تھے۔ اسی زمانے میں منشی نول کشور نے انھیں "اودھ اخبار" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا تھا۔ شرر زمانے اور پبلک کے مذاق کے بڑے نباض تھے۔ انھوں نے لطیف خیال آرائی کو سادہ اور دل کش اسلوب بیان کے ساتھ کچھ ایسے انداز میں سمویا کہ پورے ملک میں ان کی مضمون نگاری کی دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ہفتہ وار اخبار "محشر" جاری کیا جو مقبول ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں رسالہ "دل گداز" جاری کیا جس نے اردو کی تاریخی خدمت انجام دی۔ ان کی شہرت اور قسمت کی یاوری نے حیدرآباد پہنچا دیا۔ شرر بڑے ذہین محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں صفحات پر مضمون نگاری

کے دریا بہا دیے ۔ تاریخ، سوانح، مذہب اور اصلاح، علمی و ادبی مسائل ۔ ادبِ لطیف اور ناول۔ غرض کہ ان کی جولانیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مطالعہ وافر، حافظہ قوی اور قوتِ ادراک بہت تیز تھی بے تکلف لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ شررؔ کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ نظم طباطبائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۹۵ء میں وقار الامرا کے لڑکوں کے اتالیق کی حیثیت سے انگلستان گئے جہاں انھوں نے فرنچ زبان سیکھی۔ ۱۹۰۲ء میں شررؔ حیدر آباد سے لکھنؤ آگئے۔ اور باقی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کی۔[۲۳] (ان کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں اور وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی) مولانا کا مقام صحیفہ نگار کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔[۲۴]

"رفیقِ ہند" ۱۸۸۴ء

مولوی محرم علی چشتی نے لاہور سے یہ اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کے سولہ صفحات تھے اس کا چندہ بارہ روپے سالانہ تھا۔ اور مطبع رفیقِ ہند سے ہی شائع ہوتا تھا۔ مولوی محرم علی چشتی انگریزی اردو، فارسی کے ماہر تھے اور بہت ذمہ دار اور بے باک اخبار نویس تھے۔ اس اخبار میں علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین شامل ہوتے تھے۔ خبروں کے سلسلے میں بھی یہ اخبار بہت محتاط تھا۔ اور بعض معاملات کی مولوی محرم علی صاحب نے خود جاکر تحقیقات کی اور اس کے بعد انھوں نے پورے واقعات شائع کیے۔

انھوں نے اس اخبار میں اخبارات کی آزادی کے سلسلے میں بڑی جرأت سے کام لے کر ایسے آرٹیکل لکھے جن میں ولایت میں اخبارات کی آزادی کا ذکر تھا۔ اس طرح اس اخبار نے بالواسطہ طور پر آزادیٔ اخبار کے سلسلے میں انگریزوں کے ظلم و ستم کو بیان کیا، دوسری طرف اخبارات کی آزادیٔ رائے کی اہمیت کو برقرار رکھنے اور شعورِ عامہ کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ انیسویں صدی کا آخر وہ شدید زمانہ تھا جہاں اخبارات کے متعلق یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ وہ حکومتِ وقت کی پالیسی پر ایسے بے لاگ تبصرے کریں جس سے خود حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات پیدا ہونے امکانات ہوں۔ لیکن "رفیقِ ہند" نے اہلِ ہند کے جائز مطالبات منوانے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے نہایت جرات مندانہ انداز میں جدّوجہد کی اور مختلف ادوار میں واقعاتِ حاضرہ پر نہایت بے باکی سے بے لاگ تبصرے کیے۔ اس طرح نہ صرف صحافت کا معیار بلند کیا بلکہ آئندہ دور کے صحافیوں کے لیے بھی ایک واضح لائحہ عمل پیش کیا اور اپنے صاف سادہ اور دل کش انداز تحریر سے عوام کی ذہنی بیداری میں نمایاں حصہ لیا۔[۲۵]

پیسہ اخبار

۱۸۸۷ء میں اردو کا مقبولِ عام اخبار "پیسہ اخبار" لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے

مالک اور مدیر محبوبؔ عالم تھے۔ جنھوں نے اُردو صحافت اور اُردو زبان اور ادب کی گراں قدر خدمتیں انجام دی ہیں۔ منشی محبوبؔ عالم کو اخبار نویسی کا بڑا تجربہ تھا۔ انھوں نے اپنی ہمّت اور استقلال سے سب کام کئے۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے سب سے پہلے "ہمت" نکالا تو اس کی کتابت اور سنگسازی خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی بڑی غربت اور افلاس میں بسر ہوئی تھی لیکن انھوں نے اپنی بے پناہ ہمّت کی وجہ سے یکے بعد دیگرے مختلف اخبار جاری کئے۔ البتہ ان کی شہرت کا باعث "پیسہ اخبار" ہوا جو ہر ہفتہ آٹھ چھوٹے صفحوں پر نکلتا تھا۔[۲۶] اس کا سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے پریس کو بھی فروغ دیا اور اپنے اخبار کو بھی ۱۹۰۴ء میں جب وہ گوجرانوالہ سے لاہور آئے تو "پیسہ اخبار" بہت شہرت پا چکا تھا اور انیسویں صدی کے آخر میں یہ روزنامہ بن گیا تھا۔ اور اس کی ہر دل عزیزی اتنی بڑھی کہ "اخبار عام" بھی ماند پڑ گیا اور جب تک "زمیندار" منظرِ عام پر نہیں آیا، صحافتی دُنیا میں اس کا چرچا رہا۔[۲۷]

"پیسہ اخبار" بڑا کثیر الاشاعت اخبار تھا اور اس کی قیمت ایک پیسہ تھی۔ اس میں خبروں کے علاوہ مفید مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کی شہرت کا سبب اس کے اشتہارات کی زیادتی بنا۔ پیسہ اخبار نے شعورِ عامہ کو بیدار اور اخبار بینی کے ذوق کو عام کیا۔[۲۸]

اُردو صحافت کی ترقی میں پیسہ اخبار ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں مستقبل کے کئی صحافیوں نے اوّلین تربیت حاصل کی یا اس میں نمایاں کام کیا۔ لالہ دینا ناتھ جنھوں نے بعد میں "ہندوستان" جاری کیا۔ منشی احمد دین جنھوں نے "غم خوارِ عالم" جاری کیا۔ حکیم غلام نبی جو بعد میں "الحکماء" کے مدیر ہوئے۔ منشی محمد دین فوقؔ جنھوں نے "کشمیر میگزین" نکالا اور بے شمار اچھی کتابیں لکھیں۔ مولوی شجاع الدّین جنھوں نے بعد میں "مِلّت" کی ادارت سنبھالی۔ میر جالبؔ دہلوی، جو "پیسہ اخبار" کے بھی مدیر تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ موخر الذکر اپنی وسعت معلومات اور روانیٔ تحریر کے اعتبار سے اُردو اخبار نویسی کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں[۲۹]۔ میر جالبؔ دہلوی کی وجہ سے ہی پیسہ اخبار کے افتتاحیہ پُر مغز ہوتے تھے۔ کیوں کہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں کام آتا تھا۔[۳۰]

"پیسہ اخبار کی ایک اہم خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس کے تبصروں میں بھی ہمیشہ توازن نمایاں رہتا تھا۔ پیسہ اخبار میں بلاشبہ اخباریت غالب تھی۔ مضامین اور اداریے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا روزمرّہ کی زندگی سے تعلّق تھا۔ اس اخبار نے صحافت کو تجارت کے اصولوں پر چلایا۔ قیمت کم رکھی، اشتہارات کی فراہمی پر زور دیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیسہ اخبار نصف صدی سے زیادہ زندہ رہا۔" [۳۱]

پیسہ اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوستان کے دُور دراز علاقوں میں جاتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی مشہور نظم "واکر نامہ" پیسہ اخبار میں چھپی اور حیدر آباد دکن میں اس نظم نے بے انتہا اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اس کی اشاعت کے بعد اس کا ایک ایک پرچہ نایاب ہو گیا۔ [۳۲] (منشی محبوب عالم کا انتقال مئی ۱۹۳۳ء میں ہوا) وہ اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی، ترکی اور رُوسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ اُس وقت کے ہندوستان کا کوئی اخبار نویس اتنی زبانوں سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ جرمن زبان سے بھی آپ کو تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ آپ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اُن کی ذاتی لائبریری میں بیس ہزار کتابیں تھیں جن کی قیمت کئی لاکھ روپے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اثاثہ ان کی بیٹی نے پنجاب یونی ورسٹی کو مفت نذر کر دیا تھا۔

وکیل، امرتسر

اس صدی کے آخر ۱۸۹۵ء میں امرتسر سے ہر دوشنبہ کو بارہ صفحات پر مشتمل وکیل اخبار نکلتا تھا۔ [۳۳] اس کے مہتمم شیخ غلام محمد تھے۔ عمالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ یہ اخبار اپنی اصابتِ فکر، بیان کی متانت اور مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کے لیے عرصۂ دراز تک مشہور رہا۔ بقول حسرت موہانی "زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے اعتبار سے "زمیندار" کی طرح "وکیل" بھی ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس کے ایڈیٹوریل کی آزادی کا مقابلہ نسبتاً کوئی دوسرا اخبار نہیں کر سکتا۔ مثلاً (۲۹ اپریل کے پرچے میں) مسلم یونیورسٹی اور رائے عامہ کے مطالبہ پر ایک قابلِ قدر مضمون نکلا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قائم ہونے والی مسلم یونیورسٹی کو بہر حیثیت حکومت کی ماتحتی سے آزاد رہنا چاہیے۔ اس کا چانسلر مسلمان ہو اور اس کی عنان مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کی تعلیمی زبان اردو رکھی جائے"۔ [۳۴]

مولانا محمد علی لکھتے ہیں کہ "وکیل" اردو صحافت کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے خیالات ہمیشہ دانش مندانہ اور پُر وقار رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ذہنی رواداری کا مظہر تھا۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو اُس دور کے بہتر انگریزی اخباروں میں بھی شاید ہی ملتی ہے۔" [۳۵]

اس اخبار سے بڑی بڑی شخصیتیں وابستہ رہیں مثلاً مولانا عبداللہ عمادی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور آخیری دور میں مولانا عبداللہ منہاس، جالب دہلوی، مولوی انشا اللہ اور مولوی فیروزالدین فیروز۔ [۳۶] اس اخبار کے دو کالم ہوا کرتے تھے۔ ہر کالم میں چالیس سطریں اور ہر سطر میں تقریباً ۲۲ لفظ۔ (۴۰ × ۲ × ۲۲ = ۱۷۶۰ کُل الفاظ ہوتے تھے)۔ اس اخبار میں اعلیٰ مضامین کا معقول

معاوضہ بھی ملتا تھا۔ ادبی لحاظ سے اس اخبار میں بعض معرکے کی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں مثلاً منشی لشمبر داس سکنہ بٹالہ کا ایک فارسی قصیدہ، عرفی کے قصیدے کے طرز پر، ۵۷ اشعار پر مشتمل تھا۔ عرفی کا مشہور قصیدہ یہ ہے :

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

ا۔ (۱) منشی صاحب کا قصیدہ :

۱ برسرِ خاک شہیداں بچہ عنواں رفتم	قطرۂ خوں شدم و از رہ مژگاں رفتم
۲ شعلہ ہائے دل سوزاں بکف و گریہ کناں	بر سرِ گورِ عزیزاں بچراغاں رفتم
۳ ساغرِ لالہ کنم پر ز مے خونِ جگر	اشک ریزاں ز غمش چوں بہ بیاباں رفتم
۴ بود فرش رہ او ناصیۂ نقشِ سجود	در مقامے کہ ز فیض دل ناداں رفتم
۵ حکمت آموختم و گنج ہنر اندوزیدم	آخرِ کار ازیں مرحلہ ناداں رفتم

(۲) شیخ غلام قادر گرامی کی فارسی غزل :

۱ تو اسرارِ دل آگاہ از غافل چہ می پرسی	رموز قعر دریا از لب ساحل چہ می پرسی
۲ دلم آفت بجاں آورد حرف از جاں چہ می رانی	بجاں افتادہ کارم ماجرائے دل چہ می پرسی

ب۔ خبروں پر تبصرہ (۱) اس اخبار کی ایک بڑی خصوصیت خبروں پر طویل تبصرے اور ان پر آزادانہ رائے کا محتاط طور پر اظہار ہے۔ ۵ اپریل ۱۸۹۷ء کے پرچے میں سر جیمز ویسٹ لینڈ نے جو بجٹ پیش کیا اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی کہ گورنمنٹ توسیع ریلوے کرے۔ "وکیل" نے اس سلسلہ میں بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ گورنمنٹ کو توسیع آبپاشی کرنی چاہیے نہ کہ توسیع ریلوے۔ انسدادِ قحط مقدم امر ہے۔ ریلیں غلہ پیدا نہیں کرتیں۔ ریلوے کی توسیع کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے خزانے سے معتدبہ حصہ یورپین انجینئرز کی تنخواہوں میں نکل جائے۔ غرض اس طرح اس اخبار نے بجٹ کے تبصرہ پر چار کالم صرف کیے۔

(۲) زراعتی محکمہ پر طویل تبصرہ شائع کیا کہ اسبابِ قحط کی تنقیح کی جائے اور بشرطِ امکان زراعتی پیداوار کے اوسط کو بڑھایا جائے۔

(۳) اخبار نے قحط کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جن کے واسطے دن رات میں چار چار مرتبہ ڈبل روٹی، بسکٹ ہے ان کے واسطے نہ قحط ہے نہ وبا۔ وہی سیر، وہی شکار اور وہی ڈیرہ دون"۔ غرض اس طرح اخبار نے سماجی بہبود کی خاطر کھل کر اپنے اخبارات میں رائے زنی کی۔

(۴) ۲۹ مارچ ۱۸۹۷ء سے جنگِ کریٹ پر طویل تبصرے اور خبریں شائع ہونے لگیں۔ ہر خبر تین سطر کی ہوتی تھی اور تین سطر کا تبصرہ ہوتا تھا جس کا عنوان یہ تھا کہ "یونان کا اعلانِ جنگ یورپ کے خلاف"، "جنگ روم اور یونان کی خبریں مفصل طور پر شائع کرنا شروع کر دیں۔

(۵) کریٹ اور یونان کے مفسدہ پرداز عیسائیوں نے چندہ جمع کر کے والنٹیرز بھیجنے شروع کر دیے تو اخبار نے زبردست نوٹ لکھ کر ترکی کے مسلمانوں کی حمایت کے لیے لوگوں کو متوجہ کیا کہ اگر عملی مدد نہیں کرتے تو کم از کم قلم کے ذریعے ہی مدد پہنچائیں۔ اس اخبار نے ۱۰ مئی ۱۸۹۸ء کو اداریہ لکھا کہ یورپین قومیں کس طرح تہذیب پھیلا رہی ہیں۔

(۶) اخبار نویسی کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت، صحافت کے تحفظ کے لیے طویل اداریے لکھے۔ اسی طرح انسدادِ رشوت ستانی کے خلاف کئی کالم لکھے۔ نیز سرحد کے ہنگاموں کی روک تھام کے لیے دوسرے متبادل انتظامات، ... انتظامِ حکومت کے سلسلے میں ہندوستان اور ملایا کی انگریزی حکومت کے خانے، ہندوستان کی تجارت میں مسلمانوں کو حصہ دلانے کی کوشش کرنا اور سنسر شپ کے خلاف کھل کر لکھا۔ غرض اس اخبار نے مسلم صحافت کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

(۷) ہمیشہ مصری اور انگریزی اخبارات کے تراجم سے یہ اخبار پُر رہتا۔ ممالکِ شرق و غرب کی خبریں اور ان پر طویل اداریے اور تبصرے شائع کیے۔

حواشی:

۱ .. .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۱۷۹

۲ .. .. سرسید احمد خاں: تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، یکم جمادی الثانی، ۱۲۸۸ھ

۳ .. .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۱۸۱

۴ .. .. ایضاً، ص ۱۸۶

۵ .. .. رسالہ "زمانہ" کان پور، جولائی، اگست ۱۹۰۴ء

۶ .. .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۱۶ - ۳۱۵

۷ .. .. امداد صابری: تاریخ صحافت اردو، جلد دوم، حصہ اوّل، دہلی۔ ص ۵۰ - ۲۴۹

۸ .. .. الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۶۱ - ۶۰

۹ .. .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۱۹ - ۲۱۸

۱۰ .. .. اختر شہنشاہی، ص ۱۲

۱۱ھ .. پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ : بحوالہ صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا ، ص ۲۶۳ -

۱۲ھ .. امداد صابری : تاریخ صحافت اُردو ، محولہ بالا ، ص ۳۲۸ -

۱۳ھ .. رئیس احمد جعفری : رندِ پارسا (سوانح ریاضؔ خیرآبادی) ص ۳۹ -

۱۴ھ .. ایضاً - ص ۲۸۱ -

۱۵ھ .. امداد صابری : تاریخ صحافت اُردو ، محولہ بالا ، ص ۵۲۰ -

۱۶ھ .. ایضاً - جلد سوم ، ص ۹۷ -

۱۷ھ .. منشی سجاد حسین : خط بنام بال مکند گپتا ، رسالہ " زمانہ " کان پور ، اکتوبر ۱۹۰۴ء ، بحوالہ تاریخ صحافت ، جلد سوم ، ص ۱۲۵ -

۱۸ھ .. ایضاً ، ص ۱۲۵ -

۱۹ھ .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا ، ص ۲۴۷ -

۲۰ھ .. ایضاً ، ص ۲۴۶ -

۲۱ھ .. رسالہ " زمانہ " کان پور ، اکتوبر ۱۹۰۴ ، محولہ بالا -

۲۲ھ .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا ، ص ۲۷۰ -

۲۳ھ .. امداد صابری : تاریخ صحافت اُردو ، حصہ سوم ، ص ۷۱ - ۴۷۰ -

۲۴ھ .. بدر شکیب : اُردو صحافت ، ص ۱۷۲ -

۲۵ھ .. ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی : غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین - سکھر -

۲۶ھ .. بدر شکیب : اُردو صحافت ، ص ۱۷۴ -

۲۷ھ .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا ، ص ۳۲۰ -

۲۸ھ .. بدر شکیب : اُردو صحافت ، ص ۱۷۴ -

۲۹ھ .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا ، ص ۳۲۰ -

۳۰ھ .. ایضاً - ص ۳۲۱ -

۳۱ھ .. پیسہ اخبار ، لاہور ، مئی ۱۹۰۹ء -

۳۲ھ .. وکیل ، امرتسر کے فائل (اس اخبار کے کچھ شمارے اقبال اکیڈمی لاہور میں ہیں) -

۳۳ھ .. حسرت موہانی : اُردوئے معلیٰ ، علی گڑھ ، مئی ۱۹۱۱ء ، بحوالہ تاریخ صحافت اُردو (امداد صابری) جلد سوم ، ص ۶۷۸ -

۳۴ھ .. مولانا محمد علی : کامریڈ ، بحوالہ صحافت پاک و ہند میں ، محولہ بالا -

۳۵ھ .. امداد صابری : تاریخ صحافت اُردو ، جلد سوم ، محولہ بالا ، ص ۶۸۵ -

۳۶ھ .. وکیل ، امرت سر ، محولہ بالا -

اُردُو رسائل

اُردو صحافت کا ایک بڑا مقصد اخبار کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مغربی سائنس اور مشرقی علوم پر مشتمل مواد سے متعلقہ علمی مضامین شائع کیے جائیں تاکہ جدید نسل کو دونوں علوم اور طرزِ فکر کے متعلق آگاہی ہو سکے۔ اخبارات یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے اس لیے رسائل نے اس ذمہ داری کو اٹھانے کی ہمّت کی۔ شروع شروع میں مشنریوں نے اس کی طرف توجہ کی اور تبلیغی مواد کے ساتھ ساتھ علمی، تاریخی اور جغرافیائی مضامین شائع کیے اور اُردو زبان میں ایک منظم تحریک کی صورت میں ۱۸۳۶ء میں مرزا پور سے "خیر خواہ ہند" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ یہ اُردو کا پہلا رسالہ تھا جو ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا۔ اس میں خبریں نہیں بلکہ مضامین چھپتے تھے [1]

"فوائد الناظرین" ماسٹر رام چندر کا پندرہ روزہ اخبار تھا جس کا اجراء ۱۸۴۵ء میں ہُوا۔ یہ پندرہ روزہ بالتصویر علمی اور تاریخی اخبار تھا۔ "فوائد الناظرین" اور "قران السعدین" دونوں کے دونوں دہلی سے نکلتے تھے اور طبیعیات، ہیئت، کیمیا اور انجنیئرنگ کے مسائل پر بھی ان میں تصویروں اور نقشوں سے مدد لے کر وضاحت اور معلومات پیش کی جاتی تھیں۔ ان دونوں رسالوں کے دونوں مہتمم اور مضمون نگار اکثر دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

"محبِ ہند" مسٹر رام چندر کا ایک اور ماہوار علمی اور ادبی رسالہ تھا جو یکم ستمبر کو جاری ہُوا جس کی ضخامت ابتدا میں ۵۰ صفحے تھی۔ بعد میں ۵۶ کر دی گئی۔ اس کی سالانہ قیمت بارہ روپے تھی۔ دراصل "محبِ ہند" کا پہلا نمبر "خیر خواہِ ہند" کے نام سے نکلا تھا اور دوسرے نمبر سے اس کا نام محبِ ہند ہو گیا تھا۔ یہ اعلیٰ معیار کا علمی، معلوماتی اور تاریخی مضامین کا حامل رسالہ تھا جس میں سائنس کے مضامین کے علاوہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے متعلق تاریخی مضامین کی کثرت ہوتی تھی۔ چوں کہ رام چندر صاحب

دہلی کالج کے بھی تعلیم یافتہ تھے۔ اور دہلی کالج اور اس کی علمی اور صحافتی خدمات کے بارے میں ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس انجمن نے سنسکرت عربی اور فارسی کی اعلیٰ درجے کی تصانیف نیز انگریزی کی مختلف کتابوں کے عمدہ ترجمے کرکے اہلِ ہند کی بڑی خدمت کی۔ ان کتابوں کی تیاری میں ان اصطلاحوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے جو اصول ملحوظ رکھے تھے وہ آج بھی ہمارے لیے شمعِ ہدایت ہیں۔[۲]

رسالہ دہلی سوسائٹی

دہلی سوسائٹی جو کہ علمی و ادبی سوسائٹی تھی، ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی۔ یہ انجمن ماسٹر پیارے لال آشوب کی مساعی کی بہت ممنون ہے۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا اور ۱۸۷۲ء کی میٹنگ میں سوسائٹی نے یہ طے کیا کہ رسالہ بہت ضابطے کے ساتھ نکالا جائے۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ میں شامل ہونے والے اور اس میں مضامین پڑھنے والے دہلی کے مقتدر اور اہلِ علم حضرات میں مرزا غالب، منشی ذکا اللہ، ماسٹر رام چندر، مولانا الطاف حسین حالی، حکیم غلام رضا خاں دہلوی، مولوی سیف الحق ادیب دہلوی، مولوی اُلفت حسین مدرس، ماسٹر لچھمن داس، میر نصرت علی ایڈیٹر نصرت اخبار، میر قاسم علی، ماسٹر پیارے لال اور کرنل ینگ کمشنر دہلی ہیں۔

اس سوسائٹی میں جو مضمون پڑھے جاتے تھے اور رسالے میں شائع ہوتے تھے، عالمانہ، تاریخی اور پُراز معلومات اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق ہوتے تھے۔[۳]

تہذیبُ الاخلاق

۱۲ر دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ یہ رسالہ بقول مولانا حالی[۴] مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کی ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے سرسید نے ولایت سے آکر جاری کیا۔ اس کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ پرچہ تاجرانہ نظریہ کے تحت نہیں نکلا، بلکہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے جاری ہوا تھا۔ اس کے جاری کرنے کا مقصد سرسید مرحوم کے الفاظ میں یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، جس کے معنی نہایت وسیع ہیں اور اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق و معاملات اور تمدن و معاشرت اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا۔[۵] "تہذیب الاخلاق" میں علمی اور دینی مسائل پر تحقیقی اور اصلاحی اور تنقیدی و

تحقیقی و اصلاحی، تنقیدی و معاشرتی اور تمدنی مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے اور اس کو ترقی دینے میں ہر خیال اور عقیدہ کے آدمی کی مدد چاہتے تھے اور ان کے تعلیمی کاموں کو سراہنے اور کامیابی کے متمنی ہوتے تھے۔

"اس رسالے کے مضمون لکھنے والوں میں سرسید، مولوی مہدی علی خاں، منشی مشتاق حسین، مولانا الطاف حسین حالی، منشی ذکاءاللہ اور محمد احسان اللہ وغیرہ تھے۔ سرسید مذہبی مضامین کے علاوہ معاشرتی، تمدنی مضامین بھی لکھتے تھے۔ اس رسالے کے دو تین پرچے ہی جاری ہوئے تھے کہ اس کی مخالفت چاروں طرف سے شروع ہوگئی۔ اور کئی اخبار اور رسالے اس کی مخالفت میں جاری ہوگئے۔ جن میں اودھ پنچ، نورالآفاق، نورالانوار، اور آخر میں لاہور کا اخبار رفیق ہند اور آگرہ کا تیرھویں صدی تھا۔ اخبارات کا یہ زور تقریباً تیس برس رہا۔ اور تہذیب الاخلاق کے اجرا سے سب سے زبردست فائدہ یہ ہوگیا کہ موافق اور مخالف طور پر اخبار بینی کا شوق بڑھ گیا اور اردو زبان کی بے حد ترقی ہوئی۔ سرسید کے ہاں ہمیشہ اعتدال رہا اور انھوں نے ہمیشہ ذاتیات سے گریز کیا۔ اور اس زمانے کے اخبارات نے تہذیب الاخلاق کے مضمون و بیان کے بلند معیار ہونے کی وجہ سے اس کی تعریف کی اسی طرح گارساں دتاسی نے اپنے مقالات میں صفحہ ۳۴۲ پر تحریر کیا ہے کہ اس بے مثل رسالے میں جو سلسلۂ مضامین نکل رہا ہے، ان میں سے اکثر اسلامی اور دینیات اور فلسفہ کے علمی اور عملی فلسفہ سے متعلق ہیں۔ ان سے مذہب میں سچی دلچسپی اور روشن خیالی کے ساتھ انسانی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ زیادہ تر مضامین خود سرسید احمد خاں کے ہوتے ہیں"۔ بقول طاہر فاروقی صاحب آپ کے قومی و ملکی اصلاحی کام کا پہلا آلۂ کار یہی رسالہ تہذیب الاخلاق تھا جس میں نصف کے قریب مضامین خود سرسید کے ہوتے تھے۔"

مخزن الفوائد - ۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۱ھ

مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) اس کے مدیر تھے۔ کئی سال تک یہ علمی پرچہ جاری رہا۔ اس زمانہ کے تمام مشاہیر اہل قلم کے رشحات اس میں شائع ہوتے تھے اور یہ مغربی علوم سے لوگوں کو باخبر رکھتا تھا۔ اردو زبان کے علمی اور ادبی رسائل میں مخزن الفوائد اولین رسائل میں سے ہے جو حیدرآباد سے جاری ہوا۔ شمالی ہند اور پنجاب سے جو علمی اور ادبی رسائل نکلے، ان کا زمانہ اس کے بعد ہے اس کے مضمون نگاروں میں نواب محسن الملک، نواب سرور جنگ، مولوی مشتاق حسین

مرزا قربان علی بیگ سالک تھے۔ [۹]

رسالہ "حسن" حیدرآباد دکن

حیدرآباد کا ایک اور اہم ترین رسالہ مولوی حسن ابن عبداللہ نواب عماد نواز جنگ نے ۱۸۸۸ء سے "حسن" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں حیدرآباد اور شمالی ہند کے بہترین اہلِ قلم شامل تھے۔ مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی کے مضامین اس رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے بعد اردو میں اس پایہ کا کوئی اور اخبار نہیں نکلا۔ اس نے یورپ کے علمی رسالوں کے قدم بہ قدم چلنے کی پوری کوشش کی۔ [۱۰]

ڈاکٹر عبدالحق "حسن" کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق کے بعد علمی رسالے کی حیثیت سے ایک ہی رسالہ تھا جو اس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے بلکہ اسے کئی ایک لحاظ سے تفوق حاصل ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں لکھنے والے بعض ایسے نام ور اہلِ قلم ہیں جن کے علم و فضل پر قوم و ملک کو ناز ہے مثلاً فاضل اجل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن حیدرآباد، شمس العلما سید علی بلگرامی بی اے، جن کے بے بہا مضامین درج ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے زورِ قلم سے خود تہذیب الاخلاق بھی محروم رہا۔ یہ مضامین فی الحقیقت اس قابل ہیں کہ بار بار چھاپے جائیں۔ ملک میں شائع کیے جائیں۔ یہ محققانہ اور فاضلانہ مضامین اردو لٹریچر میں اپنی نظیر آپ ہیں اور سوائے رسالہ "حسن" کے کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ دوسرے یہ کہ تہذیب الاخلاق کا مقصد خاص تھا اور "حسن" کا عام۔ تہذیب الاخلاق کا دائرہ محدود تھا مگر "حسن" کا وسیع۔ اس میں ہر علم و فن کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ مذہبی، تاریخی، سوشل، ملکی، محققانہ، ہر قسم کے مضامین اس رسالے میں چھاپے جاتے تھے۔

نمبر ۳۔ چوں کہ ہر اچھے مضمون پر مضمون نگار کو ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی اس لیے اس رسالے میں ایسے عمدہ مضامین چھپتے تھے جو کسی میگزین کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ "حسن" کے بعد اردو زبان میں کوئی قابلِ وقعت میگزین نہیں رہا اگرچہ تہذیب الاخلاق نے پھر ایک بار جنم لیا مگر نظرِ بد نے اسے نہیں چھوڑا اور پھر بند ہو گیا۔ [۱۱]

جس طرح مخزن الفوائد اپنے فاضل مدیر کی مصروفیات کے باعث بند ہو گیا اسی طرح "حسن" بھی پانچ سال تک جاری رہ کر بند ہو گیا۔

انیسویں صدی کے چند دیگر رسائل

حیدرآباد سے چار اور اہم رسالے "دکن ریویو" سے پہلے نکلے۔ ۱۸۹۸ء میں مولوی

محب حسین نے "معلم نسواں" جاری کیا جس میں عورتوں کی ترقی، ان کے حقوق، ان کی آزادی اور پردہ کی مخالفت پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولوی محب حسین نے اس کے ذریعے اپنے ہم نوا اصحاب کی ایک اچھی خاصی جماعت بنالی تھی جن کے مضامین شمالی ہند کے بہترین رسالوں میں تعریف کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کے کمانڈر اِن چیف سر افسر الملک کی سرپرستی میں "افسر" مولوی محب حسین نے نکالا اور دو سال کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی ادارت اپنے ذمہ لے لی۔ گویا مولوی صاحب علمی دنیا میں اس رسالے کے ذریعے پیش ہوئے۔ آپ اس زمانے میں مدرسہ آصفیہ کے پرنسپل تھے۔ اور درس و تدریس کے ساتھ "افسر" کی ادارت بھی کرتے تھے۔[۱۲]

"دبدبہ آصفی" ۱۸۹۷ء میں نکلا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد اس زمانے میں کوئی سرکاری خدمت نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر علمی و ادبی مشاغل میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے پنڈت رتن ناتھ سرشار تلاش معاش کے ضمن میں حیدرآباد آئے۔ مہاراجہ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور "دبدبہ آصفی" شائع کرنے لگے۔ ایک طرف تو سرشار جیسا مدیر ملا، دوسرے مہاراجہ سا سرپرست جو "دبدبہ آصفی" دیکھتے ہی دیکھتے آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکنے لگا۔ اور اس نے اطراف ملک میں بلند پایہ مقالات اور دلچسپ مضامین کی وجہ سے بڑی نام وری حاصل کرلی۔ معنوی حسن اور صوری حسن بھی قابل دید تھا کیوں کہ یہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا تھا۔ سرشار کے انتقال پر یہ پرچہ بند ہوگیا۔

۱۸۹۸ء سے وحیدالدین سلیم کا پرچہ معارف نکلا۔

۱۸۹۹ء میں اٹاوے سے البشیر نکلا۔ اور فیروزآباد ضلع آگرہ سے ایک اور مشہور رسالہ ادیب نئے طرز کا علمی میگزین ۵۰ صفحات کا نکلنا شروع ہوا۔ بقول مولانا شبلی وہ اردو رسائل کا باوا آدم تھا۔[۱۳] اسی سال ۱۸۹۹ء میں "جلوۂ محبوبِ دکن" حیدرآباد سے نکلا کہ جس میں مولوی ظفر علی خاں کا مقدمہ اشرف المخلوقات شائع ہوا تھا۔ الغرض ماہوار رسائل میں انیسویں صدی کا دور اعلیٰ معیار پر رہا۔ "تہذیب الاخلاق" سب کا پیش رو اور سب سے بہتر تھا۔ دل گداز لکھنؤ ادب و تاریخ میں اپنے رنگ میں یکتا تھا۔ ان دو رسالوں نے فن مقالہ نگاری کے ارتقا میں سب سے زیادہ مدد دی۔ ادب اور انشا اور فکر اور تخیل کو تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

"پیامِ یار" لکھنؤ نے شعر و غزل کا جو صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا وہ اپنے انداز میں منفرد تھا۔ (۱) مرقع عالم" ہردوئی۔ (۲) "حسن" حیدرآباد۔ (۳) "معارف" علی گڑھ۔ (۴) "ادیب" آگرہ اپنی علمی اور ادبی خدمات میں نہایت وقیع اور ممتاز تھے۔[۱۴]

اُنیسویں صدی اس طرح اردو رسالوں کا علمی معیار قائم رکھتے ہوئے ختم ہوئی، اور بیسویں صدی کا آغاز ہوا۔

اُردوئے معلّیٰ، علی گڑھ

حسرت موہانی نے اس صدی کے آغاز میں "اردوئے معلّیٰ" کے نام سے علی گڑھ سے ایک ماہنامہ نکالا۔ یہ اگرچہ ایک ماہانہ رسالہ تھا لیکن اس کی اہمیت اس لیے تھی کہ اس میں علم و ادب کے ساتھ سیاسی مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا حسرت موہانی واحد مسلمان تھے جو گھوش، تلک اور پین چند پال کی سیاست کے حامی تھے، اور اپنے رہ نماؤں کے مضامین بھی چھاپتے تھے تیسرے یہ کہ اردوئے معلّیٰ گرم سیاست کا علم بردار تھا۔[۱۵]

اپریل ۱۹۰۱ء کو رسالہ مخزن اپنی علمی اور ادبی اہمیت کے ساتھ جاری ہوا اور عرصہ دراز تک اردو زبان کی اہم خدمت کرتا رہا۔ اور ملک کے دوسرے نام ور رسالوں سے خراجِ تحسین لیتا رہا۔

حواشی:

[۱] ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ: اردو کے علمی رسائل، سالنامہ ۱۹۵۰ء۔ [۲] محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی، محولہ بالا، ص ۲۴۹۔ [۳] امداد صابری: تاریخ صحافت، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۱۷۔ ۲۶۹۔ [۴] مولانا الطاف حسین حالیؔ: حیاتِ جاوید، محولہ بالا ص ۱۴۶۔ [۵] سرسیّد احمد خاں: تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جلد ۱ شمارہ ۱ (افتتاحیہ) یکم شوال ۱۲۸۷ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء۔ [۶] نصیر الدین ہاشمی: مقالہ در رسالہ "ہمایوں" لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۷۵۔ [۷] ایضاً۔ [۸] طاہر فاروقی: اردو نثر کے نمونے۔ [۹] نصیر الدّین ہاشمی: مقالہ در رسالہ "ہمایوں" محولہ بالا، ص ۷۵۔ [۱۰] ایضاً، ص ۴۷۔ [۱۱] مولوی عبدالحق: مقدمہ مختاراتِ حسن۔ (رسالہ "حسن" کے منتخب مضامین کا مجموعہ) [۱۲] نصیر الدّین ہاشمی: مقالہ در رسالہ "ہمایوں" محولہ بالا۔ [۱۳] امداد صابری: تاریخ صحافت، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۳۴۷۔ [۱۴] حامد حسن قادری: داستانِ تاریخ اردو، ص ۲۹۷۔ [۱۵] ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۳۴۲۔

دکن ریویو اور افسانہ

مولانا ظفر علی خاں نے جولائی ۱۹۰۲ء سے "افسانہ" کے نام سے سلیس اور فصیح اردو میں دل چسپ اخلاقی اور نتیجہ خیز انگریزی ناولوں کے تراجم کا ماہواری سلسلہ شروع کیا جو حیدر آباد دکن سے انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو ۵۰ صفحہ کے حجم کے ساتھ مطبع حیدرآباد پریس سے نکلنا شروع ہوا۔[1] افسانہ کے نمبر ۷ میں مولانا نے اس کے اجرا کی دل چسپ روداد بیان کی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ "افسانہ" کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چند یارانِ باصفا نے مل کر یہ قصد کیا کہ اس طرح کا پرچہ نکالا جائے کہ جس میں سب کا سرمایہ اور محنت مشترکہ ہوں۔ اور چوں کہ میری نسبت میرے رفقا اور شرکاء کو حسن ظن تھا اس لیے اس کی ایڈیٹری میرے سپرد کی گئی تھی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک کے سوا باقی سب رفیق اس سے الگ ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سخت و حالات نے اس رہے سہے رفیق کو بھی مجھ سے الگ کر دیا اور میں بالکل اکیلا رہ گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام چار آدمیوں کے سپرد تھا وہ ایک آدمی کو کرنا پڑتا تھا۔ اور جو مالی ذمہ داری پہلے چار آدمیوں پر بٹی ہوئی تھی اب ایک سے متعلق ہو گئی۔ دولتِ آصفیہ کے محکمہ ہوم سیکرٹری کے صدر مسٹر جمی کی اہم خدمت کی انجام دہی کے بعد اس میں پورے چھ گھنٹے صرف ہوتے ہیں اور کچھ دنوں سے تو بعض عہدے داروں کے رخصت پر چلے جانے کے باعث جو خدمات مجھے تفویض ہوئیں ان کے لحاظ سے پورے ۹ گھنٹے سرکاری کام کرنا پڑتا ہے۔ میرے غریب دماغ کی پراگندگی اور انتشار کی جو کیفیت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ صاحبوں میں سے وہ حضرات بخوبی کر سکیں گے جو خود سرکاری ملازم ہیں۔ لیکن بایں ہمہ کچہری سے واپس آکر تھکے دماغ کو آرام دینے کے بجائے "افسانہ" کے لیے ترجمہ شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد مطبع سے آئی ہوئی کاپیاں دیکھتا ہوں۔ پروفوں کی تصحیح کرتا ہوں۔ رجسٹروں کی خانہ پری کرتا ہوں اور جو دوسرے مشاغل ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ ۵۲

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب انگریزی ناولوں کے تراجم اور انگریزی رسالوں کے نمونہ پر علمی، ادبی یا مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں رسائل نکل رہے تھے۔ ظفر علی خاں کا رسالہ "افسانہ" اور "دکن ریویو" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان مشکلات کے پیش نظر جنوری ۱۹۰۴ء سے افسانہ کو دکن ریویو کے ساتھ شامل کر کے ایک حصہ بنا دیا اور فسانہ لندن اور دیگر علمی اور ادبی مضامین شامل کرنے کے بعد اب اس کا حجم ۶۰ صفحہ ہو گیا۔ اس طرح دکن ریویو میں نظم و نثر کے اعلیٰ درجے کے علمی و اخلاقی مضامین شائع کیے جانے کا اعلان ہوا۔ تاکہ ملک میں علم کا صحیح مذاق پھیلے اور اردو زبان کو ترقی ہو اس رسالے میں صرف ایسے افسانوں کے تراجم شائع کیے جانے کا اعلان ہوا جو دل چسپ اور پُر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب اور نتیجہ خیز ہوں، اس کے ساتھ مصنفین کی کتابوں پر بھی ریویو کیے جانے کا اعلان ہوا۔ اس نئے رسالے کی سرپرستی سرکشن پرشاد نے قبول کر لی اور انھوں نے اپنے ایک خط ۱۸ رمضان ۱۳۲۱ھ میں افسانہ اور دکن ریویو کی عزت افزائی کی، اپنی تصنیف بھی بھیجی اور فسانۂ لندن کے ترجمہ کی بھی تعریف کی۔

دکن ریویو کے مضامین

جنوری ۱۹۰۴ء	مضمون	مضمون نگار
	اداریہ (العالم متغیر)	ایڈیٹر
	بوعلی سینا	ظفر علی
	شہاب ثاقب	سید محفوظ علی
	حمد ذوالجلال	ایڈیٹر
	تزک جہانگیری و جہانگیر	شبلی
	سحابی کی رباعیات اور سرمد کی رباعی	ادارہ

فروری ۱۹۰۴ء (پہلے صفحہ پر مہاراجہ سرکشن پرشاد کی تصویر اور انعامی مضمون کا اعلان)

بوعلی سینا (۲)	حکیم محمد اجمل خان	(شیخ کے "قانون" پر تبصرہ)
فلسفۂ عشق	ایڈیٹر	(فلسفیانہ اہم مضمون)
رقعاتِ شاد	ایڈیٹر	(ریویو)
دیوانِ حمید	ایڈیٹر	(ریویو)
تزک جہانگیری و جہانگیر	شبلی	

تہذیب الاخلاق	شجاعت علی بیگ

مارچ ۱۹۰۴ء - جلد دوم - نمبر ۳ -
(صفحۂ اوّل پر نواب ظفر جنگ، وزیرِ افواج دولتِ آصفیہ کی تصویر)۔

بوعلی سینا (۳)۔	ایڈیٹر
حالات نواب شمس الملک	ایڈیٹر
صنعت وحرفت کی تعلیم	مولوی عزیز مرزا اوّل تعلقہ اربیٹر
پروانہ وشمع (نظم)	نادر کاکوروی
حضور نظام	
رخصت اے بزمِ جہاں	اقبال
تزک جہانگیری وجہانگیر (۳)	شبلی
تقلید کا اثر عوام کی نشوونما پر	سید محفوظ علی
فسانہ لندن (از صفحہ ۵۶ تا ۸۰)	از ایڈیٹر

ایڈیٹر کی طرف سے بوعلی سینا کے فلسفہ پر چار صفحات کا مضمون ہے اور ایجوکیشن کانفرنس کے گزشتہ اجلاس بمبئی میں مولوی عزیز مرزا صاحب کی دِل چسپ تقریر پر مبنی ان کا مضمون۔ اس کے علاوہ مختلف فارسی شعرا کے منتخب اشعار بھی درج ہیں، جن میں عرفی، رضی دانش، طالب آملی، داغ اور صائب قابلِ ذکر ہیں۔

اپریل ۱۹۰۴ء - جلد دوم

قیامتِ صغرا	ایڈیٹر
لنگر	مولوی سید محفوظ علی
محرم اور اشراف	نور المنیب جاگیردار
سلام	انیس
تخصیص	مولوی نورُ الضیا الدین

مئی ۱۹۰۴ء - نمبر ۵ - (صفحہ اوّل پر نواب شہاب جنگ وزیر کوتوالی وتعمیرات کی تصویر)

بوعلی سینا (۴)	ایڈیٹر
اُردوئے معلّیٰ کی اصلاح	نقاد
بیکن کے لطائف	
فلسفۂ عشق (۲)	ایڈیٹر

چشمِ عاشق	ایڈیٹر
حضورِ نظام	افضل حسین
احیاءِ علومِ عربیہ	شبلی نعمانی
دِل	ایڈیٹر

جون جولائی ۱۹۰۴ء۔ نمبر ۶، ۷ (صفحہ اوّل پر صفدر جنگ وزیر عدالت و امورِ عامہ کے حالات اور تصویر درج ہے)۔

دولت کیا ہے؟	مہاراجہ سرکشن پرشاد
بوعلی سینا۔ (۵)	ایڈیٹر
قانون	مرزا سلطان احمد منٹگمری
نظم	شبلی
اصلاحِ تمدّن	ذوالفقار جنگ بیرسٹر
نظم	پروفیسر حمید الدین کراچی
ریویو (بر رباعیات حالی، گنجینۂ امثال، انتخاب بہارِ دانش، حیاتِ صالح۔	ایڈیٹر
ہائے محمد اکبر خاں	ایڈیٹر
جزیرۂ میینہ کائی	محمد معشوق حسین بی،اے
غزل	غلام یاسین آہ دہلوی
فارسی نظم	از شبلی
غنی کی رباعی	

ماہ اگست ۱۹۰۴ء (ظفر علی خاں مدیر۔ محفوظ علی ایڈیٹر)۔

بوعلی سینا (۶)	ایڈیٹر
کلامِ حالی	الطاف حسین حالی
توحید	ضامن کنتوری
چاند کی ابتدائی حالت	راحت حسین بی اے۔
ماہِ کامل	بے نظیر شاہ
تقلید کا اثر عوام کی نشو و نما پر	محفوظ علی

غزل	پروفیسر محمد اقبال
عُذرِ گناہ بدتر از گناہ	پروفیسر نقاد
ریویو (بر نخلِ تمنّا)	پروفیسر نقاد
فسانۂ لندن (جلد دوم)	ظفر علی

ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء - نمبر ۹

مَیں نے اسلام کیوں قبول کیا؟	ڈاکٹر عزیز احمد ڈاکٹر آف فلاسفی - جرمن یونی ورسٹی
نظم	ظفر علی
فسانۂ لندن (جلد دوم از صفحہ ۱۷۹ تا ۲۰۲)	ظفر علی

اکتوبر ۱۹۰۴ء - نمبر ۱۰

ابر و باراں	مولوی عزیز مرزا
کلامِ اکبر	اکبر الہ آبادی
مبادی علوم	مرزا سلطان احمد
نظم فارسی	نور الضیاء الدین جج ہائی کورٹ
ریویو (بر کُتُب)	
فسانۂ لندن (از صفحہ ۲۰۳ تا ۲۲۶)	ظفر علی خاں

نومبر و دسمبر ۱۹۰۴ء - نمبر ۱۱، ۱۲ (صفحہ اوّل پر کرنل افسر جنگ بہادر سپہ سالار افواج آصفیہ کی تصویر)۔

بوعلی سینا (۷)	ایڈیٹر
غزل	شادؔ
ترقیٔ ایران ممکن است	مرزا اسماعیل
غزل	اشرف حسین شمسی
زبان	مرزا سلطان احمد
وکرم عروسی	عزیز مرزا
غزل	نور الضیاء الدین
افریقہ کا مسافر	محفوظ علی
غزل حالی	الطاف حسین حالی

موجِ دریا	اقبالؔ
خزاں رسیدہ پھول	درگا سہائے
سلطان محمود غزنوی	م ع دکن
قصیدہ	ایڈیٹر
حالات کرنل افسر الملک	ایڈیٹر (صفحہ ۷۱)
ریویو (بر کتب و رسائل)	ایڈیٹر (از صفحہ ۷۱ تا ۸۲)
فسانۂ لندن	ایڈیٹر (از صفحہ ۲۲۷ تا ۲۵۰)

ایڈیٹر کی طرف سے ضروری التماس میں یہ اعلان ہوا کہ دکن ریویو کا پہلا سال بخیر و خوبی ختم ہوتا ہے۔ یعنی یہ سال جنوری ۱۹۰۴ء سے شروع ہوا تھا۔ اس رسالے کی خریداری میں ۵۰۰ افراد نے حصّہ لے کر دکن ریویو کی بقا اور ترقی میں مدد کی۔ آئندہ سال سے افسانے کا لفظ حذف کر دیا جائے گا۔ صرف "دکن ریویو" نام باقی رہے گا۔

جنوری ۱۹۰۵ء سے جلد سوم کا نمبر ۱ شروع ہوا۔ جس میں مسلمہ کون پر مولوی سیّد کرامت حسین بیرسٹر (فاضل علوم مشرقیہ و مغربیہ) کا مضمون، مولوی عزیز مرزا کا عمدہ انشائیہ اور رمزِ موسیٰ پر ایڈیٹر کی نظم ہے۔ اور حسبِ سابق فسانۂ لندن کی جلد دوم ۲۲۶ صفحہ پر ختم ہوئی اور جلد سوم شروع ہوئی۔

فروری ۱۹۰۵ء نمبر ۲ میں سائنس کا نیا کرشمہ (از ایڈیٹر) ابن رشد از اشرف حسین، چاند کا منظر از راحت، انعامی مضمون اور مولوی صدیق حسن کی غزل شامل ہے۔

مارچ ۱۹۰۵ء نمبر ۳ میں تاریخ فلسفۂ اسلامیہ از ایڈیٹر، ندوہ اور تحقیق علم، فلسفۂ ابن رشد، اور نظم میں کلامِ اکبر، غزل داغ مرحوم اور مولوی نور الضیاء الدین کی فارسی غزل شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس پرچہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر کشن پرشاد نے دکن ریویو کی عزّت افزائی کے لیے چار روپے بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ ریویو کے سلسلے میں تاریخ فلسفۂ اسلامیہ کا اقتباس دیا گیا۔

اپریل ۱۹۰۵ء نمبر ۴ میں زبان پر مرزا سلطان احمد کے مضمون کے علاوہ نئی اور پرانی دنیا کے اصولِ سیاست، ندوہ اور تحقیقِ علم اور ابنِ رشد کے فلسفے پر مضامین شائع ہوئے۔

مئی ۱۹۰۵ء نمبر ۵ اور جون ۱۹۰۵ء نمبر ۶ میں انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمان، پر قاضی کبیر الدین بیرسٹر کا اہم مضمون، ابن رشد پر فلسفیانہ مضمون، زبان پر مرزا سلطان احمد کے مضمون کی قسط نمبر ۳ اور اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت پر ایک مضمون اور ایڈیٹر کی ایک اہم ترین

نظم بمبئی کے موضوع پر شائع ہوئی جس کے نوے اشعار ہیں۔ یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام میں نہیں چھپی ہے۔ اس نظم کو ہم ضمیمہ میں شامل کریں گے۔

اگست ۱۹۰۵ء نمبر ۸ میں مصر کے طبعی حالات از ایڈیٹر، ترجمہ انگریزی، رباعیات حالی، ضامن کنتوری کی طویل نظم، نامۂ قیام اور غزل شامل ہے۔

دکن ریویو کے دو اہم نمبر اور بھی نکلے۔ ایک کا نام "اسلام نمبر" جو ستمبر اکتوبر ۱۹۰۷ء کے شمارہ پر مشتمل ہے اور دوسرا نمبر "ہندو نمبر" تھا۔ اسلام نمبر میں معرفتِ نفس از سرکشن پرشاد، سچا اسلام اکبر حسین خان بہادر، اسلام میں عورتوں کا مرتبہ مولوی محمد اختر، خان بہادر اور معترضین از ایڈیٹر، اسلامی خطرہ از نقاش، غزل از نقاش، العام الاسلامی از مولوی عبد الحق، شامل ہے۔ یہ اسلام نمبر کا حصہ دوم تھا۔ اس سے پہلے اسلام نمبر کا حصہ اول نکل چکا تھا۔ اسلام نمبر پر دوسروں کی آرا ہم ریویو کے سلسلے میں درج کریں گے۔

اس طویل فہرستِ مضامین سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دکن ریویو نے اپنے علمی اور ادبی لحاظ سے ملک کے اچھے اور نامور انشا پردازوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا۔ اور اس کا شمار ملک کے سنجیدہ اور متین رسالوں میں ہوتا تھا۔ آئندہ ہم دکن ریویو کی دوسری خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے۔

اداریہ نویسی

ظفر علی خاں کے قلم سے دکن ریویو میں جو اہم اداریے لکھے گئے۔ ان میں سے چند اداریوں کے اہم اقتباسات درج ذیل ہیں: تاکہ ان کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کا اندازہ ہو سکے۔

از جنوری ۱۹۰۴ء

سالِ نو اور ہم

آج سنیں گے ہم اک ترانہ نیا   اک حکایت نئی اک فسانہ نیا

علمِ منطق میں ہر مبتدی کا پہلا سبق یہ ہوتا ہے "العالم متغیر"۔ بظاہر یہ دو الفاظ کا چھوٹا سا جملہ ہے لیکن حقیقت میں اس کا دائرۂ اطلاق اس قدر وسیع ہے کہ نظامِ شمسی کے بڑے سے بڑے جرم سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذرے تک ہر ایک شے اس قانون کی پابند ہے جو اس جملے کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔

بڑے بڑے اجرامِ سماوی جو ایک غیر محدود زمانے سے خلاءِ بسیط میں منتشر حالت میں گردش کرتے پھرتے تھے۔ کسی دوسرے جسم کے ساتھ ٹکرا کر منور ہو گئے اور نور و حرارت کے جدید اکتساب کے باعث ان قوتوں کے مظہر بن گئے جو حیات و ممات کو مختلف اشکال و

مدارج میں ظاہر کرتی رہتی ہیں۔ باغبان بیج بوتا ہے۔ کچھ دِنوں زمین میں رہنے کے بعد یہی بیج، جس کی حقیقت ایک خشک دانے سے زیادہ نہ تھی، ایک تروتازہ پودے کی شکل پکڑ کر اُگتا ہے۔ اور کچھ عرصے میں بڑھ کر ایک تناور درخت ہو جاتا ہے جس کے ہر پتّہ میں خدا کی شان نظر آتی ہے۔ شاخ میں ننھی ننھی کلیاں لگتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ کلیاں کِھل کر پھُول ہو جاتی ہیں جن کی ہر ایک پنکھڑی پر ستارہ کی کرن کا گمان ہوتا ہے اور پھر انھی پھُولوں سے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی پہلے بچّہ ہوتا ہے جب کہ اُس کی حالت ایک مضغۂ گوشت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر نِل بڑھ کر لڑکپن کے دَرجہ کو پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اور زیادہ نشو و نما پاکر سرزمین شباب میں قدم رکھتا ہے۔ اور اگر ایک فلاسفر کا قول صحیح سمجھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا جسمانی تشخص ہر آن تغیّر پذیر ہوتا ہے یعنی وہ عضلات اور ذرّات اعصابی جو اُس کالبد خاکی کی عمارت میں خشت و سیاع کا کام دیتے ہیں۔ آج وہ نہیں رہتے جو کل تھے۔ غرض کہ اس ہمہ گیر کلیہ سے کائنات کی کوئی شے بچ نہیں سکتی اور ہمارے ناظرین ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیں گے کہ افسانہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض بزرگوں اور کرم فرماؤں نے جن میں سے اکثر ایسے ہیں جن کی رائے کی ہماری نظر میں بہت بڑی وقعت ہے۔ بلحاظ اس حُسنِ ظن کے جو انھیں ہماری نسبت ہے، ہم سے کہا ہے کہ "افسانہ" نکالنے سے ہم اپنے زورِ قلم اور قوتِ دماغ کو بے جا صَرف کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اگر کوئی اعلےٰ درجہ کا علمی رسالہ جس میں اخلاق، فلسفہ اور علومِ جدیدہ کے نکات مندرج ہوں، شائع کیا جائے تو ملک و قوم کو بہت زیادہ فائدہ ہو۔ اگرچہ ہم اس رائے سے اختلاف کرنا گناہ خیال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی بعض ایسے وجوہ ہیں، جن کی بنا پر افسانے کا اجرا اگر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا تو غیر حق بجانب بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اوّلاً مُلک میں جس قدر پڑھے لکھے لوگ ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا دماغ ثقیل علمی مضامین کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا اور مُلک میں علمی مذاق ابھی اِس دَرجہ عام نہیں ہُوا کہ ایسے رسالے جن میں ٹھوس مضامین دَرج ہوں، درجۂ قبولیت حاصِل کر سکے۔ ہمارے یہاں کی تعلیم یافتہ پبلک چاہتی ہے کہ اس کے سامنے زیادہ تر ایسی تصنیفات و تالیفات پیش کی جائیں جن میں غور و فکر کا کام اپنی اور اُن کی جانب سے مُولف یا مُصنّف انجام دے چکا ہو اور ان کے لیے فقط پڑھنا باقی رہ جائے۔ ثانیاً ناول و افسانے فی نفسہٖ ایسے قابلِ مذمّت نہیں ہوتے۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو تہذیبِ نفس اور

علمِ اخلاق کا سب سے دِل پسند اور سب سے مرغوب ذریعہ ہیں۔ طبیب جب دیکھتا ہے کہ مریض کڑوی دوا سے جی چراتا ہے تو اسے تلخ گولی شکر میں لپیٹ کر کھلاتا ہے۔ عام طبائع میں اخلاق کے الونے اور بے مرچ کے سالن کو پسند نہیں کرتے تا وقتِ کہ بذلہ سنجی اور ظرافت کا چٹخارہ اس میں نہ دیا جائے۔ انھی وجوہ کی بنا پر ہم نے افسانے کا جاری کرنا مناسب سمجھا۔ اس کا اندازہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ آیا ان ۶۰۰ صفحوں میں، جو اس وقت تک افسانہ ان کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ کوئی امر ان کی نظر سے ایسا گزرا جو خلافِ تہذیب یا باعثِ تخریبِ اخلاق یا منافیٔ مقاصدِ ترقی زبان منصور ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اپنے ناظرین کی تفریح اور دِل بستگی کے لیے صرف ایسے مضامین پیش کرنے سے جو ان کی خواہش قصہ بینی ہی کو پورا کرتے ہوں، ہم ایک اعلیٰ تر فرض کی تکمیل سے قاصر رہے جاتے ہیں۔ جو یہ ہے کہ ناظرین کی دماغی خواہشوں کے پورا کرنے کا سامان بھی بہم پہنچائیں۔ گو عام طور پر وہ خواہشیں کیسی ہی خفیف کیوں نہ ہوں۔

اس کے علاوہ خود ناظرین کی طبیعت بھی ایک سال تک نرا ایک قِصّہ ہی پڑھتے پڑھتے اُکتا گئی ہوگی اور بر سبیلِ تغیر پسندی جو فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے، اس امر کی متمنی ہو گی کہ قصّہ کے علاوہ اور بھی کوئی چیز، گو وہ کیسی ہی ثقیل اور دیر ہضم کیوں نہ ہو، اس دسترخوان پر چُنی جائے، جو "افسانہ" میں ہر مہینہ بچھتا ہے۔ اس لیے ہم انکسار سے کام لیتے ہیں اور افسانے کے حجم میں کسی قدر اضافہ کر کے اس کے دو حصے کیے دیتے ہیں جِصّہ اوّل میں جس کا نام "دکن ریویو" طے کیا گیا ہے، نظم و نثر کے مختلف مضامین اور دِل چسپ باتیں ہُوا کریں گی۔ دُوسرے حصّہ میں جو افسانے کا حِصّہ اصلی ہے، بدستور قصّہ ہی شائع ہُوا کرے گا۔ حجم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ ۳۲ صفحے فسانۂ لندن کے اور ۲۴ صفحے دکن ریویو کے لیے۔"

نمبر۲۔ (محمد اکبر خاں برادرِ خورد نے ۶ جون ۱۹۰۴ء کو صبح کے وقت لاہور میں اِنتقال کیا تھا۔ ان کے تعزیتی پیغامات کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سے تھوڑا سا درجِ ذیل ہے:)

دولت ابد مدتِ آصفیہ کے جلیل القدر اُمرا اور اراکین کے علاوہ قوم کے واجب التعظیم راہ نما نواب محسن الملک بہادر، ڈپٹی برکت علی، شمس العلماء شبلی، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، خان بہادر میر اکبر حسین، نواب اعتماد جنگ ممبر کونسل ریاست ٹونک و دیگر بزرگانِ قوم نے جو ہمدردی فرمائی وہ میرے دل پر نقش رہے گی۔ ان میں سے بعض

دِل خود چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ اس لیے ایسے دِلوں سے جو نکلا، وہ دل ہی میں جا کر بیٹھا۔

اُردو لٹریچر کے سرمایۂ افتخار اور ہماری جاں بلب شاعری میں نئی رُوح پھونکنے والے مولانا حالی نے تعزیت کے خط میں کچھ تو اُس دِلی جوش کے اقتضا سے جو انھیں انسان اور انسان کی فطرت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنے کی وقتاً فوقتاً تحریک کرتا رہتا ہے اور زیادہ تو اس مصیبت میں میرا دِل بہلانے کی غرض سے ایک نظم مرحمت فرمائی ہے جو اس دفعہ درج کی جاتی ہے۔ اِس منظم نے میرے جراحت دِل پر مرہم کا کام دیا ہے۔ مگر خدا جانے کتنے دِلوں میں ناسور ڈال دے گی اور کتنے دِلوں کو ہرا کرے گی۔ ایک اور امر میرے لیے باعثِ تسکین یہ ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر، جس کی مشیّت میں ہم کچھ دخل نہیں دے سکتے، میرا ایک بھائی چھین لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے ایک ایسا قوتِ بازُو اور دُکھ دَرد کا شریک، ہر کام میں ہاتھ بٹانے والا دوست دیا جسے میں اپنے حق میں حق کی طرف سے ایک خاص عطیہ سمجھتا ہوں، وہ مولوی محفوظ علی صاحب علی گڑھ کے ایک سربرآوردہ گریجویٹ اور دولتِ آصفیہ کے ایک بڑے محکمہ کے عہدیدار ہیں جن کے مضامین دکن ریویو کے ناظرین کی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ اب "دکن ریویو" کی ایڈیٹری میں میرے شریک ہوئے ہیں۔

نمبر۳۔ تنقیدیں:

دکن ریویو میں مولانا کے قلم سے جو کتابوں، رسالوں یا نظموں پر تنقیدیں اور تبصرے شائع ہوئے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

رقعات شاد (خطوط مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ) ان کا بے لاگ تبصرہ اس طرح سے ہے:

"نمبر۱۔ مہاراجہ کی تحریرات اور ان کا کلام بعض دفعہ ذوقِ سلیم سے متجاوز کر جاتا ہے۔ اور صاف و سلیس، پاکیزہ اور عام فہم اُردو لکھتے لکھتے وہ ایسے ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں جو اُردوئے معلّیٰ میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نمبر۲۔ بعض جگہ غیر متین محاورے مثلاً "پَری چہرہ" جن کی تاب ایک متین تحریر نہیں لا سکتی۔ اس عدم مساوات کا سبب یہ ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی طرف سے مصنف کو بیشتر شغف رہا۔ ہم مرحوم کی طباعی کی قائل ہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کی تصانیف سوقیانہ اور اوچھے محاوروں کے استعمال سے اُردوئے معلّیٰ کے دربار میں ایک بہت بڑے الزام کی جواب دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ کے ہاں بھی بعض

مقامات پر اس قسم کے الفاظ بر سبیلِ اضطرار استعمال ہوتے ہیں۔
نمبر۳۔ ان خطوط میں اخلاقی سبق بھی ہیں اور مذہبی عقائد کا ذکر بھی ہے۔
نمبر۴۔ ان خطوط سے اصولِ حکمرانی کا بھی پتہ چلتا ہے۔"

۲۔ "محرم کی رسومات" پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ مصائبِ کربلا کو یاد کرکے پُرسوز مرثیہ پڑھنا اور سینہ کوبی کرنا، انسان کے ان قدرتی جذبات کے اظہار کا ایک خارجی طریقہ ہے جو ایسی حالت میں دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی شہادت اور اہلِ بیت کی تکلیف کو یاد کرکے مگدر ہلانے اور نقارہ بجانے سے کیا تعلق ہے؟"

ایڈیٹر نے اپریل ۱۹۰۴ء میں "قیامتِ صغرا" کے نام سے عشرہ محرم میں اکھاڑے، کھیل تماشے، اسبابِ سرور اور لہو و لعب پر طویل مضمون میں ایک جامع تبصرہ کیا ہے اور حیدرآباد کے ماحول میں جو اس قسم کے طور طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان پر زبردست چوٹ کی ہے

۳۔ پروفیسر حمید الدین فراہی بی، اے پروفیسر مدرسۃ الاسلام کراچی کے "دیوانِ حمید" پر ان کی تنقید اس طرح دکن ریویو میں شائع ہوئی:

"موصوف نہ صرف انگریزی میں بی، اے ہیں بلکہ ان کی تحصیل عربی اور فارسی میں منتہیانہ ہے اس لحاظ سے ان کا شمار گنتی کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی ہندوستان کو اس زمانے میں سخت ضرورت ہے اور ان کی اس غیر معمولی قابلیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے قدرشناس اور قابلیت پسند دوست والیٔ سرائے ہز ایکسی لنسی لارڈ کرزن نے دورۂ خلیج فارس کو تشریف لے جاتے وقت مولوی حمید الدین کو ترجمانی کی خدمت انجام دینے کے لیے ساتھ لیا تھا۔ ان کو شاعری سے بھی بالطبع خاص مناسبت ہے۔ ان کا فارسی کلام اس پائے کا ہے کہ اگر مشاہیر اساتذۂ ایران کے کلام سے ملا کر ساتھ رکھ دیا جائے تو فرق مشکل ہوگا۔ مولوی حمید الدین نے سولہ برس کی عمر میں خاقانی کے قصیدے، جس کا قافیہ سکندر اور ردیف آئینہ ہے، پر کہ جس پر طبع آزمائی کرنا معمولی کام نہیں ہے، لیکن انھوں نے اس زمین میں قصیدہ کہا ہے۔ ان کی غزلیں حافظ اور نظیری کی غزلوں سے ٹکر لیتی ہیں....."

۴۔ مولوی محمد اختر صاحب کا ایک مضمون "غیر اقوام کے مقابلے میں عورت کا مرتبہ اسلام کی نظر میں" اسلام نمبر میں نکلا۔ اس پر ظفر علی خاں کی تنقید حسب ذیل انداز میں شائع ہوئی:

"کسی نے مجنوں سے پوچھا۔ خلافت کس کا حق ہے؟ عمرؓ کا یا علیؓ کا؟ اس نے کہا کہ عمرؓ کا نہ علیؓ کا، بلکہ لیلیٰ کا۔ یہی حال ہمارے دوست مولوی محمد اختر صاحب کا ہے جو عورتوں کو دُنیا جہاں کے سوشل اور پولیٹیکل حقوق دِلوانے کی دُھن میں نہ "الرجال قوامون علی النساء" کی پولیٹیکل مصلحت کو دیکھتے ہیں نہ "یغضضن ابصارھن" کے اس سوشل مفہوم پر نظر ڈالتے ہیں کہ جس کے نہ سمجھنے سے بدقسمت یورپ سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہا ہے۔

مولوی صاحب کے عالمانہ مضمون کا اکثر حصّہ نہایت قابلِ قدر اور فکر انگیز ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے تقسیم عمل کے حکیمانہ اصُول کو نظر انداز کر کے تدبیرِ منزل اور تدبیرِ مملکت، دونوں کو مخلوط کر دیا ہے اور زندگی کے ان کارناموں میں، جو مَردوں ہی سے مخصوص ہیں، عورتوں کی مشارکت اور مداخلت کو بلا شرط جائز قرار دے کر ان مفاسد کی حمایت کی جن کی طرف مولانا اکبر حسین نے ذیل کے ظریفانہ اشعار میں اشارہ کیا ہے: ؎

ہمارے مُلک میں ہوتا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

جس کو بیٹا وہ سمجھتے تھے بھتیجا نِکلا
پردہ اُٹھ جانے کا آخر یہ نتیجہ نِکلا

پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں، بلاشک عقل سے فارغ ہیں وہ

نوجواں تو تھے ہی کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک
لیکن اے اکبرؔ یقیناً پیرِ نابالغ ہیں وہ

۵۔ خان بہادر اکبر حسین اور ان کے معترضین:

راہِ اُلفت میں اگر قیس سے لغزش ہو جائے
حیف لیلیٰ پہ ہے جو آمادۂ کاوش ہو جائے

مارچ ۱۹۰۶ء کے "دکن ریویو" کے صفحہ ۵۱ پر، مولانا (اکبر حسین) کی نظم "معمّہ لاینحل" کے نام سے چھپی تھی۔ اس پر ایک دو اخباروں اور رسالوں میں بعض حضرات نے اِس محبت اور عقیدت کی اقتضا سے جو انھیں سرسیّد مرحوم کی یاد سے تھی، یہ سمجھ کر کہ اِس نظم میں سرسیّد پر حملہ کیا گیا ہے، بڑے شدّ و مد سے اعتراضات کیے ہمیں یہ اعتراضات دیکھ کر بے ساختہ کلیلہ و دمنہ والے بندر کی حکایت یاد آگئی جسے راجہ کشمیر نے ہاتھ میں تلوار دے کر اپنی پاسبانی کے لیے مقرر کیا تھا جو راجہ کو سوتے ہوئے مکھیوں کی گزند سے بچانے کے لیے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر چکا ہوتا۔ اگر تائیدِ غیبی اس کے اس احمقانہ اظہارِ محبّت کے آڑے نہ آگئی ہوتی۔ ان اعتراضات سے مقصود تھی سیّد علیہ الرحمۃ کی حمایت ہو گئی اُلٹی اہانت۔ کیونکہ اگر وہ مقدس اور برگزیدہ ذات

آج بقیدِ حیات موجود ہوتی تو یقیناً اس میں اپنی توہین سمجھتی کہ اس کے لگے بندھے ایک واجب الاحترام بزرگ کو جسے اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے اس کی ہم چشمی اور ہم مشربی کی عزت حاصل تھی، ایسے ناپسندیدہ طریقے پر ہدفِ سہامِ ملامت بنائیں۔

ہمارا ارادہ نہ تھا کہ اِس غیر خوش آئند بحث میں پڑ کر اور نکتہ چینوں کے غیر دل نشین اعتراضات کی تردید میں اپنے معزز ناظرین کی تضیع اوقات کے مجرم بنیں۔ مولانا اکبر حسین کا کلام جو اُردو شاعری میں ایک نئے دَور کی ابتدا ہے، اپنی انوکھی طرزِ ادا اور نرالی شان کے لحاظ سے اس سے بہت اُونچا کہ آج کا عامیانہ اور سطحی مذاق اس کی لم کو پہنچ سکے۔ شاعرانہ شوخی جو خدا تک سے نہیں چُوکتی اور جس کا جواز ہر مُلک اور ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے، دنیا جہان کے شاعروں کے لیے رَوا ہے۔ لیکن اگر بے چارے اکبر حسین اس سے مستفید ہونا چاہیں تو نو مشق مضمون نگاروں کی ہرزہ سرائی کا نشانہ بنیں۔ شیخ و محتسب و قاضی و فقیہہ کو آپ کے ملک الشعرا بے تقط سُنائیں تو وہ جائز بلکہ ان پھبتیوں کی داد دی جائے۔ لیکن اکبر بر سبیل تفنّن طبع سیّد کا نام لے دے تو یہ وہ لفظ ہے جو شعرا کے لیے شیخ کا درجہ حاصل کر چکا ہے تو آپ آگ بگولہ ہو جائیں۔ اس بدمذاقی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

اس نظم میں متانت کی زیادہ سختی اور نصیحت کی زیادہ تلخی ہے اور یہی ناپسندیدگی کی بنیاد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد کی جہاں بیں آنکھ نے جب مُسلمانوں کی حالتِ زار کا مشاہدہ کیا تو معاش کو سرے سے مفقود اور معاد کو بوسیدہ و متزلزل حالت میں پایا۔ اِسلام میں یہ دونوں عنصر برابر کے شریک ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ "وجدک ضالاً فہدا و وجدک عائلاً فاغنی" کو ترجیح حاصل ہے۔ جسے کھانے کو پیٹ بھر روٹی نہ ملے اس کی نماز ہی کیا۔ اِس لیے انھوں نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مُسلمانوں کو پہلے دُنیا کی فکر کرنی چاہیے۔ عاقبت اس کے ساتھ سُدھر جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام عمر اپنی قوم کی اصلاحِ معاش میں صَرف کر دی۔ ان کی کوششوں کا جو نتیجہ ہُوا اُسے ہم ہندوستان کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کے روز افزوں علم و تربیت کی شکل میں مجسّم دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی قوم کی معاد کی طرف سے غافل تھے۔

ہم یہاں بخوفِ طوالت ان بیش بہا خدمات کا ذکر نہ کریں گے جو مادہ پرست یورپ کے متشککانہ عقائد کے سیلاب کی روک تھام کے لیے انھوں نے ایک نئے علم

کلام کی بنیاد ڈالنے سے انجام دیں اور جس کا خفیف سا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ اور علّامہ فرید وجدی کے سے مشاہیر نے جو باتیں کیں وہ سیّد کے قلم سے تیس برس پیشتر نکل چکی تھیں۔ ہم یہاں صرف اس قدر کہیں گے کہ جو تصویر انھوں نے علی گڑھ کے پردہ پر کھینچی تھی وہ یک رُخ نہ تھی بلکہ دُنیاوی رُخ کے ساتھ دینی پہلو بھی رکھتی تھی۔ یہ سچ ہے اس تصویر کے دینی رُخ میں تصویر کا رنگ اتنا شوخ نہ تھا جتنا تدبیر کا، لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس میں بحث کو دخل ہے۔ ایک فرقہ اگر ع

خدا خود میرِ ساماں است اربابِ توکّل را

تو دوسرا ع   بر توکّل زانوئے اشتر بہ بند

سے اپنے دعویٰ کو مستحکم بنا سکتا ہے۔ علی گڑھ سے جو نوجوان تعلیم پاکر نکلے ان میں بلحاظ عقائد مذہبی اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ شُکر ہے کہ اچھے زیادہ تھے اور بُرے کم تھے۔ ان میں وہ وصف جس کے بغیر کوئی قوم زندہ اور کوئی مذہب برقرار نہیں رہ سکتا اور جس کے لحاظ سے علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یعنی مذہبی غیرت اور قومی عصبیت، جسے دوسرے لفظوں میں دردِ دل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سرسیّد کی تعلیم کا اثر جس شخص پر پڑا ہے، وہ بے نماز ہو تو ہو لیکن ایسا نہ ہوگا کہ جگر پر درد کی چوٹ نہ رکھتا ہو، وہ اسلام کے نام پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوگا، وہ رسولؐ کی راہ میں سر کٹانے کے لیے آمادہ ہوگا۔ اور وہ اسلامی برادری میں شریک ہونا اپنے لیے موجبِ عزّت و افتخار سمجھتا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ کالج نے چند بُرے نمونے بھی پیدا کیے جنھیں مقتضاء طبیعت نے بدنام کنندہ نیک نامے چند کے طبقہ میں داخل کر دیا۔ اور چوں کہ کالج کی تحریک ایک بالکل نئی تحریک تھی جس سے پرانی وضع کے بزرگ پہلے ہی بدکے ہوئے تھے لہٰذا ان نمونوں کو دیکھ کر ان کا سُوئے ظن اور بھڑک گیا۔ حالاں کہ اگر تاریخِ اسلام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ علی گڑھ کالج پر کچھ منحصر نہیں۔ جب سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، احتساب سختی سے ہوتا تھا۔ اور مذہبی آزادی بھی اتنی نہ تھی مگر پھر بھی بڑے بڑے ملاحدہ اور متشکّکین پیدا ہو چکے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر علی گڑھ کالج کے کسی جاہل طالب علم نے نماز کو وحشیانہ حرکت کہہ دیا تو اس میں کون سا تعجب ہے۔ بہر حال اس قسم کے چند واقعات تھے جن سے مولانا اکبر حسین کا دریائے غیرت جوش میں آیا اور آپ نے وہ نظم لکھی جس کا عنوان "مسمائے لاینحل" تھا۔ بزمانۂ سفرِ الٰہ آباد ہمیں مولانا کی صحبت سے فیض یاب

ہونے کا شرف حاصل ہوا تو گھنٹوں اس مضمون پر گفتگو رہی۔ اور ہم نے بہ ادب تمام اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ عام طور سے مذہب سے بے پرواہی کی شکایت جو مدرسۃ العلوم کے طلبہ کی نسبت سُنی جاتی ہے اس میں بہت کچھ مبالغہ کی رنگ آمیزی ہے۔ مولانا کا خیال ہے اور اس سے ہر سمجھ دار مُسلمان یقیناً متفق ہوگا کہ ناممکن ہے کہ مذہبی علم وعمل کو قطعتاً بالائے طاق رکھ کر مُسلمان قوم بن سکے یعنی اُن میں سوشل اتحاد اور یکسانی پیدا ہو جس سے زندگانی شیریں ہوتی ہے، اعتماد بڑھتا ہے اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ چوں کہ مُسلمان مذہب کا نام ہے، کسی قوم کا نہیں کیوں کہ مذہبی علم وعمل کے پیرائے سے نئی روشنی والے عاری خیال کیے گئے ہیں لہٰذا مولانا کو اس جماعت کی طرف سے مایوسی ہوگئی ہے۔ اور چوں کہ وہ پہلو میں درد بھرا دِل اور دماغ میں موزونی افکار کا سرمایہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً پند و نصیحت کے ذریعہ سے انھوں نے نئی روشنی والوں کو ان کی فروگذاشتوں پر متنبہ کرنا شروع کیا جس میں تلخی کی شکایت کی جاتی ہے لیکن یہ کونین کی تلخی ہے۔

مولانا نے جو خط ہمیں لکھا اس کے حرف حرف سے درد اور لفظ لفظ سے بلاغت ٹپک رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ جنھیں نصیحت کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی اُخروی فلاح کی انھیں کس درجہ تمنّا ہے۔ پس بجائے اس کے کہ وہ موردِ الزام قرار دیے جائیں، ہم پر ان کا شکر واجب ہے۔ مولانا کو نئی روشنی والوں کی طرف سے جو مایوسی ہوئی تھی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا تھا۔ وہ شکر ہے مبدّل بہ اُمید ہوگئی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت آپ کی وہ نظم ہے جو قومی ترانہ کے عنوان سے آپ نے لکھی تھی۔ اکبرؔ نے لکھا تھا کہ نئی روشنی نام ہے جلالِ باری تعالیٰ سے مُنکر یا بے خوف ہونے کا، جمالِ باری تعالیٰ سے غافل ہونے کا، رُوحانی ہستی سے مُنکر یا بے خبر ہونے کا۔ یاد رکھیے کہ ترقیاں اللہ کی مہربانی اور فضل و کرم سے ہوتی ہیں۔ عقل و حکمت وہی اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ بازارِ دُنیا کی چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ چاہے ٹاٹ پر بیٹھ کر کھاؤ۔ چاہے اُجلے بن کر بحث کرو اور انجمن نام رکھو۔ ضرورت کے مطابق زندگی کے مشاغلِ دُنیاوی چلے جاتے ہیں لیکن حمدِ باری تعالیٰ سازِ فطرت کا نغمہ ہے۔ یہی صوتِ سرمدی ہے۔ اللہ ہم سب کو اس کی چاشنی نصیب کرے۔ کون عاقل ہے جو ایسے خیال کو غیر ضروری خیال کرے یا اس کی میّت پر افسوس و فریاد نہ کرے۔ حالی کا نوحہ سُنیے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے　　　اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ　　خود آج مہماں سرائے فقرا ہے

اور اب تو وہ زمانہ آگیا کہ ضعف مذہب سے ہم میں خرابی پیدا ہونے کا یورپ نے بھی ذکر شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں میں اخلاقی تعلیم نہیں ہے ....."

مولانا ظفر خاں کی اہم نظمیں :

"مولانا ظفر علی خاں کی اسی پرچہ میں اہم نظمیں بھی شائع ہوئیں۔ مثلاً حمدِ ذوالجلال :

سپیدۂ دم کہ ہوا میں شریک راز انعام　　سنا سروش سے فلیعبدوا کا میں نے پیام

(یہ نظم بہارستان کے مجموعہ میں موجود ہے اور یہ اُن کی مسائلِ توحید پر انتہائی فلسفیانہ، نہایت بلیغ اور طویل نظم ہے جس سے ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور اس کے اظہارِ بیان پر پورے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بوعلی سینا پر ان کے عالمانہ زورِ قلم کے باعث ایک طویل مضمون مسلسل اس پرچہ میں نکلتا رہا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بوعلی سینا اور ارسطو کے فلسفہ پر پورا درک رکھتے تھے اور اپنی اس نظم میں اسی فلسفیانہ اظہارِ بیان کے نقطۂ نظر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔

۲۔ ان کی ایک اور نایاب نظم بمبئی پر ہے جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی میں پڑھی گئی، یہ اہم ترین نظم اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت پر ہے جس کے نوّے اشعار ہیں۔

۳۔ تیسری نظم ڈاکٹر عزیز احمد ایم اے، پی ایچ ڈی کے مسلمان ہونے کے بعد انگریزی لیکچر کے موقع پر آپ نے پڑھی یہ نظم نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :

کہنے کو ہوں میں آج نعتِ رسولِ کریمؐ　　میری زباں کیوں نہ ہو رشکِ زبانِ کلیم

یہ نظم "بہارستان" میں شامل ہے۔

۴۔ اسی طرح سے محسن الملک کے انتقال پر بھی ایک عمدہ مرثیہ لکھا تھا۔

۵۔ رودِ موسیٰ پر بھی ان کی ایک نظم جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم بھی ان کی شگفتہ طبیعت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں شاعر نے خود کہا ہے اور اس گفتگو میں کوئی کلام نہیں۔

طبعِ شگفتہ میری صرف سخن وری ہے　　منظور مجھ کو مشقِ اعجازِ سامری ہے

میرا خیالِ موزوں، میرا کلامِ رنگیں　　ہم رنگِ عسجدی ہے ہم رنگِ انوری ہے

۶۔ اس مجلہ میں داغ پر بھی ایک اچھی نظم بشکل مرثیہ ہے ۱ جو "بہارستان" میں صفحہ ۵۶۱ پر موجود ہے)۔

نقشِ سرابِ ہستی ناپائیدار ہے　　شکلِ حبابِ زندگی مستعار ہے
غالب سے نکتہ سنج جیسے دادِ شعر دیں　　اس کے معترفوں میں مرا کیا شمار ہے

(اسی ضمن میں مولانا ظفر علی خاں نے یہ لکھا تھا کہ داغ کا غالب کو یہ شعر بہت پسند تھا:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی ایک نظم کو دیکھ کر یہ تبصرہ کیا تھا۔ "اس نظم کو دیکھ کر متحیر ہو گیا جو کچھ آپ نے لکھا ہے محض زورِ طبع اور شاعری کی خدا داد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی پیدا ہو جائیں تو کچھ اُمید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل پڑے مجھے تو مسلمانوں کے دُکھڑے نے مہلت نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر طبع آزمائی کروں مولوی اسمٰعیل پا بہ رکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ فکرِ معاش دم لینے دے اور یہ چٹک دل میں باقی رہے۔" خاکسار الطاف حسین ۲۳ مئی ۱۹۰۵ء پانی پت۔

۷۔ اس رسالے کے مضمون نگار:

اس رسالے میں لکھنے والے حضرات کے نام، جو نظر کے سامنے آتے ہیں، ان میں مولانا سید کرامت حسین بیرسٹر، مولوی عزیز مرزا مرحوم، سید ہمایوں مرزا بیرسٹر، مولوی صدیق حسین عاشق پروفیسر نظام کالج، امام الدین احمد آرزو، مولوی معشوق حسین، مرزا سلطان احمد اشرف حسین، مولوی محمد اختر، ڈاکٹر عبد الحق، سید محفوظ علی، نور الضیا الدین چیف جسٹس درگا سہائے، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی اکبر حسین اکبر، ڈاکٹر اقبال، جیسے اہم ترین حضرات تھے۔ اس کے علاوہ مولانا شبلی، عبد الحلیم شرر، ضامن کنتوری، مولوی فضل حق آزاد، سرشار اور سرکشن پرشاد کے اہم ناموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ظفر علی خاں کو اسلام اور تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اور تحقیق مذاہب کے بارے میں بہت دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے ہندو نمبر اور اسلام نمبر (سلک اول اور سلک دوم) کے نام سے نکالے۔ سلک اول اپریل، مئی، جون، جولائی ۱۹۰۷ء کی اشاعت پر مشتمل تھا اور اس نمبر کے متعلق ہندوستان کے مشہور اخبارات اور برگزیدہ شخصیتوں نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان اخبارات میں مسلم پیٹریاٹ مدراس، آبزرور لاہور، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، وطن لاہور، مبشر دکن اور سربرآوردہ حضرات میں محسن الملک، مولانا عبد الحلیم شرر، مولوی فصیح الدین ڈپٹی کمشنر محبوب نگر، مولوی اصغر حسین جونپور، اور خان بہادر میر اکبر حسین جیسے اصحاب شامل ہیں۔ اس امر سے

اندازہ ہوسکتا ہے کہ دکن ریویو نے اپنی علمی اور ادبی اہمیت کو کس طرح قائم کر لیا تھا ۔

اس طرح یہ رسالہ " افسانہ " کے نام سے جولائی ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا ۔ پھر جنوری ۱۹۰۲ء میں "دکن ریویو" کے ساتھ ضم کر دیا گیا ۔ مارچ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے علم فلاحت و فن دباغتِ چرم کی تحصیل کے لیے رخصت کی درخواست پیش کر دی اور ایک سال کی چھٹی لے کر سید محفوظ علی صاحب کے پاس صومالی لینڈ چلے گئے ۔ ان کی چھٹی اغلباً جولائی ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۶ کو ختم ہوئی ۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک نمبر اس کا بمبئی سے بھی نکالا ۔ بہر حال واپس آکر نومبر ۱۹۰۶ء سے لے کر مارچ ۱۹۰۹ء تک یہ پرچہ نکلتا رہا[۳ھ] ۔ فروری کے مہینہ میں انھوں نے مضمون نگاروں کے لیے نقد معاوضہ کا بھی اعلان کیا تھا لیکن بعض حالات کے پیشِ نظر انھیں اس رسالے کی ادارت اور ملکیت سے دست بردار ہونا پڑا اور اپریل ۱۹۰۹ء سے اس کی ادارت اور ملکیت مولانا مودود احمد قادری کے سپرد کر دینی پڑی اور اعلان کیا کہ وہ دکن ریویو کی قدیم پالیسی کو قائم رکھیں گے[۴ھ] ۔

اکتوبر ۱۹۰۹ء کو خود انھیں ہمیشہ کے لیے حیدر آباد کو خیرباد کہنا پڑا[۵ھ] ۔ اس طرح ان کا یہ صحافتی دور ۱۹۰۲ء سے شروع ہو کر مارچ ۱۹۰۹ء میں ختم ہو جاتا ہے ۔

حواشی :

۱ھ ... شمارہ اوّل، جلد اوّل، مملوکہ تحسین سروری

۲ھ .. افسانہ، حیدر آباد دکن، جلد اوّل، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۰۲ء

۳ھ .. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: کاروانِ صحافت، انجمن ترقی اردو، کراچی ۔ ص ۱۲۴

۴ھ .. ایضاً، ص ۱۲۱

۵ھ .. ظفر علی خاں: اداریہ، زمیندار (ہفتہ وار) کرم آباد، یکم جنوری ۱۹۱۰ء

پنجاب ریویو

"پنجاب ریویو" ایک اعلیٰ درجے کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ تھا جو مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۱۰ء میں جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ مقامِ اشاعت کرم آباد تھا اور یہ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے چھپتا تھا۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر اس کے دو شمارے ہیں جو غالب لائبریری کراچی میں محفوظ ہیں، اس وقت انھیں کے تعارف پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک شمارہ اکتوبر ۱۹۱۰ء کا ہے جو پہلی جلد کا تیسرا شمارہ ہے۔ اس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے :

(۱) ایڈیٹوریل از ایڈیٹر۔ اس میں مندرجہ ذیل امور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے :
ا۔ ایران و انگلستان کے باہمی تعلقات کا انقطاع۔ ب۔ لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی الوداعی تقریر۔ ج۔ انڈیا آفس کی صدارت سے لارڈ مارلے کا استعفیٰ۔ د۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں سید علی امام کا تقرر۔

(۲) المرابطین (۲) از ایڈیٹر۔ (اسپین کے مسلمان فرماں رواؤں کے عروج و زوال کی داستان جو دوسری قسط میں مکمل ہوئی)

(۳) غزل۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔

(۴) گلبرگہ شریف (تاریخی مضمون) مولوی معشوق حسین

(۵) نعت۔ مولوی محمد جعفر خیرآبادی

(۶) ہز ایکسی لینسی لارڈ منٹو کی الوداعی تقریر۔ ترجمہ از ایڈیٹر

(۷) تاج سخن پر منظوم ریویو۔ مولانا حسن مرتضیٰ شفق عمادپوری۔ (اس کے شروع میں ایڈیٹر کا ایک صفحے کا نوٹ ہے)۔

(۹) میاں۔ سید محفوظ علی (لفظ "میاں" کی تحقیق)۔

(۱۰) غزل۔ سید تفضل حسین فطرت

(۱۱) کوا (نظم) مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

دُوسرا شمارہ مئی جُون ۱۹۱۱ء کا ہے۔ (جلد اوّل: شمارہ ۱۰-۱۱) اِس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے :

(۱) ایڈیٹوریل۔ ایڈیٹر۔ اس میں مندرجہ ذیل اُمور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے : ا۔ مولوی چراغ علی اور اُن کی تصنیف "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" ب۔ ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی کی وفات۔ ج جسٹس شاہ دین ہمایوں کی سخن سرائی۔ د۔ پنجاب یُونی وَرسٹی کی طرف سے عِلمی خدمات پر انعامات۔

(۲) نواب اعظم یار جنگ مرحُوم۔ مولوی عبدالحق (یہ وہ مضمون ہے جو "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" میں بطور مقدّمہ شامل ہے)۔

(۳) نعت۔ کامل فتح پوری اکبر آبادی

(۴) رفعِ انجیل۔ مولوی عباداللہ اختر۔ ("پنجاب ریویو" بابت مارچ و اپریل ۱۹۱۱ء میں ماسٹر ہلاسی رام کے شائع شدہ ایک مضمون کا جواب)۔

(۵) ترانۂ تہنیت جشنِ تاج پوشی حضور مَلک معظّم۔ مولوی سیّد فضل حق آزاد۔

(۶) امام بخاری رح (مقالہ) مولوی سیّد ابوالحسن (بھوپال)

(۷) نعت۔ مولوی عبداللطیف بیکتؔ

(۸) غزل۔ علّامہ شبلی نعمانی

(۹) نویدِ مسیحا۔ (مقالہ) مولوی حمیدالدّین۔ (ایڈیٹر کے نوٹ کے مطابق یہ مضمون "دکن ریویو" کی ۱۹۰۷ء کی جلد سے منقول ہے اور اس کا حوالہ مضمون نگار نے "رفعِ انجیل" کی بحث کے سِلسلے میں اپنے ایک اور مضمون میں دیا تھا جو "پنجاب ریویو" بابت نومبر و دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہُوا تھا)۔

(۱۰) نغمۂ نَے (نظم) سفیر (لکھنؤ)

(۱۱) سلاطینِ مغلیہ کے سِکّوں کے ابیات (مقالہ) ایڈیٹر

(۱۲) غزلیات۔ شاہ دین ہمایوں و مولوی تفضّل حسین فطرتؔ۔

(۱۳) انگریزی زندگی کی ایک دِل رُبا جھلک۔ ایڈیٹر (انگریزی سے ترجمہ۔ "باقی دارد")

(۱۴) یُونی وَرسٹی کی تحریک (نظم)۔ حکیم الطاف احمد آزادؔ سہارن پوری

(۱۵) غزل۔ "مسٹر غلام رسول مہرؔ، طالب علم اسلامیہ کالج، لاہور"

اُردُو اخبارات کی اشاعت کا پس منظر

لارڈ بینٹنک نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا کہ برٹش حکومت کا عین مقصد ہندوستان میں مغربی لٹریچر کا فروغ دینا ہے۔ اس لیے تمام فنڈ جو تعلیم کے مقصد کے لیے مخصوص کیے جائیں، ان کا مقصد صرف انگریزی تعلیم کی اشاعت ہو اور یہ تمام فنڈ جمع ہو کر صرف انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لیے ہی مخصوص ہوں اور ایک ایسی تعلیمی کمیٹی کی زیرِ نگرانی ہوں جس کا مقصد بھی انگریزی تعلیم کی اشاعت ہو اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی زبان ہی میں ہو۔

اس سرکلر کے رو سے وزیکلر زبانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ لارڈ بینٹنک کا یہ فیصلہ میکالے کے نتائج پر منحصر تھا۔ اس کی رائے تقریباً تیس سال تک چھپی رہی۔ اور پھر ۱۸۶۳ء میں عوام کی نظر کے سامنے آئی۔ اس میں میکالے نے ہندوستانیوں کو غیر مہذب افریقی حبشیوں کی طرح بتایا تھا یا امریکہ کے ریڈ انڈین کی طرح۔ میکالے کا مقصد انگریزی نما انسان بنانا تھا۔ اس لیے اس نے انگریزی زبان کی برتری اور بلندی کی حفاظت کے لیے انگریزی نما انسان بنانے لازمی جانے۔ اس نے یہ خیال کیا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینا خود دولتِ برطانیہ کے لیے بھی اہم اور مفید ثابت ہوگا۔ اس لیے اس نے دارالعوام میں ۱۰ جولائی ۱۸۳۲ء کو ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

It is scarcely possible to calculate the benefits which we might derive from the diffusion of European Civilisation among the vast population of the East. I would be ..... far better for us that the people of India were well governed and independent of us thean ill governed and subject to us - that they were ruled by their own kings, but wearing our broad cloth and eating with our cutlery, than that they were

performing their salam to English Collectors and Magistrates, but were too ignorant to value, or too poor to buy, English manufacturers. (East & West, Calcultta, 1902.

اس لیے انگریزوں نے انگریزی سے بہ نسبت ہندوستانیوں کے زیادہ فائدے اُٹھائے۔ انگریزی تعلیم نے گویا سامان کے لیے ایک مارکیٹ پیدا کردی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے انگریزی مال کو زیادہ پسند کرنا شروع کیا۔ اگر میکالے دوبارہ ہندوستان آتا تو اس کو معلوم ہوجاتا کہ اس کی اُمید کی بہ نسبت انگریزی مال نے بہت زیادہ کھپت پیدا کرلی تھی۔ اسی طرح انگریزی مصنفین کو بھی بے انتہا فائدے ہوئے۔ اسی لیے جون برائٹ JOHN BRIGHT نے یہ بات کہی تھی کہ شیکسپیئر کی کتابیں اس سے زیادہ ہندوستان میں بکتی ہیں جتنی انگلستان میں۔ اسی طرح انگریز پبلشرز اپنی جیبیں گرم کرتے چلے جاتے ہیں اور مال دار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی فرموں نے بھی زیادہ کفایت شعاری سیکھ لی تھی۔ مثلاً پہلے جتنے کلرک آتے تھے وہ سب انگریز تھے جن کی تنخواہیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اب یہاں ہندوستانی کلرک ملنے لگ گئے تھے جن کی تنخواہیں اسّی یا نوّے روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ اِسی طرح مشکاف کے زمانے میں سب انگریزوں کو نہایت محنت سے ورنیکلر سیکھنی پڑتی تھی اور اب یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ ان کو ورنیکلر سیکھنے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی اس لیے کہ اب سب کام انڈین کلرک کے ذریعے تراجم کے سبب سرانجام پاجاتے ہیں۔ انگریز حاکم اپنے فیصلے اپنی انگریزی زبان میں لکھتے اور انگریزوں نے کبھی اس اَمر کی زحمت تک گوارا نہیں کی کہ وہ غیر زبان سیکھ لیں اور اس زبان کے مصنف بن جائیں۔

سر چارلس کی کتاب "گریٹ بریٹین" سے اس بات کی تصدیق ہوسکتی ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قانونی لحاظ سے کس قدر نقصانات عدالت کے مسائلی معاملات کو پہنچے، اس لیے کہ ان کو جو کچھ بھی مدد ملتی وہ کلرکوں کے ذریعے سے ملتی تھی۔ اور یہ ضروری نہیں تھا کہ کلرک کوئی صائب رائے دے سکتے ہوں۔ چناں چہ ۱۸۵۸ء کے جنگِ آزادی میں انگریزوں نے سینکڑوں آدمیوں کو اس لیے پھانسی پر لٹکا دیا کہ وہ مقامی آدمیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ ان کی گواہی اور ان کی وکالت کو سمجھ سکتے تھے۔ چناں چہ ایک افسر نے کہا کہ مَیں نے سینکڑوں کو اس جرم میں پھانسی پر چڑھا دیا کہ وہ اپنے گاؤں میں موجود نہیں تھے۔ مَیں ان کی بات کو نہیں سمجھ سکا۔ حالاں کہ ان کے کہنے کا یہ مقصد تھا کہ ہم تو اپنے گاؤں سے مہینوں کہیں باہر نہیں نکلے۔ اس طرح انگریزی کی بدولت سینکڑوں

اور ہزاروں انگریزوں کو ملازمتیں مل گئیں۔ اگر انگریزی تعلیم ان کا ذریعۂ تعلیم نہ ہوتی تو یہ سب کی سب ملازمتیں ہندوستانیوں کو ملتیں۔ اسکول کی تمام کتابیں، نقشے، چارٹ، گلوب باہر سے منگائے جاتے تھے۔ اس لیے انگریزی تعلیم نے بالواسطہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خیال سے ہندوستانیوں کو ابھارا تاکہ وہ یورپ جاکر علم حاصل کریں اور ہندوستان میں تعلیم یافتہ انگریز ڈائرکٹر، انسپکٹر اور کالجوں کے پروفیسر بن گئے۔

اس کے مقابلے میں ہندوستانیوں کو انگریزی زبان سے کبھی اس قدر فائدہ نہیں پہنچا جس کی توقع تھی۔ انگریزی زبان کی گرامر، اس کا لہجہ اور اس کی تنفیذی صلاحیت کو سمجھنے کے لیے ہندوستانیوں کو سالہا سال صَرف کرنے پڑتے تھے اور جوانی کے عمدہ سال ضائع کرنے پڑتے تھے۔ لہٰذا اس اَمر میں کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے لٹریری کاموں سے اپنی توجہ کو ختم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں میں کوئی اعلےٰ درجے کا تصنیفی کام انگریزی زبان میں دو چار کاموں کو چھوڑ کر نہیں ہوا۔

پی این بوس نے "ہندو تہذیب برٹش راج میں" میں بہت اچھی بات کہی ہے کہ جب تک برٹش راج ہے، اس وقت تک کسی اعلیٰ تصنیفی کام کی توقع کرنی فضول ہے۔ اور جب تک ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے، کسی اعلیٰ معیار کی عمدہ کتاب کا ملنا دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے۔ اس لیے کہ کسی غیر زبان والے کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے خیالات کو اس طرح عمدہ طور پر پیش کرے جس میں ذہانت اور قابلیت واقعی طور پر پائی جائے۔ اگر چند لوگ اِدھر اُدھر پائے جا سکتے ہیں تو وہ الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ فیڈرک اعظم جرمنی نے جس کے اردگرد فرانسیسی دَرباری اور نوکر تھے، اس اَمر کی کوشش کی کہ وہ فرانسیسی زبان پر قدرت حاصل کر لے لیکن وہ بالکل ناکام رہا جس طرح اس نے فرنچ مضامین کی کاپی والٹیر کو تصحیح کے لیے بھیجی تو والٹیر نے کہا کہ اس نے اپنی گندی ململ دھونے کے لیے بھیجی ہے۔ حالاں کہ جرمن فرانس سے اس قدر دُور نہیں جس قدر ہندوستان انگریزوں سے دُور ہے اور جرمن زبان بہت کچھ انگریزی زبان سے مشابہت رکھتی ہے بہ نسبت اس کے، جو مشابہت ہندوستانی کو انگریزی زبان سے ہے۔ اگر جرمن شہنشاہ ان تمام آسانیوں کے باوجود جو اُسے حاصل تھیں، فرانسیسی زبان پر قادر نہیں ہو سکا تو ہندوستانی کس طرح ایسی انگریزی لکھ سکتے ہیں یا ذریعۂ تعلیم بننے سے وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے۔ لہٰذا ہمیں ایسے افراد پیدا کرنے ہیں تو ہمیں ان کو مادری زبان سکھانی لازمی ہے"۔

سر سیّد نے میکالے کی غلط منطقیانہ باتوں کی اپنے ایک مضمون میں سختی سے تردید کی۔ اس نے لکھا ہے کہ جب مقامی زبانوں میں سنسکرت زبان نہایت قدرت رکھتی ہے جیسا کہ میکالے کو اس پر قدرت حاصل ہے جس کا وہ خود بھی اعتراف کرتا ہے پس کس لیے ۲۵۰ ملین لوگوں کو انگریزی زبان پڑھائی جائے۔ ہرگز نہیں۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ ادھر سنسکرت کی بھی وہ تائید کرتا ہے۔ حالانکہ سنسکرت بھی ایک مردہ زبان ہے اور مردہ زبان میں تعلیم کسی طرح نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ورناکیولر زبانوں سے بہتر کوئی زبان نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ہم واقعی طور پر ان کے دماغوں کو روشن کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندوستانی (اردو) بنگالی، ہندی وغیرہ۔ کسی غلط فہمی اور مبہم خیالات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا کہ انگریزی زبان کی طرح ورناکیولر زبانوں میں وہ وسعت نظر یا بہترین ذخیرۂ الفاظ موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کو سائنس یا فلاسفی کے لیے ذریعۂ اظہارِ خیال بنایا جائے تو یہ بات ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے سر جارج کیمبل نے MEMORIES OF MY INDIAN CAREER میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے میکالے سے واقعی کد ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ دس ہزار پاؤنڈ سالانہ اپنی قسمت کے بنانے کے لیے کماتا ہے اور وہ مسلسل اور برابر پڑھتا ہے لیکن ہم اس کے اورینٹیل لٹریچر کے متعلق خیالات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے سبب ایک دوسرا سر ولیم جانز ہو جائے۔ لیکن اس کی قابلیت تب ہی مانی جاتی جب وہ اپنی انگریزی دانی اور انگریزی مطالعے کی بنا پر انگریزی ادب کا پرستین ادب اور مشرقی ادب سے موازنہ کرتا۔ اگر وہ انڈیا کا اس ذریعہ سے صحیح مطالعہ کرتا تو وہ وارن ہیسٹنگز کے متعلق اس قدر فاحش غلطی نہ کرتا۔ جو اس نے اپنے مضامین میں ہندوستانی مسائل کے متعلق کی ہیں۔"

لیکن میکالے نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ وہ ہندوستانیوں کو انھی کی زبان کے ذریعے تعلیم دے۔ بلاشبہ اس کے زمانے میں ورناکیولر زبانیں اس قدر علمی شہ پاروں کی حامل نہیں تھیں۔ اگر وہ انگریزی زبان کو صرف اس طرح لازم کرتا جس طرح انگریزوں کے لیے فرانسیسی یا جرمنی زبان کا مطالعہ اور ذریعۂ تعلیم اردو ہوتا تو اس بات کی توقع قوی تھی کہ کچھ عرصہ کے بعد ورناکیولر زبانیں بھی تاریخی، فلسفیانہ، سائنسی اور علمی مضامین سے مالا مال ہو جاتیں۔ یہ ترقی کی رفتار اگرچہ مدھم ہوتی لیکن یہ رفتار یقینی اور اہم ہوتی۔ ہم اس سلسلے میں جاپان کی مثال بیان کر سکتے ہیں کہ انھوں نے پچاس سال سے کم عرصے میں کس

قدر اہم ترقی کر لی تھی اور اس اپنی زبان میں اہم ترین لٹریچر پیدا کر کے دُنیا کو دکھا دیا کہ جو تمام علومِ ادب پر حاوی ہے۔ جاپان نے یہ ترقی صرف اسی لیے کی تھی کہ انھوں نے ذریعۂ تعلیم جاپانی زباں کو قرار دیا تھا۔ جاپانی مصنفین نے کبھی اس اَمر کی کوشش نہیں کی کہ وہ انگریزی ادب میں اس کے ستارے بن کر چمکے۔

ولیم جونز نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "مَیں تو ہندوستانی پودوں کو ہندوستانی نام دینے کے لیے از حد خواہش مند ہُوں اس لیے کہ مَیں واقف ہُوں کہ ہندوستان نباتات کی دُنیا کے لیے ایک وسیع و عریض خِطّہ ہے اور ان پودوں کو ورناکیولر نام سے پکارنا کوئی مُشکل کام نہیں ہے۔ یہ کام اگر واقعی ہو گیا ہوتا تو ہم صحیح معنوں میں نیشنل نیچرل سائنس کے متعلق بہت کچھ بتا سکیں گے۔ جس طرح گریک اور لیٹن سے سائنس کی اصطلاحیں لے کر انگریزی کو کار آمد بنایا جا سکتا ہے پھر کس لیے انگریزی اصطلاحوں کو ورناکیولر زبان میں لے کر کار آمد نہیں بنایا جا سکتا۔" ڈاکٹر پرنسپل بنارس کالج نے اس اَمر کا اعتراف کیا کہ جب جرمنی نے اپنی زبان میں ان اصطلاحوں کو منتقل کر لیا۔ جو انگریزی اصطلاحیں تھیں یا دُوسری زبان میں تھیں اس لیے کہ کسی جرمن دیہاتی کے لیے اپنی زبان میں مطالعہ کرنا اتنا ہی از حد مفید ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔ اس لیے ہمیں لاکھوں آدمیوں کو انگریزی تعلیم دے کر ان کی تعلیم برباد نہیں کرنی چاہیے۔ دس سالہ تجربۂ تعلیم سے یہ بات واضح ہے کہ جتنا مَیں مقامی زبانوں میں سائنس کی تعلیم دے کر طلباء کو مطمئن کر سکا ہُوں۔ اس طرح جب مَیں نے ان مقامی زبانوں میں اصطلاحوں سے سائنس کی تشریح کی تو پنڈت صاحبان نے مقامی زبانوں کی اِصطلاحیں سمجھنے کی وجہ سے اپنی پُوری توجہ میری طرف منعطف کر لی اور ان کے بُشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تو ان اصطلاحوں سے پُوری طرح واقف ہیں اور ان کی توجہ میرے لیکچر کی طرف زیادہ ہو گئی۔"

یہ سب وہ انگریزی تعلیم کے ردِّ عمل ہیں جو انگریزی زبان اور اس کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے انگریزوں نے کیے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کے باشندے ذہنی طور پر پست ہو گئے۔ اور انگریزی برتری کا لوہا ان پر بیٹھ گیا۔ اور وہ تعلیم میں ناقص رہنے کی وجہ سے سیاسی اور معاشی لحاظ سے بھی پست ہو گئے۔ انگریزی تعلیم کا یہی ردِّ عمل اُردو کے بہی خواہوں کے دِلوں پر پڑا۔ اس ردِّ عمل کے باوجود وہ سب نتائج ظاہر ہوئے جو انگریزی زبان اور اس کی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان میں پھیلے اور اس کے نتیجے میں یہاں کے باشندے ذہنی طور سے بھی پست ہو گئے۔ اور انگریزی برتری کا لوہا ان کے دِلوں پر بیٹھ گیا اور انھی نتائج کے سبب وہ علمی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے نمایاں ترقی نہ کر سکے اور ان کا مقصد صرف سرکاری

ملازمتیں حاصل کرنا رہ گیا اور مادری زبان میں تعلیم نہ دیے جانے کے سبب ان کی انفرادیت ہی ختم ہو کر رہ گئی۔

اُردو کے بہی خواہوں کے دِل پر اس کا شدید رَدِ عمل ہُوا اور محسن الملک اور ان کے رُفقا نے اپنی کوششوں سے اُردو کو ایک عِلمی زبان بنانے کا پورا تہیہ کر لیا۔ محسن الملکؒ نے اُردو کی حمایت کے لیے جس سنگین عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، اس عمارت کو تعمیر کرنے کے لیے اینٹ، پتھر اور گارا لانے والے وہی باہوش انسان تھے جنھوں نے محسن الملکؒ کی توسیعِ اُردو کے سِلسلے میں ان کوششوں کو نہ صرف سراہا بلکہ عملاً اس کی حمایت میں اپنی کوششوں کو تیز کر دیا۔ انھی باہوش انسانوں میں مولوی سراج الدین احمد صاحب بھی تھے۔ کہ جنھوں نے عوام کو سیاسی آگاہی اور زمین داروں کی بہبُود اور بہتری کے لیے اُردو زبان کو پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کے لیے ابلاغ کا ایک ایسا ذریعہ اختیار کیا کہ جس کے ذریعے وہ اپنے مقصد کو اور عوام کی بہبود کے کام کو زیادہ بہتر طور سے پُورا کر سکے۔ مولوی سراج الدین صاحب نے اِسی لیے زمیندار اخبار جاری کیا اور اس کے لیے اپنی بقیہ زندگی وقف کر دی، اور مرتے وقت اپنے خلفِ اکبر (مولانا) ظفر علی خاں کے سپرد یہ ذمہ داری کر گئے اور نامور بیٹے نے اپنے باپ کی وصیت کو پُورا کر دکھایا اور یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

حواشی

۱۔ رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" کلکتہ، ۱۹۰۳ء

ہفتہ وار "زمیندار"

مولوی سراج الدین احمد (مولانا ظفر علی خان کے والد) ۱۹۰۳ء میں محکمہ ڈاک کی تقریباً تیئس سال کی طویل ملازمت کے بعد جب اُس سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے ملکی اور ملّی مفاد کے زاویۂ نظر سے اخبار کے اجرا کو پسند کیا۔ تعلیمی و سیاسی اور مذہبی معاملات میں بڑی حد تک وہ سرسیّد احمد خاں کے پیرو تھے۔ کبھی کبھی تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران میں بھی وہ قومی معاملات میں دِلچسپی لیا کرتے تھے۔ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ خود زمین دار تھے اور زمین داروں کی پستی اور جہالت کے اسباب سے بے خبر نہ تھے۔ اس لیے غور و فکر کے بعد یہ ارادہ کیا کہ زمیندار کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے جس کے ذریعے سے پنجاب کی آبادی کے اس پسماندہ طبقے میں ایسی ذہنی بیداری پیدا کی جائے کہ ان میں اپنی زندگی کا معیار بلند کرنے کا وہ احساس پیدا ہو جائے جو شہر کے تعلیم یافتہ باشندوں میں پایا جاتا ہے اس مہتم بالشان مقصد کی تکمیل کے پیش نظر انھوں نے لاہور سے ہفتہ وار زمیندار جاری کیا جس کی پیشانی ان کے اس شعر سے مزین نظر آتی تھی۔

نام کو تو ہوں زمیندار اور اگر سوچو ذرا
قوم کا حاجت روا ہوں قوم کا مشکل کشا

اس طرح زمیندار کے مقاصد کی اہمیت اور اس کے بانی کے مجاہدانہ عزائم نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ زمیندار کا پہلا پرچہ موچی دروازہ چوک نواب صاحب کے متصل ایک گلی سے نکلا اور اس کے بعد انھوں نے مالی وجوہات کے پیش نظر اس کو کرم آباد سے شائع کرنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے دفتر کے پاس ہی ایک کمرہ میں لکڑی کا پریس لگا لیا جس میں زمیندار ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک چھپا۔ یہ اخبار $\frac{18 \times 22}{4}$ کے بارہ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ اور اس کے مضامین اور خبریں سب وہ اکیلے مرتب کیا کرتے تھے۔ زمیندار

کی اشاعت ایک ہزار تک رہی لیکن پنجاب ایکٹ کے خلاف ایک طویل نظم ہاڑہ (فریاد) جو چودھری شہاب الدین مرحوم نے پنجابی زبان میں لکھی تھی، وہ اس میں شائع ہوئی اور اس نظم نے انتہائی مقبولیت حاصل کرلی۔ زمین داروں نے بالخصوص سکھوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور اس کے ترجمے گرمکھی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو گئے۔ اس وجہ سے اس کی اشاعت دو ہزار سے زیادہ ہوگئی۔

مولوی صاحب مرحوم نے اس ہفتہ وار اخبار کے ذریعے زمین داروں کی خدمت کی۔ اور یہی زمیندار کا مشن تھا کہ زمین داروں میں بیداری اور قوتِ عمل کی روح پیدا کردے، اور پنجاب کے زمین داروں کو تعلیمی، زراعتی اور اقتصادی لحاظ سے کامیابی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچائے۔ انھوں نے حوصلہ شکن حالات اور مشکلات کے باوجود تنہا غیر متزلزل عزم کے ساتھ اس مشن کو جاری رکھا۔ آخر کار ۶ سال کی لگاتار دماغی محنت اور ادارت کی شدید ذمہ داریوں نے ان کے جسمانی قویٰ پر اثر ڈالا، ان کا جگر اور معدہ کمزور ہو گیا اور وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کا تعلق ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے قطع ہو چکا تھا۔ اور وہ لاہور پہنچ چکے تھے۔ لاہور کے ڈاکٹر بیلی رام نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ مولوی سراج الدین صاحب کو کرم آباد پہنچا دیا جائے تاکہ وہاں آرام کریں۔ اس لیے کہ اب علاج بے فائدہ ہے۔ مولوی صاحب نے — اپنے بڑے بیٹے ظفر علی خاں کو وصیت کی کہ میرے بعد زمیندار کو زندہ رکھا جائے کیوں کہ میں نے اس کو خونِ جگر سے سینچا ہے۔

مولوی صاحب کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۰۹ء کو ہو گیا اور مولانا ظفر علی خاں نے اس ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور اس طرح یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو اس کا پہلا ایڈیشن نئی ادارت میں کرم آباد سے نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس اخبار کو انھوں نے جس محنتِ شاقہ کے ساتھ چلایا اور اس سلسلے میں جو جو تکلیفیں اور عظیم مالی نقصان برداشت کیے وہ اردو صحافت کی تاریخ میں ایک یادگار مثال ہے[1]۔ وہ جب تک زندہ رہے اخبار اسی آب و تاب کے ساتھ پہلے کرم آباد سے اور پھر لاہور سے نکلتا رہا۔ جنوری ۱۹۵۳ میں اس اخبار نے اپنی خدمات سے متعلق مضامین پر مشتمل ایک دیدہ زیب اور باتصویر گولڈن جوبلی نمبر نکالا۔ ایک طویل شذرے میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد سراج الدین احمد کے اخبار "زمیندار" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ان کے دادا مولوی کرم الٰہی خان نے ۱۸۸۲ء میں وزیر آباد سے دو میل دور زمین خرید کر اپنے نام پر کرم آباد کی بستی آباد کی تھی اور ان کے والد نے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر "زمیندار" کے نام

سے ایک ہفت روزہ جاری کیا اور بعد میں میاں محمد شفیع (جنھیں سَر کا خطاب ملا) سے مل کر "زمیندار ایسوسی ایشن" قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ زمین داروں کی بھلائی کے کام کیے جائیں۔ "زمیندار" کے بارے میں مولانا نے یہ سطور لکھیں:

"اس شخص نے کمرِ ہمت باندھ کر وہ کام اپنے ذمّے لیا جس کی مشکلات کا تصوّر کرتے ہوئے ہر قلب ڈرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے اس نے ایک اخبار بنام "زمین دار" جاری کیا اور اس کے ذریعے سے اپنی آواز، جو گُم کردہ راہ کارواں کے لیے بمنزلۂ بانگِ درا تھی، زمیندار تک پہنچانی شروع کی۔ یہ آواز اوّل اوّل بہت ہی دھیمی اور مدّھم تھی لیکن رفتہ رفتہ بلند اور پاٹ دار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ دشت و جبل اور وادی و کوہسار اس سے گونج اٹھے اور ایک اخبار "زمیندار" نے چند سال کے عرصے میں وہ کام کیا۔ جو بڑی سے بڑی طاقت نے صدیوں سے انجام نہ دیا تھا۔ زمین دارانِ پنجاب میں حرکت اور بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت اور وقعت سے آگاہ ہو گئے۔ وہ ان حقوق کا جو مدّت ہائے مدید سے یا تو نظر انداز ہوتے چلے آئے تھے یا پامال کیے جا رہے تھے، مطالبہ کرنے لگے۔ ان میں شوقِ علم پیدا ہو گیا۔ ان میں زندگی کی نشانیاں نظر آنے لگیں اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایک ادنےٰ کرشمہ اس نئی رُوح کا، جو اس اخبار نے زمین داروں پر بلا لحاظِ مذہب و ملت (اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے) پھونک دی، یہ تھا، قانون نو آبادی ہائے پنجاب جسے انھوں نے اپنے لیے مضر سمجھا تھا علی الرغم مخالفین، لارڈ منٹو کی عنایت سے نافذ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"[۲]

مولانا ظفر علی خان کی ادارت:

اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کے انتقال کے بعد انھوں نے زمیندار کی ادارتی ذمّہ داریوں کو پورے طور سے سنبھال لیا۔ انھیں اس درمیان میں پیسہ اخبار (لاہور) وکیل (امرت سر) کی طرف سے اور اسلامیہ کالج (لاہور) کی طرف سے بھی ملازمت کی پیش کش کی جا چکی تھیں لیکن انھوں نے ہر جگہ ذمّہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آزادی اور دل جمعی کے ساتھ اپنے ہی اخبار کو جاری رکھنے کے عزم پر قائم رہے۔ چناں چہ یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو کرم آباد سے اس اخبار کے دورِ ثانی کا آغاز کیا۔ اور اسی پالیسی کو مدِّ نظر رکھا جس کے مطابق ان کے والد نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ اگرچہ ان کے والد کے زمانے میں اس اخبار کی شہرت خاصی ہو گئی تھی اور مولوی سراج الدین کے انتقال کے بعد اخبارات نے ان کی قومی خدمات کا ذکر اہم طریقے سے کیا تھا۔ اور انھیں ان کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ لیکن مولوی

ظفر علی خاں نے اس اخبار کی ذمّہ داریاں سنبھالتے ہی اس کی ادبی اور علمی حیثیت کو کہیں بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے قلم سے زمیندار میں پہلا ہی اداریہ جو نکلا اس سے پورے طور سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ہفتہ وار اخبار نے اپنے ادبی معیار کو کہیں بلندی پر پہنچا دیا۔ اس اداریہ میں انھوں نے حیدر آباد کے قیام اور وہاں سے اخراج کی پوری تفصیل کو اپنے خاص اندازِ بیان میں پیش کیا ہے۔ زمیندار کا یہ پہلا اداریہ ہی اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس اخبار کا مدیر انشا پردازی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بہترین اسلوبِ نگارش میں پیش کرنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہے (پیسہ اخبار (لاہور) میں ان کی نظم "واکرنامہ" شائع ہوتے ہی لاہور سے حیدر آباد تک ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی دھوم مچ گئی تھی اور وہ پرچہ جس میں واکرنامہ شائع ہوا تھا۔ بعد میں کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکا۔ ہم اس نظم کو ضمیمہ میں شامل کر رہے ہیں)۔ نثر نگاری اور اداریہ نویسی میں "دکن ریویو" کے تجربات نے ان کے قلم میں اس قدر زورِ بیان پیدا کر دیا تھا کہ ان کی ادبی اور صحافیانہ صلاحیتیں ایک ہفتہ وار اخبار سے کہیں بڑھ کر ایک نئے میدان کی متلاشی تھیں۔

"زمیندار" ۱۹۱۱ء کی فہرست مضامین اور اس کا سرورق

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

زمیندار

جلد دو (۲) کرم آباد۔ یکشنبہ یکم جنوری ۱۹۱۱ء مطابق ۲۹ ذی الحج ۱۳۲۸ھ موافق یکم اسفندیار ۱۳۲۰ ف۔ نمبر ۱

فہرست مضامین

تار کی خبریں۔ نیشنل کانگریس
ہز ہائی نس آغا خاں کی یادگار تقریر۔ ایک مبارک انقلاب کے آثار۔
نازلی بیگم کا قصّہ۔ زمین دارانِ پنجاب کا قضیہ۔
مسلمانوں کے تنزل کے آثار۔ مسلمان در شراب، مسلمانی در کتاب۔
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اور عبد اللہ یوسف علی کی تقریر۔
مجوزہ مسلم ہندو کانفرنس۔
قانونِ نو آبادی ہائے پنجاب
اشتہارات۔

پرنٹ لائن

دفتر اخبار زمیندار۔ کرم آباد سے باہتمام ظفر علی خاں بی اے مالک و ایڈیٹر شائع ہوا۔ مطبوعہ رفاہِ عام۔ اسٹیم پریس۔ لاہور۔

یہ اخبار ۲۰ صفحات پر مشتمل تھا اور اس کا پہلا نمبر رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے نکلا تھا۔

ہفتہ وار "زمیندار" کے اداریے

(۱) ہیلی کا دُم دار ستارہ (علمی اداریہ) .. .. .. یکم فروری ۱۹۱۰ء

(۲) امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا پہلا اجلاس .. .. ۸ر فروری ۱۹۱۰ء

(۳) رُوس اور جاپان کے تعلقات .. .. .. ۱۶ر فروری ۱۹۱۰ء

(۴) آفت پر آفت (زمین داروں کے متعلق) .. .. ۲۲ر فروری ۱۹۱۰ء

(۵) افریقہ میں اشاعتِ اسلام .. .. یکم مارچ ۱۹۱۰ء

(۶) آبادی نہرِ جہلم کی داستان .. .. ۸ر مارچ ۱۹۱۰ء

(۷) مہتمم بندوبست کی ذمہ داری .. .. .. ۱۶ر مارچ ۱۹۱۰ء

(۸) وزیر آباد کی میونسپل کمیٹی .. .. ۲۳ر مارچ ۱۹۱۰ء

(۹) ایک ہندوستانی لیفٹیننٹ گورنر .. .. .. ۳۰ر مارچ ۱۹۱۰ء

(۱۰) شہنشاہ نجاشی .. .. ۸ر اپریل ۱۹۱۰ء

(۱۱) مولوی سراج الدین احمد کا آخری اداریہ .. .. ۱۶ر اپریل ۱۹۱۰ء

(۱۲) انسانِ کامل کی شان اکملیت۔

(۱۳) آنریبل خواجہ احمد شاہ اور تعلیم .. .. ۸ر مئی ۱۹۱۰ء

(۱۴) قیصر ایڈوارڈ کی رحلت (نظم و نثر میں) .. .. ۱۶ر مئی ۱۹۱۰ء

۱۹۱۱ء کے اداریے۔ از یکم جنوری ۱۹۱۱ء تا اگست ۱۹۱۱ء

(۱) اَن دیکھے کسان۔ ۱۸ر جنوری

(۲) ہماری یُونی وَرسٹی ۱۱ر فروری

(۳) یہ آزادی ہے یا گستاخی

(۴) پنجاب اور اِسلامی یُونی وَرسٹی کا خیر مقدم (پروویشنل کمیٹی نواب فتح علی خاں قزلباش کو مبارک باد۔ ۹ کالمی اداریہ)

(۵) رحمتہ للعالمین کی سال گرہ (باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار)

(۶) وزیر آباد لیجسلیٹو کونسل میں (ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے)۔

(۷) نویدِ خیر مقدم قیصر۔

(۸) کیا مسلمان متعصب ہیں ؟

(۹) رادھا کا ناچ نومن تیل کے بغیر۔ (مسوّدۂ قانون پنچایت)

(۱۰) انجمن اتحاد و ترقی مسلمانانِ پنجاب ۔

(۱۱) مضمون سر سیّد احمد۔

(۱۲) سائنس و زراعت ۔

(۱۳) ایک مسلمان ڈی ایس پی پر ہندو پریس کی یورش ۔

(۱۴) ابتدائی تعلیم کا مسوّدۂ قانون ۔ از گوکھلے

(۱۵) ابتدائی تعلیم نمبر ۲۔

(۱۶) مسلم یونی ورسٹی قابلِ توجہ معزز اراکین مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی ۔

ذیل میں ہم ان کے ایک اداریے (اَن دیکھے کسان) ۱۶ر جنوری ۱۹۱۱ء (۲/۱ کالمی) سے ایک اہم اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ان کی اِنشاپردازی کا اندازہ کیا جا سکے گا ۔

"صانعِ قدرت کے عظیم الشان کارخانہ میں ہوا، بادل، چاند، سورج جیسی زبردست قوتوں یا طاقتوں کو مزدوری کرتے ہوئے دیکھ کر سعدی نے آج سے چھ سو سال پہلے انسان کو یہ سبق دیا تھا ۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

لیکن اگر شیراز کا نکتہ رس شاعر اس زمانے میں موجود ہوتا جب کہ انسان کی عقلِ دقیقہ سنج کو ذرہ میں آفتاب اور قطرہ میں قلزم کا تماشہ نظر آتا ہے، اور جب کہ غیر محدود بڑائی کی طرح محدود چھوٹائی میں ان گنت جان داروں کی بے حساب دنیائیں دریافت ہو گئی ہیں جن کی آنکھوں سے اوجھل اور قیاس سے باہر آبادی ہماری خاطر خون پسینہ ایک کر رہی ہے تو شاعر اپنے معرفت آموز قول کی دوسری شق کو حقیقت نفس الامری کے قریب پاتا ۔

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

وہ کارندگانِ عالم جن کی قوتوں کا صحیح صحیح اندازہ انسان اب کرنے لگا ہے بجز اثم

ہیں جن کا آج سے دو سو سال پہلے تک علومِ جدیدہ کے ماہروں کو علم تک نہ تھا ان کی کارگزاری اور اثرات پر تو پچاس ہی سال میں نظر ڈالی جانے لگی ہے۔ جراثیم آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ اور ایسے باریک ہوتے ہیں کہ نگاہ خوردبین کی مدد سے بھی ان کا مطالعہ صرف اس حالت میں کر سکتی ہے جب کہ یہ انبار در انبار ایک جگہ موجود ہوں۔ ماہرینِ علمِ جراثیم کا خیال ہے کہ دودھ کے قطرہ میں دس کروڑ جراثیم کی سمائی ہو سکتی ہے۔ ابھی تک صحیح طور پر یہ دریافت نہیں ہوا کہ یہ حیوان ہیں یا از قسم نباتات۔ ان کی ایک قسم نباتی اور حیوانی مادہ پر اپنی زندگی بسر کرتی ہے اور اس قسم کا گزارہ مادی عنصر پر ہوتا ہے۔ شکل ان کی سیدھی سادھی ہوتی ہے۔ بعض گیہوں کی طرح گول ہوتے ہیں، بعض چھری کی طرح لمبے۔ بعض کی شکل گاؤ دُم ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض متحرک ہوتے ہیں بعض ساکن۔ ان کی حرکت نرم و نازک روؤں کی مدد سے پیدا ہوتی ہے اور ان کے بڑھنے کا طریقہ ایسا سادہ ہے کہ اس سے زیادہ سادہ طریقہ قیاس میں نہیں آسکتا۔ یعنی ایک حیات ریزہ کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر حیات معتدل ہو اور غذا مناسب مقدار میں میسر آتی رہے تو وہ پنپ کر ہر آدھ گھنٹہ کے بعد شق ہو سکتے ہیں۔ افزائش کی اس رفتار سے بآسانی ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک اکیلے جرثومے کی اولاد چوبیس گھنٹے کے اندر ایک کروڑ ستّر لاکھ کی تعداد کو پہنچ سکتی ہے۔ اس حد درجہ چھوٹائی پر بھی اگر یہ برابر اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو دنیا میں بہت جلد بجز جراثیم کے اور کسی مخلوق کی گنجائش نہ رہے۔ لیکن غذا کی کمی اور دوسرے اسباب کی ناسازگاری سے ان کی افزائش کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔"

اداریہ منقولہ از زمیندار۔ ۲۴ر فروری ۱۹۱۱ء

یہ آزادی ہے یا گستاخی

(انڈین ورلڈ نے ہم عصر "پنجابی" کی ۲۱ر فروری کے اخبار میں تائید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ صلح و آشتی کی ابتدا ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ گورنمنٹ نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے کے لیے جس آلہ سے کام لیا وہ سر سید احمد خاں تھے۔ جنھیں ملکی فلاح و بہبود سے کوئی کام نہیں تھا بلکہ وہ حکام کے ساتھ بمنزلہ ایک کٹھ پتلی کے تھے)۔ (زمیندار نے اس موضوع پر اپنا اداریہ لکھا اور انڈین ورلڈ کی تردید کی)

"مغربی تہذیب چند نرالے خیالات کو ساتھ لیے انگلستان سے چل کر ہندوستان پہنچی۔

ہندوستان میں جو خیالات ہزارہا سال سے پھیلے ہوئے تھے ان کے ساتھ یہ نئے خیالات ٹکرائے اور قدیم و جدید کے تخیل کی اس مڈھ بھیڑ نے عجیب طوفانِ بے تمیزی برپا کر دیا۔ جس طرح روزنِ دیوار میں سے جھانکتے ہوئے سورج کی کرن میں ذرہ ناچتا ہوا نظر آتا ہے اسی طرح مغربی تمدن کی روشنی میں مشرقی تہذیب کے بے تابانہ رقص کا نظارہ اربابِ بصیرت کو نظر آنے لگا۔ اس کی گردن پر جس میں زنار پڑا ہوا تھا، نکٹائی نے قبضہ کر لیا۔ اس کی کمر کو جس میں دھوتی یا تہبند لپٹا رہتا تھا، پتلون نے مسخر کر لیا۔ اس حویلی کی جگہ جس کی چہار دیواری کے اندر نامحرم کی نگاہ نہ جا سکتی تھی، بنگلے نے لے لی جو ہر طرف سے چشمِ عاشق کی طرح کھلا رہتا ہے۔ مشرق و مغرب کا تصادم اپنے اثرات کے لحاظ سے یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ ہندوستانیوں یا کم سے کم ان کے دماغ کے ایک بڑے حصہ کا ان تمناؤں اور آرزوؤں کی جولان گاہ بن گیا جو یورپ ہی کو زیب دے سکتی تھی۔ بجائے خود یہ تمنائیں اور آرزوئیں بے جا نہ تھیں مگر ان کے اظہار کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ اس قدر احمقانہ اور خود سرانہ تھا کہ خود ہندوستانیوں کی ایک بڑی جماعت کو اس پر ندامت آمیز افسوس ہوا اور وہ اس سے الگ ہو گئے۔ یہ بے شعوری اور خود سری کسی نہ کسی شکل میں اب بھی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک تاسف انگیز جھلک ہمیں معاصر "پنجابی" کے مہر فروری کے لیڈر میں نظر آتی ہے جو اس بحث کے لیے وقف کیا گیا ہے کہ موجودہ ہندو مسلم اختلاف کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ ہمارے معاصر نے اس لیڈر میں انڈین ورلڈ کے ایک نامہ نگار کی ہم آہنگی اور ہم صفیری کا حق ادا کر دیا ہے جو کانگریس کا بہت ہی بڑا شیدائی معلوم ہوتا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اسی موضوع پر پریس کی آزادی کی اس بے راہ روی پر توجہ دلائی اور لکھا کہ "اگر پریس کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ حکومتِ وقت پر اس قسم کے الزامات باندھے جائیں، تو ایسی آزادی کو دور ہی سے سلام ہے۔ یہ شوخ چشمی ہے، گستاخ دیدگی ہے، بلکہ سرکشی ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اس امر کی تردید کی کہ صلح اور آشتی کی ابتدا ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی اور یہ لکھا کہ صلح کا ہاتھ بڑھانے میں پیش دستی ہندوؤں نے نہیں کی تھی۔ کہ کیوں کر ہمارے دوست چٹکی بجاتے میں تاریخی واقعات سے خالی الذہن ہو جاتے ہیں۔"

آپ نے اس اداریے میں آگے چل کر لکھا کہ "مسلمانانِ ہند کے ہاتھ سے جب حکومت جاتی رہی تو لے دے کر ایک تو ان کے پاس ان کا مذہب رہ گیا تھا اور ایک زبان رہ گئی تھی اور یہی ان کی کل پونجی تھی۔ ہندوؤں نے دوستی کا دانا ہاتھ مسلمانوں کی طرف اگر بڑھایا تو

اس نیت سے بڑھایا کہ ان کی زبان کو گدی سے کھینچ کر باہر رکھ دیں۔ ۱۸۶۷ء میں آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر جبکہ کانگریس نے جنم نہ لیا تھا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے برادرانہ تعلقات قائم کرنے کا ثبوت اس شکل میں دیا کہ ملک بھر میں یہ تحریک پھیلا دی کہ اُردو زبان اور فارسی خط کو تمام سرکاری عدالتوں اور تعلیم گاہوں اور دفتروں میں موقوف کرا دیا جائے۔ اس مضبوط تحریک کا نتیجہ ہے کہ بہار اور ممالک متوسّط میں بجائے اُردو کے ناگری رائج ہو گئی اور ممالک متحدہ میں ہندی بخط ناگری، اُردو بخط فارسی کی رقیب بنا دی گئی۔ اب پنجاب میں بھی اُردو کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت سے سرسیّد احمد خاں ہندوؤں کی طرف سے کھٹک گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمان ایک قوم نہیں بن سکتے، اور یہ یقین بے جا نہ تھا۔ اس لیے کہ جس قوم کی زبان ایک نہ ہو، وہ قوم کس طرح ایک کہلائی جا سکتی ہے؟"

آخر میں آپ نے سرسیّد احمد خاں کو خراجِ تحسین عطا کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "سرسیّد احمد خاں کی ذات بابرکات سے ملک کو جو فیض پہنچا ہے، اسے ایک زمانہ جانتا ہے، باقی رہی یہ بات کہ ہمارے لکھنے سے پنجابی اور انڈین ورلڈ کے دل سے یہ بات نکل جائے کہ سرسیّد ملک کے دشمن تھے اور وہ آئے دن انھیں بُرا کہنے سے باز آجائیں۔ سو یہ محال ہے۔ بے چارے سرسیّد احمد خاں کس شمار اور قطار میں ہیں؟"

۱۶ر اگست ۱۹۱۱ء کے پرچہ میں مسلم یونی ورسٹی پر ایک اداریہ شائع ہوا، جس میں اراکینِ مسلم یونی ورسٹی کانٹی ٹیوشن کمیٹی کو خاص طور سے اس اداریے کے ذریعے توجہ دلائی گئی تھی۔ ذیل میں اس اہم اداریے میں سے، جو اخبار کے چھ کالم میں شائع ہوا تھا، چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

۱۔ "ہندوستان میں جو زبردست دماغی ہل چل کچھ مدت سے پڑی ہوئی ہے اس کا سب سے زیادہ خوش آئند کرشمہ وہ ندیم النظیر دلچسپی ہے کہ ان کی ایک قومی یونیورسٹی ہونی چاہیے۔ مسلم یونی ورسٹی کے تصوّر کا بیج سرسیّد احمد خاں کے آنسوؤں کی آب یاری سے اُگا۔ اُن کے ہم چشموں کی عرق ریزی نے سینچا۔ ان کے جانشینوں کی جاں فشانیوں سے ہرا ہوا۔ اور اب ان سات کروڑ مخلوق کی دلی تمنائیں اس میں برگ و بار لانے کو ہیں جن کے دل احسان پذیر میں ان کی اطمینان آفرین یاد جاگزیں ہے۔ مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہے۔ ان کا کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، جینا، مرنا سب مرکزی احکام کے تابع ہیں۔

اپنوں کے ساتھ ان کا سلوک، بیگانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ، حکومت وقت کے ساتھ ان کا طرزِ عمل، ایک معینہ مذہبی ضابطے کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ مذہبی ضابطہ جس حد تک کہ شقِ آخر الذکر کو تعلق ہے، انھیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ اگر حاکمِ وقت تمہاری مذہبی آزادی میں مخل نہ ہو، تو خواہ وہ حبشی بھی ہو، اس کی کورانہ اطاعت کرو۔ انھی مقدس روایات کے اثر سے مغربی تعلیم کی اطاعت شکن حریت آموزی کا جادو ان پر چلنے نہیں دیا۔ اور ان کی جادو نگاری اور وفاداری کا غیر متزلزل ستون مرکزِ ثقل سے ہٹ نہ سکا۔ لیکن ناممکن تھا کہ مغرب کی ایمان سوز ملحدانہ آزادی اپنا رنگ نہ لائے۔ ہندوستان کی سرکاری یونی ورسٹیوں کے گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کو ان کے آبا و اجداد کی روایات کی پُراسرار طاقت نے اگرچہ اس ڈگر پر پڑ لینے سے روک لیا جو رابندر گھوش، بپن چندر پال، بھائی پرمانند، کرشنا ورما، مدن لال ڈھنگرا، تلک، سر کشن گپتا کو ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف کشاں کشاں لے گئی اور لے جا رہی ہے۔ لیکن جو راستہ انھوں نے اپنے نامسلمان ہم چشموں کی روش کے خلاف اختیار کیا۔ وہ کم سے کم کچھ کم خطرناک نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ راستہ بجائے کعبہ کے اسے ترکستانِ جدید یعنی پیرس اور لندن کی طرف لے جاتا تھا۔

لارڈ میکالے نے جب ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق اپنی شہرۂ آفاق یادداشت اوّل اوّل مرتب کی اور اربابِ حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ اہلِ ہند کو مغربی تعلیم کے فیضان سے کم سے کم بہرہ افروز ہونا چاہیے تو مغربی تو ایک طرف رہے، خود مشرقیوں تک کے دل میں یہ خدشہ پیدا نہ ہوا تھا کہ مغربی خیالات کی شراب تاوقتیکہ وہ مشرقی قرابے میں بھرنا ہوئی نہ ہو، مشرقیوں کو مدہوش و از خود رفتہ کیے بغیر نہ رہ سکے گی۔ اور جب تک یورپ کی حریت آموز مساوات اور رطب مادہ پرستی کا ردِعمل مشرق کی ادب شعار اور اطاعت کے روحانیت کے ذریعہ نہ کیا جائے گا۔ مشرقی شاگردوں کا دماغ ستونِ مرکزِ ثقل پر ہرگز قائم نہ رہ سکے گا۔ اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر کے مغربی نمونے کی یونیورسٹیاں ہندوستان میں جاری کر دی گئیں جو بلحاظ یہاں کے مقامی حالات کے اہلِ ہند کے لیے اس طرح موزوں نہ تھیں اور اس غیر موزونی سے جو ناخوش گوار نتائج پیدا ہوئے ہیں، اس کا اعتراف آخر حکومتِ عالیہ کو کرنا پڑا، اور خواہی نخواہی یہ بات ماننی پڑی کہ موجودہ طریقۂ تعلیم بڑی حد تک اصلاح طلب ہے۔

پیرس اور لندن کا یہ رہرو اس راستے سے بھٹک کر کوسوں دور جا پڑا ہے۔ یہ جیسے حضورِ سرورِ کون و مکاں صلعم آج سے سوا تیرہ سو سال پہلے تیار فرما گئے ہیں اور جس کے لیے

خلفا و ائمہ و علماء و صوفیہ کی مقدس زندگیاں اب تک میلوں اور فرسنگوں کا کام دے رہی تھیں، مغربی تعلیم کی روشنی سے نوجوان مسلمان کی آنکھیں چندھیا گئیں، قرآن پس پشت ڈال دیا گیا۔ حدیث مجموعۂ شطحیات سمجھی جانے لگی۔ فقہ کے اصول تقویم پارینہ بن گئے۔ اس اسلامی تہذیب کی جگہ جس پر صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ کا رنگ چڑھا ہوا تھا جس نے رحماءُ بینہم کی زندہ تصویریں پردۂ بشریت پر کھینچ کر انسان کو حق اللہ اور حق العباد سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہونے کی تعلیم دی تھی۔ مغربی تمدن نے لے لی جس کی تماشہ گاہ میں اس مہمان بے بصر کو اگر کچھ نظر آیا تو بنگلہ، پاٹ، صابن، کوٹ، کالر، پتلون، سگار، شراب، پیانو، لیونڈر اور کباب، مذہب اور اہل مذہب کی ہجونگاری، اسلام اور روایات اسلام سے بیزاری کا زنگا رنگ مرقع دکھائی دیا۔ اگر یورپین تہذیب کا منہ اس طور پر چڑاتے چڑاتے فطری جوش میں ردعمل کے فلسفیانہ اصول کا تازیانہ کھا کر مغربی تہذیب کی اس مسلمان نما گڑیا کو مسلمانوں کی طرف بھی مائل کیا تو اس طرح کے قرآن، حدیث، فقہ، سیر سے مطلق بے بہرہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کی طرف سے بالکل بے پروا لیکن تقریر و تحریر میں انھی مقدس حقیقتوں کی تائید شد و مد سے کی جانے لگی۔

موجودہ یونیورسٹیوں میں نوجوانوں کو تعلیم دلوا کر یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے وقت کے غزالی اور رازی و ابن خلدون و شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد یا شبلی یا حالی بنیں گے۔ یہ خیال ایسے ہی ہے جیسے جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید کرنا یا کانٹے بو کر پھول چننے کا خیال کرنا۔ جس تعلیم نے ان مشاہیر اسلام کو پیدا کیا اور جن کا نام اب یورپ کی بزم علم و فضل کا مشعل افروز ہے۔ اس کا پیوند جب تک آج کل کی علمی، اقتصادی اور سیاسی ضروریات کی شاخ میں نہ لگایا جائے، مسلمان صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں کہلائے جا سکتے۔ نہ ان کا وجود بنی نوع انسان کو اس عقلی اور اخلاقی معراج پر پہنچانے والی تحریک کی بقا اور نشو و نما کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان سے ہم جن باتوں کے متوقع ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ صوم و صلوٰۃ کا سختی سے پابند ہو اور دوسرے شعائر اسلام کا بھی بالالتزام عامل ہو۔

۲۔ اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر سے بقدر وافر بہرہ اندوز ہو۔

۳۔ اردو کے علاوہ جس میں وہ اپنے خیالات کے ادا کرنے میں پوری قدرت رکھتا ہو

عربی میں بھی اسے اس حد تک دستگاہ ہو کہ بلا تکلف اس زبان کو بول سکے۔ اس کے علاوہ یورپ کی ایک زبان میں بھی اُسے مہارت تامہ رکھنی لازم ہے۔

۴۔ مغربی علوم نظری اور طبعی پر اُسے عبور حاصل ہو۔

۵۔ کسی ایک معاش کے فن کا ماہر ہو تاکہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکے۔

شق اول کی شرط کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو وہ مابہ الامتیاز جو مسلمان اور نامسلمان جماعت کے مابین حدِ فاصل ہے، اگر وہ اس پر قائم نہیں رہ سکتا تو ایسا مسلمان شعائرِ اسلام ہی سے عاری ہو کر نامسلمان کا حکم رکھتا ہے۔

شق دوم کی ضرورت اس لیے ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوئے بغیر اور اپنے قومی لٹریچر میں ذوق رکھے بغیر وہ عصبیت مسلمانوں میں پیدا نہیں ہو سکتی جس کا وجود قومی ہستی کا کفیل اور جس کا فقدان قومی موت کی علامت ہے۔

اداریہ منقولہ از زمیندار۔ یکم مارچ ۱۹۱۲ء

پنجاب اور اسلامی یونی ورسٹی کا خیر مقدم۔

اس اداریے میں انھوں نے اسلامی یونی ورسٹی کے خیر مقدم کی پوری تفصیل درج کی اس سلسلے میں انھوں نے ۹ کالم لکھے۔ ہر کالم میں ۶۱ سطریں تھیں۔

اس اداریے میں انھوں نے لکھا۔ "سر سید احمد خاں کے دل میں وہ درد پیدا ہوا جس کے ایک ذرے پر فریدالدین عطار نے کفر اور دین کو نثار کر دیا۔ اور اس کے درد کی ٹیس ان کے چند ہم خیال احباب کے جگر میں اُٹھی۔ ان احباب نے اپنی بے تابی اور بے قراری کو دوسروں کے سینوں میں منتقل کیا۔ تاآں کہ ایک مشعل سے لاکھوں مشعلیں فروزاں ہو گئیں۔ اور سید کی رحلت کو بارہ برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کے دو جانشینوں (محسن الملک اور وقار الملک) جن میں سے ایک تو راہ گزارِ عالم باقی ہو چکا ہے، دوسرے کو خدا صد دسی سال زندہ رکھے، کی جاں کاہیوں کے تصدق میں ہندوستان کی اسلامی دُنیا ایک سرے سے دُوسرے سرے تک اس خوش نما رنگ میں رنگ گئی ہے جو ملّتِ بیضا کا اصلی رنگ ہے۔ یعنی خود خلّاقِ زمین و آسمان کا رنگ۔

یہ خیال کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو ترقی دے کر اسلامی یونی ورسٹی کے درجہ تک پہنچایا جائے جو طلب العلم کے ارشادِ پاک کی تعمیل کے لحاظ سے جامع حیثیات دینی و دُنیوی ہو، سر سید کا نصب العین تھا۔ لیکن جس طرح نہاوند و اسکندریہ کی تسخیر کا طرہ حضرت فاروقِ اعظم رضہ کی کلاہِ اقبال کے لیے مقدر ہو چکا تھا، اسی طرح اسلامی یونی ورسٹی کے منصوبے کی

تکمیل وقار الملک کے ہاتھوں سے منسوب ہو چکی تھی۔

ہز ہائی نیس سر آغا خاں کے استقبال پر معاصر "پنجابی" اخبار لکھتا ہے کہ اس خیر مقدم کا انتظام سر برآوردہ مسلمانان لاہور نے بہت بڑے شاہی پیمانے پر کیا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے شہر کے بازاروں کو بینروں، رنگین جھنڈیوں، محرابوں اور دوسرے آرائشی لوازم کا ایسا سماں آج تک نصیب نہیں ہوا۔ ۲۳ر فروری کی شام کو ہماری طرح کوئی اگر ریلوے اسٹیشن سے چل کر دلی دروازے سے ہوتا ہوا مسجد وزیر خاں، سنہری مسجد، ٹبی بازار، بھاٹی دروازے کو طے کرتے ہوئے انار کلی پہنچا تو اسے قومی بیداری کے آثار قدم قدم پر سبز پتوں کی زمردی محرابوں، رنگ برنگی بینروں اور جھنڈیوں، خوش نما اور قیمتی شعروں اور کتبوں کی شکل میں نظر آتے، جن سے بازاروں کو دکانوں کو ہز ہائی نیس اور نواب وقار الملک اور ہمراہیوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے لوگوں نے دو رویہ سجا رکھا تھا اور محرابوں پر یہ مصرعے لکھے ہوئے تھے۔

مردے از غیب بروں آید و کارے کند

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

ہزار جاں گرامی فدائے ہر قدمت — اور کہیں

نصر من اللہ و فتح قریب

"لاہور سے پانچ لاکھ روپے کے قریب چندہ ہوا" اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجوزہ اسلامی یونی ورسٹی کے لیے پنجاب کے تمام سر برآوردہ لوگوں نے دل کھول کر چندے دیے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۱۱ء اداریہ "رحمۃ للعالمین کی سال گرہ"

(شاعر نے اداریہ کی جگہ اپنی مشہور نعت لکھی تھی جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں۔

محمد مصطفیٰ، گنج شہادت کے امین تم ہو — شفیع المذنبیں تم رحمۃ للعالمین تم ہو

ہوئی تکمیل دیں تم سے کہ ختم المرسلین تم ہو — رسالت ہے اگر انگشتری اُس کے نگیں تم ہو

۸ر اپریل ۱۹۱۱ء کے اخبار میں "کیا مسلمان متعصب ہیں" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا گیا جس میں لالہ سری رام ایم اے کی تالیف خم خانۂ جاوید پر مولانا الطاف حسین حالی نے جو ریویو لکھا تھا وہ "زمیندار" نے بجنسہٖ شائع کیا اور اس پر تبصرہ بھی شائع کیا۔ یہ اداریہ صرف صحافتی اداریہ نہیں بلکہ ایک علمی مقالہ ہے جس سے مولانا ظفر علی خاں کے اردو زبان کے بارے میں نقطۂ نظر کا پتا چلتا ہے۔ یہ بے حد وقیع اداریہ ہے۔ اس اداریہ میں خود مولانا الطاف حسین حالی پر بھی ان کے اس اعتراض پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے تعصب کی وجہ سے سنسکرت اور ہندی زبان سے روگردانی اختیار کی۔

اداریہ منقولہ از زمیندار، یکم مئی ۱۹۱۱ء

"آفتابِ اسلام کا طلوع جاپان میں"

(اس اداریہ کے ضمن میں مولانا نے جو اہم باتیں لکھی ہیں ان کے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

۱۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ وہ وقت آگیا ہے جب کہ ہندوستان کی تمام اسلامی انجمنیں اپنی کوششوں کو ایک مرکز پر لے آئیں اور تبلیغِ اسلام کی اس خدمت کی انجام دہی کو جس کے لیے ہمارے آقا و مولا خواجۂ دو جہاں علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اپنی مقدس زندگی وقف فرمائے رکھی اور جسے حضورؐ کے بعد ملّتِ بیضا کے علماءِ عظام اور صوفیائے کرام نے اپنا فرضِ اوّلین سمجھے رکھا۔ اپنی دینی و دُنیوی سرگرمیوں کا مقصودِ اصلی قرار دیں۔

۲۔ مسلمانوں کی موجودہ مذہبی حالت اور اسلام کی ہمہ گیر تبلیغی ضرورت کو مدِّ نظر رکھ کر ہم نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دینِ حق کی تبلیغ کے لیے دو عنوانات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ (۱) اندرونی تبلیغ۔ (۲) بیرونی تبلیغ۔ اندرونی تبلیغ سے مُراد یہ ہے کہ ان لاکھوں کروڑوں نفوس کو جو برائے نام مسلمان ہیں لیکن حقیقت میں اسلام سے کوسوں دُور ہیں، انھیں از سرِ نو مُسلمان بنایا جائے اور ان میں وہ تمام عادات و اوصاف پیدا کیے جائیں جو اسلام کی خصوصیات سے ہیں۔ بیرُونی تبلیغ کا مقصد یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کو دعوتِ اسلام دے کر حلقہ بگوشِ ملّتِ بیضا بنایا جائے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو بیرونی تبلیغ کے مقابلے میں اندرونی تبلیغ کے بہت زیادہ مواقع ہیں۔ خصوصاً آج کل کے زمانے میں جب کہ دُنیائے اسلام کو مخالف قوتوں کی مزاحمت اور مداخلت کے لیے اپنی پُوری قوت سے کام لینے کی ضرورت درپیش ہے۔ حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ پوری قوت بلا قوم کے نظامِ ترکیبی کی کامل صحت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور نظامِ ترکیبی کا قوام کچھ ایسا بگڑا ہُوا ہے کہ کروڑوں مُسلمان مُنھ سے تو ایک خدا کو ایک کہتے ہیں، اور محمدؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں لیکن ماتھے پر کُفر کا قشقہ لگائے ہوئے ہیں۔ چوں کہ دوسرے تبلیغی مذاہب کی طرح اسلام کی اشاعتِ مذہب کا کام داعیوں کی کسی جماعت کے سپُرد نہیں کیا جاتا بلکہ ہر مُسلمان بجائے خود دعوتِ اسلام کا مرکز ہے اور تبلیغِ دین کر سکتا ہے۔ اسی ایک واقعہ میں باوجُود مُسلمانوں کی بے سروسامانی اور ان کی طرف سے کسی متفقہ اور منتظمہ تبلیغی کوششوں کے نہ ہونے کے اِسلام کی حیرت انگیز ترقی کا راز چھُپا ہُوا ہے۔ لہٰذا اگر مُسلمان تقسیمِ عمل کے زرّیں اصُول پر کاربند ہوں تو وہ بڑی آسانی سے نہ صرف اپنے گھر کی اصلاح کر سکتے ہیں یعنی نام کے مُسلمانوں کو کام کا مسلمان بنا سکتے ہیں۔ بلکہ اقوامِ غیر میں بھی دینِ حق کی

اشاعت کر سکتے ہیں۔
۲۔ اسلام اپنی بقا کے لیے کسی خاص قوم کی دماغی اور جسمانی خصوصیات یا کسی خطے میں ملک کے طبعی احوال کا شرمندۂ احسان نہیں۔ بلکہ اس کی مسلسل، غیر مختتم اور فانی ہستی کی حیاتی قوتوں کا سرچشمہ خود جنابِ باری کی فطرت ہے جس پر اسلام پیدا کیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ مختلف قومیں اور نسلیں مٹ جائیں لیکن وہ اصول جو انسان کی فطرت کا قدرِ مشترک ہے، کبھی نہیں مٹ سکتا۔ گوری اور کالی، لال اور پیلی، ہر رنگ کی نسلیں اسلام کی نام لیوا ہیں۔ لیکن اسلام کا رنگ نہ گورا ہے نہ کالا۔ نہ لال ہے نہ پیلا۔ بلکہ وہ نورانی رنگ ہے جس سے اچھا اور دل کش اور جس سے پیارا رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ پس مبارک ہیں وہ جو اس خدائی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور مبارک ہیں وہ جو اس رنگ میں رنگے جاکر دوسروں کو ہم رنگ بناتے ہیں۔ خدا دینِ محمدؐ کی تائید ہر موقع پر خود کرتا رہا ہے۔ اس نے اسلام کے دوستوں کی ہمیشہ قدر کی ہے اور اسلام کے دشمنوں کو ہمیشہ رسوا کیا ہے۔ اسلام کا اگر بظاہر ماننے والا اگر مخالف قوتوں کی شر انشانیوں سے جل کر راکھ کا ڈھیر بھی ہو گیا تو اسی ڈھیر میں سے خدا کی نصرت نے اسے موسیقار کی طرح نئے پر و بال اور نئی سج دھج کے ساتھ نئے سرے سے پھر پیدا کیا ہے۔"

(۲) "زمیندار" کے چند اہم عنوانات :

(۱) مضامین، جن میں زمین داروں اور زراعت کے متعلق اہم تقریریں اور مضامین درج کیے جاتے تھے۔ (۲) سلسلۂ حکایاتِ دل نشین (۳) نئی تہذیب کے عنوانات۔ (۴) ہم عصر اخبارات پر تبصرے اور تنقید۔ (۵) مختلف اہم مقامی خبریں۔ (۶) مراسلات خصوصی طور پر مجوزہ محمڈن یونی ورسٹی کے متعلق مختلف سربرآوردہ حضرات کے خطوط۔ (۷) منقولات۔ (۸) مختلف قسم کے نوٹس، جو دراصل اداریوں ہی کا حصہ ہوتے تھے۔ (۹) معاشرتی اصلاح پر مضامین۔ (۱۰) اردو کانفرنس یا اردو کے سلسلے میں اہم خبریں اور اردو کے مخالف اخبارات یا لوگوں کے اعتراضات کے جوابات یا پنجابی کو اردو کے مقابلے میں لانے کے سلسلے میں سکھوں کی مساعی کی تردید۔

حصۂ نظم میں خود مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً یکم فروری ۱۹۱۱ء کو اسلامیہ یونی ورسٹی پر ۴۹ اشعار شائع ہوئے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے :

مسلمانوں پہ جو جو سید احمد خاں کے احساں ہیں
منقش فی الحجر سرمایۂ لوحِ دل و جاں ہیں

۲۔ ان کی اپنی نظموں کے علاوہ ان کے معاصرین کی نظمیں یا غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً عزیز مرزا کی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

ہم گزشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائیں گے
آنے والے دَور بھی یونہی گزرتے جائیں گے

یہ تو سوچو دل ہے رسیا مجرمانہ عشق کا
سامنے جائیں گے لیکن ڈرتے ڈرتے جائیں گے

دن قیامت کا معیّن کر نہیں سکتا کوئی
وہ کریں گے ہم سے وعدے ہم مُکرتے جائیں گے

تم نقاب اُلٹو تو دیکھو دیکھنے والوں کا حال
رنگ اُڑتے جائیں گے چہرے اُترتے جائیں گے

دے گئے بیمار کو تسکین اتنا کہہ کے وہ
زندہ ہوتے جائیں جو لوگ مرتے جائیں گے

دَر پہ آئے ہیں تمھارے تم ملو گے یا نہیں
آج جھگڑے عمر بھر کے ختم کر کے جائیں گے

زمین دار کے متفرق نوٹ اپنی جگہ پر بہت اہم ہوتے تھے۔ مثلاً ۱۶ر فروری ۱۹۱۱ء کو "ایک نئی قسم کا درد" کے عنوان سے انھوں نے اردو کی موافقت میں لاہور کے ہم عصر اخبار پنجابی کے خلاف یوں لکھا: "دَردِ دل، دَردِ جگر، دَرد سر اسی طرح بیسیوں درد بہت پُرانے ہیں جو اُس وقت سے لے کر آج تک جبکہ ہمارے جدِ امجد خُلد سے نکلے اور یہ ہماری سرنوشت کی لوح کا طغرا بنے ہوئے ہیں اور ان الم نصیب لوگوں کو جنھیں استاد نے پہلا ہی سبق الف۔ لام۔ میم کا دیا ہو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ بجز ان دردوں کے کوئی اور درد بھی ان کی بے چینی میں اضافہ کرنے کے لیے نہاں خانہ مصائب ہوگا۔ لیکن قربان جائیے لاہوری ہم عصر پنجابی کی جدّتِ طبع اور نوی فکر کے جس نے اخبار نویسی کے علم الامراض کی فہرست کو بقدر ایک بالکل نرالے اور اچھوتے درد کے جس کا نام ہم عصر موصوف نے جبڑے کا درد تجویز کیا ہے، بڑھا دیا ہے۔

اس نئے انکشاف کے متعلّق ہم کو صرف پنجابی کی ۱۱ر فروری کی اشاعت سے یہ کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ جب پنجابی یا بنگالی مُسلمان نے اُردو بولنے کی کوشش کی ہے تو ان کے جبڑے میں درد ہونے لگتا ہے۔ چوں کہ جبڑے کے درد کے پنجابی یا بنگالی مُسلمانوں کا کوئی اسلامی ڈپوٹیشن ایڈیٹر صاحب پنجابی کی خدمت میں چارہ جوئی کی غرض سے حاضر نہیں ہُوا اور کسی بنگالی یا پنجابی مسلمان نے آج تک اس مرض میں مبتلا ہونے کی شکایت پنجابی کے کالموں کے ذریعے نہیں کی گئی اور پنجاب کے ہندوؤں کے جبڑے ابھی تک صحیح سلامت ہیں لہٰذا اس دَرد کی کیفیت سوائے ایڈیٹر صاحب پنجابی کے جبڑے کے اور کسی پر طاری نہیں ہُوئی ہو گی۔ اگر یہ متورّم جبڑا جس میں تعصّب کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں، خالص بھانشا کے کسی ایک مضمون سے علاج پذیر ہو سکتا ہو

تو ناگری کلیہ میں بھرا گیا ہوتا۔ بین الاقوامی ایثارِ نفسی کا تو یہی تقاضا تھا کہ ہم اپنے ہم عصر کے علاج معالجے میں خود بھی حصّہ لیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس علاج سے مَرض کے افاقے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اُردو سے خواہ ہم عصر پنجابی اور اس کے ہم سفیر کے جبڑوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں پھر بھی یہ زبان علی رغم اغیار ہندوستان سے نہیں نکل سکتی۔"

۲۔ حاجی سیّد جماعت علی شاہ نے اِسلامی یُونی وَرسٹی کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔ "زمیندار" میں پیر صاحب کی ان خدمات پر تبصرہ اس طرح کیا گیا: "دینیات کی تعلیم اس نصاب کا جزوِ اعظم ہوگی۔ بلکہ عنصرِ شاہی۔ ہم تو یہاں تک عرض کر سکتے ہیں، سب سے بڑا مقصد یُونی وَرسٹی کا احیاءِ اسلامی ہوگا جس کی تکمیل مُسلمانوں کو اپنی مذہبی روایات اور اپنے اسلام کے ساتھ سچّی محبّت پیدا کر کے ایک زندہ قوم بنا دے گی۔ وہ مُسلمان مُسلمان ہی نہیں جس کے دل میں اسلام کی محبّت نہ ہو اور اسلام کی محبّت اِس لیے نہیں ہو سکتی جب تک کہ مُسلمان قرآن پاک کو اور حضورؐ سرورِ کون و مکان کی مقدس زندگی کو اپنی رُوحانی تکمیل کا معیار قرار دیتے ہوئے اسلام کی سیزدہ سالہ رَوایات کے حوض میں غوطے نہ لگائے۔ ہماری یُونی وَرسٹی مُسلمانوں کے دِل میں اِسلام کی ایسی ہی محبّت پیدا کرنی چاہتی ہے۔ اور اِس لیے بقول سیّد صاحب یُونی وَرسٹی کی تکمیل میں حِصّہ لینا ایک دینی خدمت ہے۔ سیّد صاحب ممدُوح اگر اپنے حلقہ بگوشوں کو فی کس آٹھ آنے بھی اس دِینی کام میں دینے کے لیے ایماء فرمائیں تو دو لاکھ روپیہ پانچ منٹ میں جمع ہو سکتا ہے جب تک کہ ۲۵ ماہِ حال (فروری ۱۹۱۱ء) کو وہ جلسہ ہو جب ہز ہائی نیس آغا خاں تشریف لائیں گے۔"

۳۔ "کیا یہودی مُسلمانوں کے دوست ہیں؟" پیرس کا کروڑ پتی یہودی ایک فرانسیسی عالم طبقات الارض کے ساتھ فلسطین کو آنے والا ہے تاکہ قدیم یہودی بادشاہوں کے مقبروں کا پتہ نکالے۔ در پردہ اس سفر کا مقصد اپنی نوآبادی کو قائم کرنا اور یہودی سلطنت کے بنانے کا ہے۔ اِسی طرح اخبار میں یہ خبر بھی گرم ہے کہ ینگ ٹرکش پارٹی کو یہودیوں سے مدد ملی اور اب وہ آئینی حکومت کے قیام میں مالی مدد دینے کو تیار ہے۔

۴۔ قیصر اور شرع۔ ۲۴ فروری ۱۹۱۱ء

قیصر نے بحری افسروں کو شراب خوری کی مضرتوں سے نکتہ خیز الفاظ میں متنبہ کیا تھا کہ اس ہولناک جنگ میں جو آئندہ واقع ہوگی۔ آپ لوگوں کو بڑے بڑے خوفناک منظروں سے سابقہ پڑے گا۔ جنھیں دیکھ کر کلیجے ہل جائیں گے۔ اس وقت بہت بڑے اطمینانِ قلب کی ضرورت ہوگی۔ اور وہی قوم بازی لے جائے گی جو کم سے کم شراب پیتی ہوگی۔ اور ضرور

ہے کہ وہ قوم تم ہو۔

"زمیندار" نے اس سلسلے میں یہ نوٹ لکھا" کاش کہ ٹرکی جو اسلام کے تصدّق میں اُم الخبائث سے بچا ہُوا ہے، اس ہولناک جنگ کے وقت جس کی طرف قیصر نے اشارہ کیا ہے انگلستان کا حریف بن چکا ہو۔ تاکہ جب جنگ چھڑے تو وہ قیصر کے قول کی عملی طور پر تصدیق کر سکے۔"

۵۔ ریاست پٹیالہ کی وزارت آنریبل نواب ذوالفقار علی خاں کے سپُرد کی گئی۔ زمیندار نے اس پر نوٹ لکھا کہ اُمید ہے کہ نواب صاحب خلیفہ سیّد محمد حسن کی ان شاندار روایات کو قائم رکھیں گے جو ان کی وزارت نے پٹیالے کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں چھوڑی ہے۔

۶۔ ہندی زبان اور سکھ۔ یکم مارچ ۱۹۱۱ء

سِکھوں نے عملاً ہندی زبان اور سنسکرت کی تعلیم کا بائیکاٹ کر دیا ہے (دو سال ہوئے سر چیٹرجی چیف کورٹ جج پنجاب، وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی نے اظہار کیا کہ مدارس کی رواجی زبان کے بجائے پنجابی ذریعۂ تعلیم و تعلّم قرار پائے۔ لیکن گورنر نے صاف صاف اعتراف کیا کہ تعلیم و تعلّم کا اگر کوئی قابلِ اطمینان بلکہ واحد ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ اُردو زبان ہے۔ چیٹرجی نے پنجابی کے متعلق کوششیں شروع کر دیں۔ حالاں کہ آریہ سماجی تحریک کے ایک کثیر الاشاعت اُردو اخبار نے جب ہندی ایڈیشن نکالا تو وہ فیل ہو گیا۔ اگر سر جیمس لاٹوش یہاں کے گورنر نہ ہوتے تو اُردو یہاں سے بھی چلی گئی تھی۔ اس تحریک کا مقصد پنجابی کی ٹٹی کی آڑ میں ہندی شکار کھیلنا ہے۔

۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کالج کو مُسلم یونی ورسٹی بنانے کے سلسلے میں جو قومی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ظفر علی خاں نے اپنے اخبار کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ سر سیّد کی خدمات کا تذکرہ کیا۔ ان کے احسانات جتائے اور ان کی یادگار کو یونی ورسٹی بنانے کے لیے چندے کی اپیلیں بھی کیں۔

ان جلسوں میں شرکت سے (جو مُسلم یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ہوتے تھے) مسلمانوں کے رجحانات کا بھی پورا پتہ چلتا رہا اور ان پر بھی یہ واضح ہو گیا کہ بقول وقار الملک (تقریباً ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۱ء) اب گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا بے کار بات ہے اور اب ہمیں اللہ تعالےٰ کی مدد سے اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اخبار زمیندار نے اسی مقصد کو اپنے اخبار کے ذریعہ سے پُورا کرنے کی کوشش شروع کی۔ مُسلم یُونی ورسٹی کا قیام مُسلمانوں کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے ایک ابتدائی کام تھا۔ اور اس کام کی کامیابی کے

لیے انھوں نے مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے دوروں کا پروگرام ہز ہائی نیس کی تقریر اور مختلف علاقوں میں چندہ دینے والوں کے نام شائع کرکے قوم میں بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں سلطنت عثمانیہ اور اٹلی کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ نے مسلمانوں کے قومی مفاد کو سخت نقصان پہنچایا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی جس کے نتیجہ میں سلطان ترکی کے ہاتھ سے کئی مقبوضات نکل گئے۔ ہندوستان میں علی گڑھ تحریک کی مخالفت بھی اس سبب سے کی گئی کہ اس تحریک نے غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کر دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی مسلمان حکومتوں سے ہمدردیاں بڑھتی چلی گئیں۔ چناں چہ پان اسلام ازم کی رَو پھیل گئی۔ ظفر علی خاں پہلے ہی سے مویدین میں سے تھے اور ان کے حیدر آباد سے نکالے جانے کا یہ باعث قرار دیا گیا تھا کہ وہ اس ریاست کو خود مختار حکومت بنانا چاہتے تھے (جس کی ہم سابق صفحات میں وضاحت کر چکے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں مسلمانوں پر مسجد میں فائرنگ ہوئی اور ۱۹۱۳ء میں مسجد کان پور کے غسل خانے کے انہدام کے سبب فائرنگ نے مسلمانوں میں اضطراب اور بے اعتمادی میں اضافہ کر دیا۔ انھی حالات میں مولانا عبد الباری جیسی مذہبی ہستی نے درس و تدریس کے خاموش اور پُرسکون ماحول سے نکل کر خود کو سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ اور زمیندار نے اس سلسلے میں مسلمانوں کی خوب نمائندگی کی اور گویا وہ قوم کی آواز بن گیا تھا۔

اس اخبار کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً سر امیر علی کی تقریر بحضور ایڈورڈ ہفتم (جس میں انھوں نے ہندوستان کی بے چینی دور کرنے کی تجویز اور اس میں قانون مطابع کی سختیوں کے دور کرنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اسی طرح سر علی محمد کی افتتاحی تقریر جو ستم رسیدہ زمین دار کی فریاد پر مشتمل تھی، یا زمین دار اور اس کی فضول خرچی یا مذہبی جھگڑے پر مشتمل چیزیں شائع ہوئیں)۔

اس اخبار کا ایک حصہ خصوصی طور پر زمین داروں کی سرگرمیوں، زراعتی اور حرفتی اور صنعتی نمائش اور گوجرانوالے میں کلہ بندی کے سلسلے میں جھگڑے پر مشتمل چیزوں کے لیے ہمیشہ وقف رہا، جن کا مقصد زمین داروں کو جدید طریقے پر اپنی حالت کو بہتر بنانا اور ان کی معاشرتی خرابیوں کو دور کرنا اور ان کو زمانے کے حالات سے مطلع کرنا ہوتا تھا۔ اسی اخبار میں سکھوں کی تجویز (متعلق پنجابی) پر (نمبر ۱۴ ایس) اس طرح واضح تبصرہ اور تنقید کی

گئی کہ اس قسم کے محرکین کو زبانِ اردو کا دشمن قرار دیا گیا اور پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے موضوع کی اس مضمون میں دھجیاں اڑائی گئیں۔

اس اخبار نے جدید قانون مطابع کی مختلف دفعات پر مختلف طریقے سے اپنے خیالات کو حکومت تک پہنچایا اور بار بار اس امر پر تنبیہ کی کہ یہ قانون ہندوستان کی بے چینی اور سیاسی شورشوں میں نہ صرف اضافہ کرے گا بلکہ یہ شورشیں منظم بغاوتوں کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہیں۔

حصۂ نظم میں کلام اکبر اور مزاحیہ نظمیں بھی اچھی خاصی شائع ہوتی تھیں۔ ۱۶ فروری کے شمارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی وفات پر قطعہ تاریخ بھی شائع ہوا جو حالی نے کہا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

تاریخِ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا

(وفات ۱۰ محرم ۱۳۲۸ھ)

اس اخبار میں مسلم لیگ کی کارروائیاں اور اس کی تفصیلات بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً سر آغا خاں کے اجلاس مسلم لیگ دہلی کی تقریر بھی تفصیلاً شائع ہوئی۔ اسی طرح مختلف کتابوں اور دواوین پر تبصرے اور ریویو بھی شائع ہوتے۔ مثلاً آصف اللغات، کلامِ فوق، غنچۂ بہار، دیوانِ وحشت اور رسائل میں دلِ گداز، یارِ شاطر، چودھویں صدی، زندہ دل، اور زمانہ کان پور پر بھی ریویو نکلے۔

زمیندار کا اجرا لاہور سے

ہفتہ وار زمیندار، یکم مئی ۱۹۱۱ء سے لاہور سے نکلنے لگا۔ اس سلسلے میں جو کچھ مولانا نے لاہور آنے کے بعد محسوس کیا اس کو اداریہ کی شکل میں خود یوں بیان کیا۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

خدا کا نام لے کر ہم لاہور آ گئے اور ہیرا منڈی میں ایک مکان لے لیا جس کے ایک طرف بادشاہی مسجد ہے، دوسری طرف ایک شوالہ ہے لیکن خدا کا گھر پھر بھی چند قدم کے فاصلے پر ہے اور مہادیو جی کے استھان کی دیوار سے تو غریب خانے کو نسبتِ اشتراک حاصل ہے۔ بادشاہی مسجد کے سر بفلک میناروں کے منظر اور اس کی پنج وقتہ اذان کی صدا کو بلحاظ اتصال مکان و زمان چشم گوش سے پھر بھی ایک طرح کی اعتباری مغائرت

ہے۔ لیکن مہادیو جی کے گھنٹے کی ٹن ٹن، پیپل جی کے پتوں کی زمردی بہار، لنگ جی کی ترشی ہوئی پتھریلی چکنائی تو اندر لوک نگاہ اور بیکنٹھ گوش ہے۔ غرض

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

اللہ میاں اور شیو جی کے ہمسائے بھی پوتر اپنے اپنے رنگ میں کون ہے جو حیران نہ ہوگا۔ لیکن پاس ہی "بٹی" کا غارت گرِ ہوش و عقل محلہ واقع ہے جس کا قرب خوب ہے۔ پنجاب مسلم کلب میں جب میاں محمد شفیع، شیخ محمد اقبال اور مرزا جلال الدین نیز دیگر احباب نے پوچھا کہ مکان کہاں لیا اور ہم نے پتا بتایا تو سب کے سب مسکرا دیے۔ اس معنی خیز تبسم کا جواب ہمارے پاس بھی موجود تھا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جایئو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یکم مئی کا زمیندار لاہور سے نکلتا ہے۔ سب سے خوش آیند تبدیلی ہمارے ناظرین کو اس میں یہ نظر آئے گی کہ یکم کا اخبار مقامی اور قرب و جوار کے ناظرین کو تاریخِ اشاعت سے ایک دن پہلے اور ہندوستان کے دور دراز کے مقامات کے ناظرین کو تاریخ مقررہ پر مل جائے گا۔ اور آئندہ بھی انشا اللہ تعالیٰ پابندیٔ وقت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہے گا۔ اخبار کے مضامین اور اس کی لکھائی چھپائی کے نسبت کچھ لکھنا ہمارا منصب نہیں۔ ان تمام امور کے حسن و قبح کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں لیکن اتنا عرض کیے بغیر ہم نہیں رہیں گے۔ کہ جہاں تک ہمارا بس چلے گا ہم زمیندار کو دل چسپ کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ قیمت اخبار اس وقت تین روپے بارہ آنے سالانہ ہے جس میں محصول ڈاک بھی شامل ہے۔ ہمارے بعض ناظرین جو ہمارے اخبار کی اشاعت کو بے حد بڑھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دلِ سوزانہ ہم دردی کی راہ سے مصر ہیں کہ اس کی قیمت گھٹا دی جائے تاکہ وہ لوگ جنھیں تین روپے بارہ آنے بھی بار ہے اس کو منگا کر پڑھ سکیں۔ اور وہ نظیر میں اخبار "ہندوستان" کو پیش کرتے ہیں کہ جس کی اشاعت بوجہ اس کے کہ سالانہ چندہ ڈھائی روپے ہے، روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ہمارے ان کرم گستروں اور مخلصوں نے شاید دوسرے ان اسباب پر نظر نہیں ڈالی جو ہندوستان اور دوسرے ہندو اخبارات کی کثرتِ اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔ چوں کہ نظیر "ہندوستان" ہی کی دی گئی ہے اس لیے ہم سو بات کی ایک بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اوّل آپ ہمارے لیے بھی کوئی آغا خاں پیدا کر کے ہمارے اخلاقی

اصول میں اتنی تبدیلی پیدا کر دیجیے کہ ہم ہر ہفتہ اپنے کئی کالم اس کے ڈھول کے پول کھولنے میں صَرف کر سکیں اور اس کے بعد مسلمانوں میں وہ عصبیت پیدا کر دیجیے کہ اس کے ڈھول کے پول کا تماشہ دام دے کر خریدنے میں انھیں بصد ذوق و شوق آمادہ کر سکیں۔ اگر دو ہی مہینہ میں ہماری تعدادِ اشاعت بیس ہزار نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ لیکن خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے ایسے طریقے استعمال کریں۔

بہرحال اپنے کرم فرما احباب کے مشورے پر عمل کر کے ہم یہ پاپڑ بھی بیلتے ہیں اور بقدر آٹھ سو روپے سالانہ کے اپنا فوری نقصان گوارہ کر کے آئندہ سے زمیندار کا چندہ تین ۳ روپے سالانہ مقرر کرتے ہیں۔ کیا ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ بارہ آنے کی جو رعایت ہم نے عام ناظرین کے ساتھ کی ہے اس کا معاوضہ ہمیں اس شکل میں عطا فرمایا جائے گا کہ ہر سال اپنے حلقۂ احباب میں سے کم از کم دو خریدار پیدا کر کے ہمیں اس قابل بنا دیں گے کہ زمیندار کو ہم اس سے بھی زیادہ دل چسپ، دیدہ زیب اور مفید طور پر شائع کر سکیں گے۔"

اس طرح "زمیندار" یکم مئی ۱۹۱۱ء سے لاہور سے نکلنا شروع ہوا اور مولانا ظفر علی خاں کی عمدہ تحریروں اور دُنیائے اِسلام کے ساتھ ان کی بے مثال محبت اور معاصر ہندو اخباروں کی صحافتی چوٹوں کا جواب انھوں نے اس زور سے دینا شروع کیا کہ اس اخبار کے ساتھ لوگوں کی توجہ زیادہ ہو گئی۔ اس کے لطیف طنز، چبھتے ہوئے فقرے، پاکیزہ زبان اور پُرزور نظموں نے اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اس لیے اس اخبار میں انھوں نے خصوصیت سے دو چیزوں کا خاص خیال رکھا۔ ایک اِسلام کے وقار کا تحفظ اور اس کے لیے کسی بھی مصلحت کا ساتھ نہ دینا، دوسرے اردو سے بے پناہ محبت اور اس کی ترقی کے لیے علمی اور ادبی مضامین خود بھی لکھنا اور دوسروں کے بھی شائع کرنا اور انھیں نمایاں جگہ دینے کا ان کو ہمیشہ خیال رہا۔ اُن کے اخبار میں "ہندوستان" کی صحافتی چوٹوں کا اس طرح جواب دیا گیا:

معاصر "ہندوستان" نے چوٹ کی تھی کہ ایک زمین دار کو دیہات کی کھلی اور تازہ آب و ہوا موافق نہ آئے مگر لاہور کی آب و ہوا میں اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک زمیندار اگر دیہات کے کھلے سرسبز میدانوں میں رہ کر تن دُرست نہیں رہ سکتا تو ظاہر ہے کہ لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ اگرچہ لوکل اخبار برادری میں زمیندار کا نقلِ مکان کرنا ایک ممتاز اضافہ تو ہو گا لیکن اسے مبارک باد کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر واقعی کوئی تسلی بخش پہلو ہے تو صرف یہی کہ وزیر آباد کے پیچھے ایک بڑی بھاری بلا۔ مجھے

پنجابی لفظ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے" اڑ گئی ہے۔ اور اب اُمید کرنے کی گنجائش ہے کہ وزیر آباد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے بشرطیکہ زمیندار وزیر آباد کے معاملات کا پیچھا چھوڑ دے"

مولانا نے اس کا جواب مختصراً یہ دیا کہ مسلمانوں کا مذہب تو انھیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے پھر ہم قید کاٹنے سے کیوں گھبرائیں۔

(۲) اسی طرح ایک مسلمان ممبر (مشرقی بنگال و آسام کی کونسل) نے جب یہ سوال کیا تھا کہ کیا سرکار مسلمان طلبا کی تعلیم کے لیے مناسب تعداد میں مسلمان استاد مقرر کرے گی اور گورنمنٹ نے یہ کہا تھا کہ وہ خود مسلمان اساتذہ مقرر کرنے کی فکر میں ہے، تو معاصر ہندوستان نے غصہ میں آکر سوال کیا کہ ہندو استاد ہندو طلبہ کو ایسا کون سا علم پڑھاتے ہیں جو وہ مسلمان طلبا سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور یہ کہنا کہ ہندو استاد ہندو طلبا کو عالم بناتے ہیں اور مسلمان طلبا کو جاہل رکھتے ہیں، بڑا ہی افسوس ناک اور متعصبانہ دعویٰ ہے۔

"زمیندار" کا نوٹ:

ہم بھی مانتے ہیں کہ یہ بڑا ہی افسوس ناک اور متعصبانہ دعویٰ ہے لیکن ہم ممنون ہوں گے اگر معاصر "ہندوستان" اپنی اشاعت مورخہ ۲۱ مارچ کے صفحہ ۲۳ کی حسب ذیل عبارت پر غور فرما کر اطلاع دیں گے کہ جو دعویٰ اُس میں کیا گیا ہے اُس کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟

"ہندو بچوں کو مسلمان اُستادوں سے بچانے کی سخت ضرورت ہے! افسوس ہے ہندو جاتی کی عقل پر جو اپنے سب بزرگوں اور ودوان برہمنوں کو چھوڑ کر ایک مسلمان بچوں کا گروہ بن جاتی ہے۔ اور شرم ہے اس برہمن پر، جو ایک ہندو بچے کو ایک مسلمان کے حوالے کرتا ہے۔"

(۳) اِسی طرح بیساکھی کے میلے میں ذلیل و ناپاک حالت کی طرف توجہ دلائی۔

"بیساکھی کے میلے کی ذلیل اور ناپاک حالت کی طرف جو لوگوں کی خرابیٔ اخلاق میں کچھ کم حصّہ نہیں لے رہی ہے، ہم خصوصیت کے ساتھ ہندو پریس اور ہندو مصلحانِ قوم کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ اس میلے کو بدقسمتی سے جاہل مسلمان بھی اپنا قومی تہوار سمجھنے لگ گئے ہیں، اور ہر سال ہزاروں لاکھوں مسلمان اس دن دیہات سے آکر ان ناکردنی اور ناشدنی افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جو تہذیب انسانیت کے ماتھے پر بمنزلہ کلنک کے ٹیکے کے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال مسلمانوں کو بیساکھی میں حصّہ لینے سے پوری قوت کے ساتھ روکیں اور علماء و واعظین سے اس کام میں مدد لیں مگر

مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم پر ہمارے دوست حسبِ معمول جھٹ ہندوؤں کو بائیکاٹ کرنے کا الزام لگا دیں گے۔ اس لیے ہم اپنے روشن خیال ہندو ہم وطنوں کی صلاحیت طلبی اور تہذیب پسندی کے حاسہ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس بہت بڑی سوشل خرابی کی اصلاح سے ہم کو ممنون کریں۔"

(۳) اقبال نے انجمن شبابُ المسلمین کے اجلاس میں ایک نظم پڑھی تھی : ع

مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

"ہندوستان" لاہور نے اس کے جواب میں رعنا نامی ایک مسلمان شاعر، غالباً جو کہ ایک فرضی نام ہے، کے نام سے ۱۴ اپریل کے ایڈیشن میں ایک نظم شائع کی۔

دعویٰ غلط تمھارا عربستان ہے تمھارا

ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا

مذہب میں سب سے اوّل دنیا میں تھا ہمارا

تاریخ میں ہر اول نام و نشاں ہمارا

یعنی جناب رعنا باوجود ادعائے مسلمانی اس عقیدہ کو دل میں جگہ دیے ہوئے ہیں کہ آپ کا مذہب وہ مذہب نہیں ہے کہ جس کی عمر سوا تیرہ سو سال ہے، بلکہ وہ مذہب ہے جس کا ظہور دُنیا میں اوّل اوّل ہُوا۔ یعنی وید مذہب۔

اگر اسلام ہمیں است کہ رعنا دارد

وائے اگر از پسِ امروز بود فردائے

کیا اچھا ہوتا کہ ہم عصر "ہندوستان" جناب رعنا کی شخصیت کے چہرے پر ایک ہندوستانی مُسلمان کی نقاب ڈالنے ہی پر اکتفا کرتا بلکہ جناب ممدُوح کے نام نامی اور اسم سامی کو بھی شائع کر دیتا تاکہ ہم ایسے مقدس بزرگ کی زیارت سے بھی فیض یاب ہو سکتے۔

(۴) اسی طرح زمیندار نے عام معاشرتی حالات کو دُرست کرنے کے لئے مختصر نوٹ، اداریے اور نظمیں بھی لکھیں اور یہ سب کی سب یا اکثر و بیشتر مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک اشاعت میں اس عنوان سے نوٹ لکھا :

"سامان مہنگا اور تنخواہیں قلیل۔"

ہماری رائے میں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ پنجاب میں ایک سو روپے تک مشاہرہ یا ملازموں کی تنخواہوں میں تقریباً ۳۵ فی صدی کے حساب سے سرکاری اضافہ کر دیا جائے تاکہ ادنٰے اور متوسط درجہ کے سرکار کے عمّال عزّت آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں لیکن

یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ بجٹ میں گنجائش جب اس اضافہ کے لیے رکھی جائے گی تو اس کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ اگر پروونشل مداخل کی عام سالانہ بچت اس مد میں خرچ کرنے کے لیے کافی ہو تو ہم گورنمنٹ کی مآل اندیشی اور انصاف پسندی سے یہ اُمید نہیں رکھ سکتے کہ غریب زمین داروں پر جن کا زمانے کے ہاتھوں پہلے ہی کچومر نکل رہا ہے، اس خرچ کے لیے مزید بوجھ ڈالا جائے یا کوئی دوسری ایسی سبیل نکالی جائے جسے ہم گورنمنٹ کے فائیننشل سلیقہ پر چھوڑتے ہیں۔"

اِسی طرح پنجاب گورنمنٹ کے حکم سے فیس مدارس بڑھ جانے کے سلسلے میں زمیندار نے نظم اور نثر میں بے حد احتجاج کیا اور نظم میں " دل نشیں نکتے " کے عنوان سے ایک نفیس نظم لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

بہت آج کل ہیں گراں نرخِ علم — ہیں اشراف انیس اور اجلاف بیس
نہیں شوق امیروں کو تعلیم کا — غریبوں کو ملتی نہیں آہ فیس
گورنمنٹِ پنجاب کے حکم سے — بڑھا دی گئی ہے مدارس کی فیس
نہ تعلیم اب پا سکیں گے عوام — جہالت[3] غریبوں کو ڈالے گی پیس
ہے لڑکا زمین دار کا پا بگل — کرے گا کیا وہ بنیے کے بیٹے کی ریس
بڑا ہو کے چٹخائے گا جوتیاں — بنے گا کسی ناسزا کا شئیس
جسے آپ کہتے ہیں ہندی زبان — حقیقت میں وہ ریختہ ہے سلیس
کنی ان کو ہیرے کی کھانے کو دو — جو ہیرے کو سمجھیں ہیں ہیرا کسیس

مٹے وہ زباں مٹنے سے کہاں
کیے جس نے پیدا ہوں داغ و انیس

حواشی

۱۔ چودھری غلام حیدر: زمیندار کا اجرائ اور اس کے مقاصد، زمیندار لاہور، گولڈن جوبلی نمبر ص۔ ۵

۲۔ ظفر علی خاں: اداریہ دکن ریویو، حیدر آباد دکن، مارچ۔ اپریل ۱۹۰۸ء۔

روزنامہ زمیندار

۱۹۱۱ء کا سال عموماً مسلمانوں کے لیے اور خصوصاً بنیائے اِسلام کے لیے عظیم مصیبتوں کا سال تھا۔ اٹلی نے یورپ کے اشارہ پر طرابلس میں لڑائی شروع کردی اور اپنی فوجیں اتار کر ترکی کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی ۱۹ ستمبر ۱۹۱۱ء سے شروع ہوئی اور اخبارات کے ذریعے اطالیوں کی عظیم المثال سفاکی کی خبریں عربی اخبارات کے ذریعے سے آنی شروع ہو گیئں اور مصر کے اخبارات "اللواء الجریدہ" اور "الاہرام" سے جنگ کی تازہ خبریں پہنچنی شروع ہو گیئں۔ مصر پر برطانوی حکومت کا قبضہ تھا اس لیے انگریز نے وہاں سے ترکی بیڑے اور فوج کو طرابلس جانے کی اجازت نہیں دی جس کے نتیجے میں طرابلس میں مقیم ترکی فوج محصور ہو گئی اور طرابلس کے مسلمانوں کو سخت ترین نقصانات اُٹھانے پڑے۔ دوسری طرف ایران پر روس اور برطانیہ کی خاص توجہ ہو گئی اور انھوں نے ایک خفیہ معاہدے کے تحت شمالی اور جنوبی ایران کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سر اڈورڈ گرے وزیرِ خارجہ برطانیہ نے اس سلسلے میں بے حد مسلمان دشمنی سے کام لیا۔

مولانا ظفر علی خاں کے لیے یہ سب اُمورِ بحیثیت مسلمان کے ناقابلِ برداشت تھے، قلم ان کے ہاتھ میں تھا، خطابت کے وہ بادشاہ تھے۔ راجپوتی خون جوش مارنے لگا۔ اِسلام کی نمائندگی کرنے اور مسلمانوں کی مدد کے لیے انھوں نے ایک طرف ان کے دردناک حالات چھاپے۔ برطانوی خارجہ پالیسی کے پرزے اُڑائے۔ دوسری طرف یورپی سیاست کو طشت از بام کیا، اور اپنے اداریوں کے ذریعہ مغربی سیاست کے راز فاش کر دیے۔ اور انگریزی صحافت کے نقطہ نظر کو پیش کر کے ان کی معاندانہ روش کو دُنیا کے سامنے تو نہیں البتہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے نہایت جرأت آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا، اور انھوں نے اس سلسلے میں قانونِ مطابع کی سختی کی کوئی پروانہ کی اور اپنے خاراشگاف قلم سے ایسے واقعات پیش کیے جن سے انگریزی حکومت

کے خلاف مسلمانوں کے دل میں سخت ترین نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اور ان کی شام کے وقت آتش بیاں تقریروں نے گویا ایک آگ سی لگا دی۔ دن میں لوگ ان کے اداریے پڑھتے۔ ان کی نظمیں لوگوں کے دلوں کو برماتیں اور شام کو ان کی پُرجوش تقریریں دلوں کو گرماتیں۔ انھی اسباب نے زمیندار کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اور مولانا ظفر علی خاں کے پُرجوش اندازِ بیان نے اس اخبار کو اتنا دلپسند اور مقبول بنا دیا کہ انھیں آخرکار اسے روزانہ کر دینا پڑا۔ چناں چہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۱ء سے زمیندار روزانہ ایڈیشن میں شائع ہونے لگا۔ یہ پہلا مسلمان اخبار تھا جس نے رائیٹر سے براہِ راست خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔

اداریے

ذیل میں ہم ان کے ان اداریوں کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے روزانہ زمیندار میں لکھے:

(۱) دُنیائے اسلام کے تین مرکز۔ (۱) مکہ قلبِ اسلام۔ (۲) قسطنطنیہ۔ ید اسلام۔ (۳) قاہرہ۔ دماغ اسلام۔

(۲) اتحاد ثلاثہ کا خاتمہ ۔ ۔ ۔ ۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء

(۳) اٹلی کی حالت زار ۔ ۔ ۔ ۷ر دسمبر ۱۹۱۱ء

(۴) ایران کی خود مختاری و آزادی ۔ ۔ ۔ ۸ر دسمبر ۱۹۱۱ء

(۵) انصاف اور ایمان کی آواز

(۶) رُوس کی پولیٹیکل روش

(۷) دیکھئے اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ (مسلمانوں کے قتل عام پر)

(۸) سر اڈورڈ گرے کے کارنامے۔ ایران میں (۱) ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۱ء

(۹) سر اڈورڈ گرے کے کارنامے۔ مصر میں (۲) ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء

(۱۰) سر اڈورڈ گرے کے کارنامے۔ مصر میں (۳)

(۱۱) سر اڈورڈ گرے کے کارنامے۔ ترکی میں (۴)

(۱۲) سر اڈورڈ گرے کے کارنامے۔ ایران کے متعلق (۵)

(۱۳) کسی کے گھر میں خوشی ہے کسی گھر میں ماتم ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۱ء

۱۹۱۲ء

(۱۴) معاہدۂ رُوس و انگلستان کے پُرزے۔ ۸ر جنوری

(۱۵) یورپ اور دُنیائے اسلام (سر ہنری جانسٹن کی گستاخیاں حضورؐ کے لیے) ۱۶ جنوری۔
(۱۶) یورپ اور دُنیائے اسلام (یومِ کرسمس پر ظلم و ستم) ۲۴ جنوری۔
(۱۷) یورپ اور دُنیائے اسلام۔ (نقلِ کفر)
(۱۸) 〃 〃 〃
(۱۹) 〃 〃 〃
(۲۰) 〃 〃 〃

فروری ۱۹۱۲ء

(۲۱) مسلمانوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کوشش۔
(۲۲) کھلی چھٹی بحضور لارڈ کرزن
(۲۳) زبردست مارے اور رونے نہ دے۔
(۲۴) "وکیل" کا ماتم۔ (شیخ غلام محمد کے انتقال پر)۔
(۲۵) سر اڈورڈ گرے کی آنکھوں کے لیے رُوسی سُرمہ۔
(۲۶) ایک مبسوط اور مستند سیرت النبیؐ کی ضرورت (شبلی کے قلم سے)۔

جنوری ۱۹۱۳ء

(۲۷) مسلم لیگ کے کارنامے۔
(۲۸) پیسے کے نقش (پیسہ اخبار پر تنقید)۔
(۲۹) لیڈر اور لیڈرگر۔
(۳۰) بارھویں صدی کی مسیحی تہذیب۔
(۳۱) مسٹر محمد علی ایڈیٹر "کامریڈ" کی تقریر (اداریہ کی شکل میں)

ستمبر ۱۹۱۴ء

(۳۲) قرآن کی نسبت یورپ کا فیصلہ۔
(۳۳) دولتِ عثمانیہ اور انگلستان کے اخبارات (۱) برمنگھم پوسٹ۔
(۳۴) 〃 〃 〃 〃 (۲) ڈیلی کرانیکل
(۳۵) 〃 〃 〃 〃 (۳) آبزرور
(۳۶) 〃 〃 〃 〃 (۴) ڈیلی ایکسپریس
(۳۷) 〃 〃 〃 〃 (۵) انگلستان کے اخبارات
(۳۸) ہندو مسلم تعلقات (۱)

(۳۹) ہندو مسلم تعلقات (۲)

(۴۰) ہندو مسلم تعلقات (۳)

اکتوبر ۱۹۱۴ء

(۴۱) دولتِ عالیہ آصفیہ حیدرآباد

(۴۲) تیرِ نیم کش —— اسی ہفتے میں چار بار۔ (چار اخباروں کی ضبطی)۔

(۴۳) شِبلی —— آفتابِ عالم غروب ہوگیا۔

(۴۴) یک نہ شُد دو شُد (دو بھائیوں، مولانا محمد علی و شوکت علی کی نظر بندی)۔

(۴۵) پھر ورَدِزہ اُٹھا (محبوب عالم کے خلاف)

صحافتی برادری

(۱) مولانا ظفر علی خاں نے بحیثیت مدیرِ زمیندار جہاں ہندو اخباروں کی تنگ نظری اور ان کے مسلمانوں پر بے جا اعتراضات کے جرأت آمیز جواب دیے، وہاں انھوں نے معاصر مسلم صحافت کی خدمات کا اعتراف بھی کیا اور ان اخبارات پر اچھے انداز میں تبصرے بھی کیے۔ مثلاً مولانا محمد علی کے کامریڈ کے اجرا پر (جو ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو ۲۰ صفحے کی ضخامت کے ساتھ شائع ہوا) انھوں نے ڈیڑھ کالمی تبصرہ شائع کیا اور یہ لکھا:

"ان کی فضیلت کا پایہ اس سے بھی اُونچا ہے اور تھا، جتنا ہم سمجھے ہوئے تھے اِس اخبار کا ہر صفحہ اصابتِ رائے اور حسنِ انشا کا مرقع ہے۔ ہر سطر میں ان کے قلمِ جادو رقم نے ادب کے موتی پرو دیے ہیں۔ کوئی مقام ایسا نہیں جو حشو و زوائد سمجھا جا سکے۔ اگر اس کا ہر نمبر اسی آب و تاب سے نکلتا رہا اور اس کے صفحوں پر فاضل نکتہ رس ایڈیٹر کا گوہر بار قلم معنی کے موتی یونہی برساتا رہا تو وہ دن دُور نہیں کہ ہندوستان میں یہ اخبار اپنی نظیر آپ ہوگا۔"

"مسلمانانِ ہند کی قومی ضرورتوں کی فہرست میں ایک ایسے انگریزی اخبار کا اجرا مدت سے متقاضی تھا جو ان کی سیاسی، اقتصادی، تمدنی، مذہبی، ادبی اور بین الاقوامی آرزوؤں کا ترجمان بن کر ملک کے سربر آوردہ اخباروں کی صفِ اوّل میں جگہ پا سکے۔ اس قسم کے اخبار کی ایڈیٹری کے لیے ہندوستان بھر میں اگر کوئی شخص موزوں ہو سکتا تھا تو وہ مسٹر محمد علی تھے۔ ہمارے عزیز دوست محمد علی علی گڑھ و آکسفورڈ کے جان فزا چشموں سے اپنا کام و دہن تر کر چکے ہیں۔ اور وہ ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کے دماغ کو لٹریچر کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ مبدا فیاض نے ان کے قلم کو روانی کے ساتھ بلاغت

کا جوہر عطا کیا ہے اور انگریزی انشا پردازی کے فن میں جو عالی دست گاہ انھیں حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ٹائمز آف انڈیا جیسے اخبار ان کے مضامین کو خوشی کے ساتھ اپنے لیڈنگ کالموں میں جگہ دیتے ہیں۔

۱۳ر جنوری ۱۹۱۲ء سے اس کا پہلا نمبر شائع ہوا جس کا ترجمہ الرفیق کیا جا سکتا ہے۔ اور بالفعل بڑی تختی کے بیس صفحوں پر دیدہ زیب چھپائی کے ساتھ دبیز ولایتی کاغذ پر ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ بہت جلد ترقی کر کے ہفتہ وار سے روزانہ ہو جائے گا۔"

(۲) دوسرے اخبار پر تبصرہ:

اسی طرح مسلم گزٹ پر تبصرہ ان الفاظ میں شائع ہوا "ہندوستان میں اخبار علمی اور اخلاقی اور ملکی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر نہیں نکالے جاتے بلکہ معمولی قابلیت کے اخبار نویس اس کو اپنی تجارت اور روزی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی اخباری مخلوق نے اپنے اوضاع، اطوار اور اخلاق میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں کی بے اصول اخبار نویسی نے ہر قوم میں بہت سے فرقے پیدا کر دیے۔ اور قومی مسائل پر بحث کرنا شروع کر دیا۔ اسی احساس سے بیدار ہو کر لکھنو کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ۱۴ر جنوری ۱۹۱۲ء سے مسلم گزٹ جاری کیا ہے جس کے ایڈیٹر وحید الدین سلیم ہیں۔ اردو میں اس وقت اتنی بڑی تختی کا کوئی اخبار نہیں۔

(۳) زمیندار نے شیخ غلام محمد مالک اخبار "وکیل" کے ۴ر فروری ۱۹۱۲ء کو انتقال پانے پر ایک زبردست اداریہ لکھا اور مرحوم کی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ مولانا نے لکھا "وہ ایک خاص دل و دماغ اور انوکھی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ ان کے دل میں قوم کا سچا درد تھا۔ وہ جیتے جی فنا فی القوم کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے اور مبالغہ نہ ہوگا کہ آخر میں قوم کا غم ان کے جگر میں پھوڑے کی صورت اختیار کر کے ان کی معدومیت کا باعث ہو گیا۔"

اسی طرح انھوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ بھی کہا کہ "ان کی وفات سے مسلمانوں کے دل پر کارپردازانِ قضا کے ہاتھوں جو چرکا لگا۔ جو جاہ کے طالب نہ تھے۔ اخبار وکیل ان کے ذوقِ سلیم کا نمونہ ہے۔ انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اور سرسید کو اس سلسلے میں لکھا بھی تھا۔"

مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ شیخ صاحب نے ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ایڈیٹر

کی کرسی جس جگہ رکھی جاتی ہے یا رکھی ہوتی ہے وہ دنیا کے تمام واقعات سے اونچی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایڈیٹر اس کرسی پر بیٹھ کر گورنر جنرل اور مختلف اقوام کے افراد پر نکتہ چینی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی جماعت کا طرف دار نہ بنائے۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخلاقی کوڑا ہونا چاہیے جو بوقتِ ضرورت دوست اور دشمن کی پیٹھ پر بیک وقت پھٹکارا جانا چاہیے۔

(۴) اسی دور میں مولانا کے قلم سے ہندوستان کے مشاہیر اور مسلمانوں کے نام ور افراد کے سانحاتِ انتقال پر ان کی اعلیٰ خدمات کے سبب ایسے صحافتی ادب کے نوٹ شائع ہوئے اور اداریے لکھے گئے جن کے سبب ان مشاہیر کے کارناموں کی تفصیل دور دراز کے عوام کے کانوں تک پہنچی اور ان کی روشن خدمات کا تذکرہ ان لوگوں نے بھی اچھی طرح سن لیا جو شہری آبادی سے دور تھے یا جنھیں ملک کے واقعات کا اپنی روزانہ ذمہ داریوں کے سبب کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔ جن نام ور لوگوں کے انتقال پر انھوں نے خصوصیت سے طویل اداریے لکھے یا مختصر، ان میں مولوی عزیز مرزا، شمس العلما سید علی بلگرامی، مولوی محمد حسین آزاد، علامہ شمس العلما شبلی، شیخ غلام محمد مالک وکیل امرت سر، مولانا الطاف حسین حالی اور ظہیر دہلوی شامل ہیں۔ مولوی عزیز مرزا اور شبلی نعمانی کا تو بے انتہا خصوصیت سے ذکر کیا اور شبلی کے انتقال پر ایک زبردست ماتمی اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا "آفتابِ علم غروب ہو گیا"۔ اس اداریہ کی ابتدا اس آیت سے کی: اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت۔ ظفر علی خاں نے مولانا شبلی کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سیاسیات میں مرحوم کی آزادی یادگار رہے گی۔ مسلم گزٹ میں مسلمان کی پولیٹکس پر تین نمبر لکھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا نظام بدل گیا۔ ان کی ولولہ انگیز نظمیں کشاف اور وصاف کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ سیاسی بیداری میں سب سے بڑی محرک ان کی یہی نظمیں تھیں۔ وقائع فاجعہ طرابلس، محارباتِ بلقان، ہنگامۂ کان پور پر ان کی معرکۃ الآرا نظمیں شائع ہوئیں۔ ان کے ایک ایک شعر سے رفتارِ زمانہ میں انقلاب آ جاتا تھا۔ قومی معاملات میں ان کی راست بازی حرفِ آخر تھی۔ مسلم یونی ورسٹی کے معاملات پر ان کا ہر شعر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ندوۃ العلما میں مشغولیت، قومی مسائل میں احتساب، غرض ان کی زندگی مختلف حیثیتوں سے جامع تھی اور مکمل ترین منبعِ انوار تھی۔"

(۵) اس اخبار کی ایک اور خصوصیت طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کی خبریں

اداریے لکھے۔ یہ اداریے ہمارے ادب میں سیاسی اور تمدنی تعلقات کے لحاظ سے آج بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان اداریوں میں انھوں نے تاریخ و سیاست کے بہت سے اہم گوشوں پر قلم اٹھایا۔ اسی کی بدولت ہمارا اردو ادب بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر بھی ایک قابلِ قدر ذخیرے کا مالک ہو گیا اور پھر لطف یہ ہے کہ ان اداریوں کی زبان اس قدر صاف، آسان اور سلیس ہوتی تھی کہ ایک متوسط درجے کا پڑھا لکھا آدمی ان تمام مسائل کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ سیاست اور تاریخ کے خشک موضوع کو انھوں نے اپنے ادب کی چاشنی سے اور صحافتی نکات سے اتنا پُر لطف بنا دیا کہ پڑھنے والوں کو زبان کے لطف کے لحاظ سے بھی ان اداریوں میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ زبان کے مٹھے محاوروں کو انھوں نے بے تکان اپنے اداریوں، تبصروں اور مختصر نوٹ میں استعمال کیا۔ اس طرح ان اداریوں کے ذریعے انھوں نے برطانوی استعمار سے براہِ راست ٹکر لی اور اسلامی ممالک میں ترکی اور ایران پر روس و برطانیہ کے سیاسی دباؤ اور ان کی مسلم کش پالیسی پر مسلسل مضامین اور اداریے لکھے۔

(۶) اسی کے ساتھ اس اخبار نے ملک کی سیاست میں اغیار کی ریشہ دوانیوں اور ان کے سدِباب پر، مسلمانوں پر ظلم و ستم اور کلکتہ اور کان پور میں مسلمانوں پر فائرنگ کے اندوہ ناک حادثوں پر زبردست اداریے لکھے۔ اسی طرح مولانا محمد علی اور شوکت علی کی نظربندی پر دو بھائیوں کی نظربندی کے عنوان سے پُر زور اداریہ لکھا۔

(۷) انھوں نے اپنی نظموں میں طرابلس اور بلقان میں برطانوی اندازِ سیاست پر سخت تنقید کی اور گہرے وار کیے۔ ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری، شبلی کی سیاسی نظموں کا نقش ثانی تھی۔ ان نظموں میں سیاسی واقعات پر عموماً تبصرے بھی ہیں اور سیاسی چوٹیں بھی ہیں۔ یہ نظمیں صحافتی انداز کے باوجود تناگہ اِطنز اور ادبی ذوق کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں کہ آج بھی ان نظموں کی ادبی اہمیت کسی طرح سے کم نہیں ہے اور ہنگامی اور وقتی ہونے کے باوجود ان نظموں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اور اسلوب کی جو مرصع کاری ہے وہ اپنی جگہ آپ اپنی مثال ہے۔

(۹) مولانا نے قانونِ مطابع کے خلاف اور اخبارات کی آزادی سلب کیے جانے کے

خلاف مسلسل اداریے لکھے جس میں ایک اہم اداریہ قانونِ مطابع پر اس عنوان سے تھا۔
"اس شمشیرِ دو دَم کے لیے نیام کی ضرورت ہے۔" یہ اداریہ دو طویل قسطوں میں نکلا اور جن
جن اخبارات کا گلا گھونٹا گیا تھا، ان تمام اخبارات (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم) کا تذکرہ
اپنے اس طویل اداریے میں کیا۔

مولانا ظفر علی خان کی سیاسی شاعری کے چند نمونے:

۱۹۱۲ء

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے
بدن کو دیتی ہے رُوح دھمکی کہ آگیا وقتِ جان کنی ہے
سمجھ رہے ہیں یہ اہلِ یورپ کہ ہم مسلماں کو لوٹ لیں گے
کہ اس میں کس بَل نہیں ہے کل کا، وہ آج کم زور و مُنحنی ہے
بتا رہی ہے دراز دستی اطالیہ کی طرابلس پہ
کہ آج کشور کشا وہی ہے جسے ذرا مشقِ رہزنی ہے
ہُوا ہے ایماں جہاں سے رخصت، اٹھا ہے انصاف کا جنازہ
جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی تو یورپ کی روشنی ہے

۱۹۱۲ء - جنگِ طرابلس

ناتواں وقفِ لکد کوبِ توانا ہو گئے
چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو نگلے جاتے ہیں نہنگ
کیا اسی شائستگی پر ہے مسیحیت کو فخر
کیا یہی تہذیب ہے سرمایۂ نازِ فرنگ
مدعا یہ ہے کہ مٹ جائے مسلمانوں کا نام
واسطے اِس کے تراشے جا رہے ہیں عُذر لنگ
جھونک دی اٹلی نے چشمِ روشنِ ایماں میں خاک
چڑھ گیا آئینۂ انصاف پر یورپ میں زنگ

۱۹۱۳ء - سَر اڈورڈ گرے، وزیر صیغۂ خارجہ برطانیہ (کی شان میں)

خوب جی بھر کے سَر اڈورڈ گرے دیکھ چکے
ہم غریبوں کے سیہ خانے کا ویراں ہونا
برقِ تثلیث کا توحید کے گھر پر گرنا
ظلمتِ کُفر میں ایمان کا پنہاں ہونا
خاک کا درنہ و طبروق کے سر پر اُڑنا
خُون میں مشہد و تبریز کا غلطاں ہونا

مصر کے سینۂ صد چاک کے پُرزے اُڑنا — ہند کے دیدۂ نم ناک کا طوفاں ہونا
صفِ ماتم اُدھر ایران کے اندر بچھنا — اور مراکش میں اُدھر حشر کا ساماں ہونا
خانقاہوں میں مشائخ کا گھسیٹا جانا — اور مساجد میں صلیبوں کا نمایاں ہونا
کبھی جن پردہ نشینوں کا نہ اُٹھا تھا نقاب — اُن کے ناموس کا بازار میں عریاں ہونا
یوں تبہ کر کے ہمیں آپ کو اب ہے منظور — جنگ کو روکنا اور صلح کا خواہاں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس طرح زمیندار کے مقالات اور اُن کی نظموں نے مُلک میں ایک سرے سے دُوسرے سرے تک ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ انھوں نے اپنے زبان اور قلم میں ہم آہنگی پیدا کر کے مسلمانوں کو مغربی استعمار پرستوں اور ترکوں کی حمایت میں صف آرا کر دیا۔ اِسی کا نتیجہ تھا کہ زمیندار کے ذریعے کئی لاکھ روپے ترکی فنڈ اور طرابلس فنڈ میں جمع ہو گئے۔ اور ۱۹۱۲ء کے آخر میں وہ خود اس رقم کو سُلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے قسطنطنیہ چلے گئے۔ ان کی ان تحریکات کے نتیجہ میں زمیندار پر آفتیں ٹوٹ پڑیں اور اس اخبار کی پہلی ضمانت ۱۹۱۱ء کے آخر میں ضبط ہو گئی۔ (جس کی تفصیل ہم قانونِ مطابع اور ضبطی کے باب میں الگ بیان کریں گے)۔ اسی درمیان میں ایک اور اہم واقعہ ہُوا کہ جب وہ قانون مطابع کی تنسیخ کے لیے لندن میں پارلیمنٹ کے ممبران سے مل رہے تھے تو انھوں نے وہاں سے لندن کے حالات پر ایک اداریہ لکھ کر بھیجا جس کا عنوان یہ تھا،

"چار چیز است تحفۂ لندن[1]
خمرو خنزیر و روز نامہ و زن"

اس افتتاحیہ کا شائع ہونا تھا کہ دوبارہ ضمانت ضبط ہو گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ وہ ۱۹۱۲ء کے آخر میں لندن و قسطنطنیہ گئے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ان کی واپسی ہُوئی اور جب کسی ذریعہ سے یہ پتہ چلا کہ گورنمنٹ ان کے قسطنطنیہ کے دورے اور اس طریقۂ کار سے سخت ناراض ہے اور ممکن ہے کہ وہ عن قریب گرفتار کر لیے جائیں، تو نہایت خاموشی سے دوبارہ لندن چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۹۱۴ء میں (ماہ اکتوبر میں) واپس آئے تو ان کی گرفتاری کے سامان ہو چکے تھے۔ اور ماہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں ان کو نظر بند کر کے ان کے وطن کرم آباد بھیج دیا گیا۔ یہ نظر بندی دسمبر ۱۹۱۹ء تک رہی۔ ان کی نظر بندی کے دوران زمیندار دوسرے ایڈیٹروں کے ہاتھوں نکلتا رہا۔ لیکن آخر تابہ کے، حالات سے مجبور ہو

کر ان کی بیگم نے ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء کو یہ اخبار بند کر دیا۔ اُس زمانے میں مولانا عبداللہ عمادی اور وجاہت حسین زمیندار مرتب کرتے تھے۔

"زمیندار" کے دُوسرے شعرا:

زمیندار کے اس دوَر (۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۰ء تک) میں جن صاحبان اور جن شعرا نے زمین دار کی ادبی معاونت کی اور اپنی نظمیں اور غزلیں اس اخبار میں شائع کرائیں۔ ان میں سے چند قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں۔ (۱) مولوی فضلِ حق آزاد بانکی پور۔ (۲) مولوی وجاہت حسین اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار۔ (۳) محمد شمس الدین شائق (۴) لسان العصر اکبر الہ آبادی (۵) حالی (۶) طالب بنارسی (۷) خواجہ دِل محمد (۸) دلو رام کوثری عصار (۹) خان بہادر محمد حسین شوق ڈپٹی کلکٹر میرٹھ (۱۰) حاذق رام پوری (۱۱) حکیم فیروز الدین طغرائی (۱۲) شفق عماد پوری وغیرہ۔

اتنے صاحبان نے اپنے گراں قدر اور پُرلطف کلام سے زمیندار کے ادبی مذاق کو بلند کرنے میں مولانا ظفر علی کا ساتھ دیا، بلکہ خود مولانا ظفر علی کی کوششوں اور ان کی نقادانہ صلاحیتوں کی وجہ سے زمیندار کو ایسے اچھے اور نام وَر شعرا ملے جس کی وجہ سے اس اخبار کا معیار ادبی لحاظ سے بلند ہو گیا۔ ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند شعر درج کرتے ہیں۔

(۱) کلامِ اکبر۔

گلے پہ پھیرتے ہیں تیغ معذرت کے ساتھ — خدا کے فضل سے عادت ہے دِل نوازی کی
کچھ غم نہیں اگر مَیں مایوس ہو گیا ہوں — اس یاد سے بہت کچھ مانوس ہو گیا ہوں
کافی ہے سوزِ باطن انوارِ معرفت کو — اپنی ہی شمعِ دل کا فانوس ہو گیا ہوں

(۲) محمد حسین شوق۔

کیا ہم پہ کھلے عالمِ امکاں کی حقیقت — آنکھیں ہیں مگر دیدۂ بینا نہیں ملتا

(۳) وجاہت حسین۔

داغ و ظہیر مردِ دلاور تھے واقعی — میدانِ شاعری میں گئے جھنڈے گاڑ کر
بیٹھے ہیں ہم تو پہلے ہی آزردہ و ملول — اے غم ہمارے دِل میں نہ تو چھیڑ چھاڑ کر
پہنچا ہے آج توسنِ عمرِ رواں کہاں — دیکھے دکھائے موڑ سے اب کوئی تاڑ کر
پامال کر دیا رہِ مُلکِ عدم میں آہ — مارا ہے خود سوار کو اُس نے لتاڑ کر

ذیل میں بعض شعرا کی نظموں کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے واقعات پر سیاسی تبصرے کیے ہیں :

(۱) نظم رُوس اور ایران پر۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

مقتل طرابلس کا ہے پیشِ نظر اب تک — دل غرقِ خوں ہے اب تک ٹکڑے جگر ہے اب تک
دِل ہے شرارہ افشاں اور چشم نم ہے اب تک — اور چشمِ تر اُگلتی لال و گہر ہے اب تک

اٹلی کے وہ مظالم بھولے نہ تھے ابھی ہم — اس گردشِ فلک نے اِک اور دے دیا غم

ایران جس کی دولت دُنیا میں تھی گہر ریز — تو سن کسی کا جس کے آگے ہُوا نہ مہمیز
کرتا ہے اُس پہ حملے اب رُوس فتنہ انگیز — کشتی شکستگانیم اے بادشرط برخیز
شاید کہ باز بینم آں یار آشنا را

(۲) انجم گیاوی

پہلے کیا یورپ نے مراکو کو تباہ — اب ظلم ہے ایران پہ بے جرم و گناہ
ہمدردیٔ انسان کا پھر ایسا ہے دعویٰ — لاحَول وَلا قوۃ اِلّا باللّٰہ

(۳) وجاہت جھنجھانوی

مہذّب ڈاکوؤں نے ہاتھ میں تلوار پکڑی ہے — مسلماں دیکھتے ہیں یہ جفائیں اپنی آنکھوں سے
غضب ہے بعض خیرہ قوم یہ تاکید کرتے ہیں — کہ ہم ہرگز نہ اِک آنسو بہائیں اپنی آنکھوں سے
یہ حالت دیکھ کر جو اپنے مُنھ کو پھیر لیتے ہیں — وہ ظالم سب کے سب محروم جائیں اپنی آنکھوں سے

(۴) ظفر علی خان

خواجہ حالی کی ایک غزل کے چند اشعار کی تضمین :

رنگ میں یہ ڈالتے رہتے ہیں بھنگ — ہیں قیامت کے حریفانِ فرنگ
چڑھ نہیں سکتا ہے تلواروں پہ زنگ — صُلح ہے ایک مُہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
توپ کیا بندوق کیا تلوار کیا — کوٹ کیا پتلون کیا شلوار کیا

تبصرہ :

زمیندار کا ابتدائی دَور نہایت پرسکون تھا لیکن ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ جب زمیندار کو پنجاب کی سب سے پہلی سیاسی تحریک میں پڑھ چڑھ کر حصّہ لینا پڑا۔

نہری نو آبادیوں میں کاشتکاروں پر پابندی لگا دی گئی تو اس مُلک کے زمین داروں اور کسانوں نے جن کی عنانِ قیادت لالہ بنک دیال سردار اجیت سنگھ اور چودھری شہاب الدین مرحوم کے ہاتھ میں تھی، ان پابندیوں کے خلاف پنجابی زبان میں ایک ہاڑہ لکھا جس کے آخری بول یہ تھے :

"پگڑی سنبھال اَو جٹّا پگڑی سنبھال اَو"

پنجابی کی یہ مشہور نظم زمیندار میں چھپی اور چوں کہ اس میں کسانوں کے خیالات کی ترجمانی کی گئی تھی اس لیے بے حد مقبول ہوئی۔ سکھوں نے اسے گرمکھی رسم الخط میں منتقل کر کے ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر سارے صوبے میں تقسیم کر دیا۔ لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ اور الہ آباد کے پائنیر نے اس کا انگریزی ترجمہ چھاپا۔ اس ایجی ٹیشن میں لالہ لاجپت رائے جلا وطن ہوئے اور آخرِ کار حکومت کو یہ قانون منسوخ کر دینا پڑا۔ یہ واقعہ زمیندار کی شہرت کے لیے بہت کافی تھا۔

چودھری شہاب الدین مرحوم نے مولانا ظفر علی خاں کو مشورہ دیا اور انھی کے مشورہ کی بنا پر انھوں نے اپنے اخبار زمیندار کو کرم آباد سے لاہور منتقل کر لیا اور ٹکسالی دروازے کے ایک مکان میں زمیندار کا دفتر قائم کر لیا گیا۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۱۱ء کو انھوں نے لکھا تھا کہ اس وقت تک ہم نے زمیندار کو کرم آباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جو دُنیا سے الگ تھلگ ہے۔ ہم نے بھلی یا بری طرح جیسے بھی بن پڑا، چلایا۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ ہمارے احباب اس کی اشاعت کی تلافی جس کی ذمہ دار ہماری خلوت نشینی تھی، اپنی کرم گستری اور قدر شناسی سے خود فرماتے رہیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قسامِ ازل نے زمیندار کو تقسیم عمل کی برکات میں سے حِصّہ نہ دینے ہی کی ٹھانی تھی اور اس کے حلقۂ اشاعت وسیع کرنے کا بوجھ بھی ہماری ہی ناتواں اور کم زور گردن کو ودیعت کیا گیا تھا۔ اس لیے مفصلات اور خاص لاہور کے بہت سے احباب کے تقاضوں اور مشوروں سے مجبور ہو کر ہم اپنا بوریا بدھنا اٹھاتے ہیں اور کرم آباد سے لاہور جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ لاہور کی آب و ہوا زمیندار کو راس آئے، اور اس کی اشاعت اتنی بڑھ جائے کہ ہم اس کو رفتہ رفتہ ایک اعلیٰ پیمانے کے روزانہ اخبار کی شکل میں ترقی دے سکیں۔ چوں کہ دفتر کے حمل و نقل میں بہت سا وقت صَرف ہوگا۔ اس لیے ہم اپنے محترم و قدر شناس ناظرین سے ایک ہفتہ کی رخصت طلب کرتے ہیں اور آیندہ پرچہ لاہور سے یکم مئی ۱۹۱۱ء کو نکلے گا۔ ۱۹ر اپریل تک کُل مراسلت ہمارے نام کرم آباد کے پتے سے ہونی چاہیے۔ اس

کے بعد لاہور کے پتے سے۔

اس طرح یہ ہفتہ وار اخبار یکم مئی ۱۹۱۱ء سے لاہور سے نکلنا شروع ہُوا۔ اس اخبار کا رنگ ڈھنگ اب کرم آباد کے پرچہ سے مختلف ہوگیا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس اپنے اداریوں اور اہم مختصر نوٹس اور خود ظفر علی خاں اور دوسرے لوگوں کی نظموں کے ذریعے دلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پالیسی میں بھی ایک نمایاں تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ اور زمین داروں اور کسانوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس نے پوری مِلّتِ اسلامیہ کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرنا اپنا اہم فریضہ قرار دے دیا تھا۔

مئی ۱۹۱۱ء سے لے کر ستمبر اکتوبر ۱۹۱۱ء تک کی اہم تحریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) ہندو اخبارات میں مسلمانوں کے متعلق جو مہم چلی ہوئی تھی اور لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر "ہندوستان" نے خصوصًا یہ شکایت لکھی تھی کہ وائسرائے ہندو جاتی کالج دیکھنے کے لیے نہیں گئے اور مسلمانوں کا کالج دیکھا تو اب مسلمانوں نے نئی مہربانی کے لیے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیا ہے کہ ایک نئے کالج کے لیے بھی جگہ دی جائے۔ یہ واقعہ مسلمانوں کے موجودہ رویّے اور پالیسی کا سچا آئینہ ہے یعنی جس قدر گورنمنٹ ان پر مہربانی کرتی ہے اسی قدر وہ زیادہ پھیلتے ہیں مناسب ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے پر مسلمانوں سے خاص مہربانی کر کے گورنمنٹ آیندہ مسلمانوں کو اس قومی وصف کے زیرِ نظر رکھ لیا کرے[۲]

زمیندار کا تبصرہ:

قومی خصوصیتوں کے ناپنے یعنی اس اَمر کا اندازہ کرنے کا کام بھی تو ہم اپنے محترم ہم عصر پر ہی چھوڑتے ہیں کہ مسلمانوں میں پھیلنے اور ہندوؤں میں سکڑنے کی قابلیت کس قدر ہے اس لیے کہ ہمیں اس قدر فرصت ہے اور نہ ہماری عصبیت کا مقیاس اس درجہ صحیح و لطیف واقع ہُوا ہے۔ لیکن ہم اپنے ہم عصر سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب لارڈ ہارڈنج کو آپ نے اپنے ۷ اپریل کے لیڈر میں نوشیروانِ وقت اور درِ آسمانی رحمت اور ہندو قوم کی روشن امید سے تعبیر کیا ہے اور ان کی نسبت لکھا کہ وہ نہایت صاف گو، دیانت دار، روشن ضمیر، انصاف پرور، وسیع النظر حاکم ہیں کہ "جن کی طبع نازک مسلمانوں کی خاص حق تلفیوں کا ناگوار بوجھ نہیں برداشت کر سکتی اور جنھوں نے آپ ہی کے قول کے مطابق مسلمانانِ بمبئی کو ان کے ایڈریس کے جواب میں بمقتضائے انصاف وہ ڈانٹ پلائی کہ اُن کا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ تو پھر آپ کو یہ کیوں کر خیال پیدا ہُوا کہ ہز ایکسی لینسی کا اسلامیہ کالج

میں تشریف لے جانا مسلمانوں کے حال پر ایک خاص مہربانی تھی۔ کاش ہمارے غائبانہ دوست لالہ دینا ناتھ صاحب، جن کی ہمارے دِل میں بہت بڑی وقعت ہے لیکن جن کی تحریروں کی تنقید میں ہمیں بدرجہ مجبوری قلم اُٹھانا پڑا ہے، بین الاقوامی مسائل خامہ فرسائی کرتے وقت اس برادرانہ رواداری سے کام لینا سیکھیں جس کی ہندوستان کو عموماً اور پنجاب کو خصوصاً ضرورت ہے۔"[۵۳]

نظربندی کا دَور (دسمبر ۱۹۱۴ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء) اور ستارۂ صبح کا اجراء

ان کی نظربندی کا یہ دَور علم و ادب کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہُوا۔ کیوں کہ مولانا نے لیلائے سیاست سے کنارہ کش ہو کر علم و ادب سے اپنی پینگیں بڑھا لی تھیں۔ وہ شروع سے سیر و تفریح اور محنت و جفاکشی کے عادی تھے۔ ان کا وقت مطالعے میں گزرتا یا اپنی زمینوں کی درستی اور باغ کی نگرانی میں صَرف ہوتا۔ جیسا کہ ہم سابق میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ ایک سال گزرنے کے بعد (۱۹۱۶ء کے آخر میں) انھوں نے گورنمنٹ سے ایک غیر سیاسی اخبار نکالنے کی اجازت طلب کی۔ اسی دوران میں ۲۳ مئی ۱۹۱۷ء کو وہ اپنے باغ میں ٹہل رہے تھے کہ ایک دیوانے کُتے نے ان کی ایڑی پر کاٹا۔ اس دن کی سیر کی کیفیت کو خود انھی کے الفاظ میں اگر بیان کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

"روش کے دونوں طرف گل و یاسمن کا ہجوم تھا۔ انگوروں کی بیلیں زمردیں خلعت پہنے منڈیر پر لیٹی ہُوئی تھیں۔ نارنج کی پھلوں سے لدی ہُوئی شاخیں نگاہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچنے میں مصروف تھیں۔ ہَوا میں ایک مستی انگیز کیفیت تھی۔ اس لیے کہ کئی دن سے ابرِ آزاد کے جاں بخش چھینٹوں نے تابستان میں گلابی جاڑے کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ہم بے اختیار مرزا غالبؔ کے یہ شعر گنگنا رہے تھے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے۔

کہ اسی عالم میں ایک دیوانے کُتے نے کاٹا۔"

دیوانے کُتے کے کاٹنے پر اسی وقت سَر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب کو برقیہ بھیجا گیا۔ دو گھنٹے میں جواب آگیا کہ مولانا کو کسولی کے مرکزِ سگ گزیدگان میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ علاج کے بعد وہ گورنر پنجاب سے مِلنے کے لیے شملہ گئے اور لارڈ صاحب کی مہربانی سے آزادی نصیب ہونے اور روزناموں کی ادارت اور اشاعت کی اجازت مِل گئی۔

لیکن اس دوران میں انھیں راوی کے اس پار یعنی لاہور کی طرف آنے کی ممانعت تھی، ان کا یہ خیال تھا کہ "ستارۂ صبح" علامہ عبداللہ عمادی کی نگرانی میں لاہور سے نکلتا رہے گا اور مضامین کی ترتیب کے متعلق وہ کرم آباد آکر وقتاً فوقتاً مشورہ کر جایا کریں گے لیکن اس میں بقول ان کے "ہمارے لیے اور ستارۂ صبح کی کامیابی کے لیے ایسی دقتیں اور رکاوٹیں تھیں کہ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دفعہ پھر حکومت سے عرض معروض کریں اور لاہور رہنے کی اجازت لے لیں۔ چنانچہ وہ وسط اگست میں پھر شملے روانہ ہو گئے۔ انھوں نے وسط جولائی میں جب وہ پہلی بار گورنر صاحب سے ملنے شملے گئے تھے، یہ طے کر لیا تھا کہ مولانا عمادی صاحب ہی اس اخبار کے اوّل مددگار ہوں گے۔ اور مولوی عبدالحی صاحب اور وجاہت حسین صاحب مددگار دوئم۔ مولانا ظفر علی خاں کے قیامِ زمانۂ انگلستان میں مولانا عمادی زمیندار کے سیاہ و سفید کے مالک رہ چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے شملے میں حکومت کے اربابِ حل و عقد سے جو گفتگو کی تھی اس کی کیفیت دوستانہ تعلقات اور برادرانہ مراسم کے طور پر پوری طرح بیان کر دی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "دنیا خواہ کچھ سمجھے لیکن علامہ عمادی کو معلوم ہے کہ حکومت کے ساتھ ہماری جو گفتگو ہوئی اس میں کہاں تک مسلمانانِ ہند کے حقوق اور ان کی دلی تمناؤں اور آرزوؤں کا خیال رکھا گیا تھا اور جب یہ جنگ ختم ہو جائے گی اور اچھا زمانہ آئے گا تو ہم اس کی ساری حقیقت انشاءاللہ ہندوستان پر بے نقاب کر دیں گے۔ پھر دُنیا یہ فیصلہ کر سکے گی کہ ہمارے ظاہر کو باطن کے ساتھ کیا تعلق ہے۔"

وہ ۲۱ جولائی کو کرم آباد پہنچے تھے اور یہ پروگرام تھا کہ "ستارۂ صبح" کا اوّلین نمبر ۸ اگست کو شائع ہو۔ لیکن مولانا عمادی کو چوں کہ یہ تنخواہ منظور نہ تھی اس لیے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے اور مولانا ظفر علی خاں کو ان کی تنخواہ بجائے ڈیڑھ سو کے ایک سو پچھتر روپے کرنی پڑی لیکن بعض وجوہ سے مولانا عمادی اپنے وعدے کو پھر بھی ایفا نہ کر سکے اور جب مولانا نے تنخواہ کا پیشگی چیک بھی بھیج دیا اور وہ پھر بھی نہ آئے (اس وقت وہ "الصباح" لاہور میں کام کر رہے تھے) تو مولانا ظفر علی خاں کو یہ لکھنا پڑا کہ "اصباح نے جناب کو ایسی ہیچ میرز رقم سے جو خاکسار جناب کے کمالات پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے، بے نیاز کر رکھا ہے۔" بہرحال یہ کش مکش بڑھتی چلی گئی اور وسط اکتوبر تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ اصباح کے مالک غلام محی الدین وکیل اور مولانا کے درمیان حبیب اللہ بیرسٹر صاحب کے ذریعے صلح ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خاں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ "اخبارات قوم کی اقتصادی، سیاسی، عقلی اور مذہبی اصلاح کے مدعی ہیں اور جب وہ ہی آپس میں تُو تُو مَیں مَیں میں پڑ کر ان حقائق عالیہ کی طرف سے آنکھوں

پر پٹی باندھ لیں تو قوم کی کیا حالت ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ غلط فہمی دُور ہو گئی اور ہم آیندہ جھگڑوں سے دست بردار ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور اپنی قوتوں کو یک جا کر کے بہترین خدمت جو ہم اپنی ناچیز بساط کے مطابق قوم و مُلک کے لیے انجام دے سکتے ہیں، بجا لانے کا تہیہ کرتے ہیں۔"

لیکن مولانا ظفر علی خاں کی کوششیں علامہ عبداللہ عمادی کو اپنے اخبار میں کھینچنے کے لیے بدستور جاری رہیں۔ یہاں تک کہ وہ اکتوبر کے آخر میں ان کو کھینچ ہی لائے اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۷ء سے وہ "ستارۂ صبح" میں مولانا کے دست راست بن گئے۔

حواشی :

۱؎ ... اشرف عطاؔ کا بیان ہے کہ یہ اداریہ انھوں نے واپس آکر لکھا تھا۔ (زمیندار، لاہور، گولڈن جوبلی نمبر، جنوری ۱۹۵۳ء)۔

۲؎ .. ڈاکٹر عبدالسّلام خورشیدؔ: صحافت پاک و ہند میں، محولہ بالا، ص ۳۵۰

۳؎ .. اشرف عطاؔ: زمیندار اور برطانوی استعمار کی ٹکر (مقالہ) زمیندار، گولڈن جوبلی نمبر، محولہ بالا، ص ۱۷

ستارۂ صبح

حکومت کی اجازت ملنے پر کہ اس روزنامہ کو سیاسیات سے کوئی مطلب نہ ہوگا۔ چناں چہ اس اخبار کا پہلا نمبر ۸ر اگست ۱۹۱۷ء کو نکلا۔ اور دوسرا نمبر ۲۸ر اگست ۱۹۱۷ء کو جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲ کے تحت جاری ہوا۔ صفحۂ اوّل کا نمونہ اس طرح سے تھا۔

رَبِّ زِدنی عِلماً

من آں ستارۂ صبحم کہ در محلِ طلوع ہمیشہ پیش روِ آفتاب می باشم

ستارۂ صبح روزنامہ

ایڈیٹر ظفر علی خاں

جلد اوّل	لاہور یوم سہ شنبہ ۹ر ذی قعد ۱۳۳۵ھ مصارف ۲۸ر اگست ۱۹۱۷ء	نمبر ۲

ستارۂ صبح (نظم)

(مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی کے قلم سے)

نئی ادا سے ہوا جلوہ گر ستارۂ صبح
پئے ظفر ہے نشانِ ظفر ستارۂ صبح
چمک دمک ہے کچھ ایسی کہ لوگ کہتے ہیں
بنا ہے روکشِ شمس و قمر ستارۂ صبح
بشکل مہر منیر اپنے ساتھ لایا ہے
زمانہ کے لیے ایک طشت زر ستارۂ صبح
کہے گا اٹھ کے زمیندار شب کو پچھلے پہر
چمک رہا ہے میرے کھیت پر ستارۂ صبح

(یہ نظم ۲۰ اشعار کی تھی۔ یہاں اس کے صرف چند اشعار نمونے کے طور پر اوپر درج کیے گئے ہیں)۔

ادارتی ذمہ داریاں

اس اخبار کے ادارۂ تحریر میں مسٹر اختر علی خاں، علامہ عبد اللہ عمادی، سید وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، خواجہ عبد الحی، مرزا امان اللہ خاںؔ وزیر آبادی اور مرزا

سعید بیگ جیسے اصحابِ علم اور اہلِ قلم شامل تھے۔

چوں کہ یہ پرچہ علمی اور ادبی نوعیت کا تھا اس لیے اس اخبار کے عنوانات، اداریے اور مضامین سب علمی و ادبی مسائل پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس کے عنوانات حسب ذیل تھے۔

(۱) جواہر ریزے۔ (۲) جنگ فرنگ (۳) ریوٹر کی برقی خبریں (۴) مغربی رزم گاہ (۵) نوکابات (۶) حدیثِ دیگراں (۷) رزم گاہِ صحافت (۸) شریعت و طریقت اور قادیانیت (۹) ادبیاتِ عرب (۱۰) اردو کی حمایت (۱۱) ادبیاتِ اسلام۔

اس اخبار کے اداریے اس لحاظ سے بے حد اہم تھے کہ ان اداریوں میں انھوں نے علمی اور ادبی مسائل کے علاوہ قادیانیت اور مصنوعی تصوّف کے خلاف زبردست مقالے لکھے۔ ان مقالوں نے مخالف جماعتوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اسی طرح اردو کی حمایت میں بھی انھوں نے انتہائی بے باکی اور جرأت کے ساتھ ہندو صحافت کا مقابلہ کیا اور ان کی صحافتی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ذیل میں ہم ان کے چند اداریوں کے نام اور ان کے نمونے درج کرتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ستارۂ صبح کا ادبی معیار اس قدر بلند تھا۔

(۱) اداریے

(ا) مقدس قادیان کی آسمانی حکومت — ۲ر ستمبر ۱۹۱۷ء

(ب) حدیثِ گُل و بُلبُل — ۱۵ر ستمبر ۱۹۱۷ء

(ج) ایک دار اللباس کی ضرورت

(د) ہمارے دینی و سیاسی عقاید

(ھ) یک بام و دو ہوا

(و) بے کارم و باکارم چوں مد بحساب اندر

(ز) سوختم سوختم ایں راز نہفتم تا کے

(ح) سردار خزاں سنگھ آں جہانی

(ط) یہ بہشتی زیور ہے یا کوک شاستر

(ی) چرخِ نیلوفری کی گردش

(ک) پورے دو کالم افتتاحیہ کے خالی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ اداریہ سنسر کی نذر ہو گیا تھا اسی لیے انھوں نے اداریہ کا یہ عجیب انداز اختیار کیا کہ صفحہ خالی چھوڑ دیا۔

(ل) ہمارا مذہب

(م) نعرۂ حق
(ن) گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
(س) آیۂ استخلاف کا استخفاف
(ع) انوارِ معرفت (صوفیہ جماعت کے خلاف)

مذہبی اور معاشرتی اصلاح پر ان کے مسلسل اداریے نکلتے رہے۔ بعض بعض اداریے کئی کئی حصّوں میں کئی کئی دن تک نکلتے رہے۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۱) معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید ۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۷ء
(۲) معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید (۲) ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۷ء
(۳) مقامِ امام (امام حسین علیہ السّلام کی شخصیت کے متعلق)
(۴) قادیان کا تھیسٹر (جلی قلم سے لکھا گیا)۔
(۵) مسئلۃ السماع۔ ان ہذہٖ تذکرہ
(۶) بابا نانک کا تصوّر ۲۷ر نومبر
(۷) طریقت کی حقیقت ۱۷ر دسمبر
(۸) خرقہ و دستارِ فضیلت ۱۰ر جنوری، ۱۱ر جنوری، ۱۲ر جنوری
(۹) طریقت و شریعت کی پابندی

نوٹ: ۱۴ر ستمبر سے علمی مضامین کے دو نئے سلسلے شروع کیے گئے (۱) سلسلۂ تاریخِ اسلام (۲) سلسلۂ تاریخِ عرب۔

نیز ایک تبدیلی ۱۷ر جنوری سے اور آگئی وہ یہ کہ اب پہلے صفحہ پر جنگ کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ اس سے قبل یہ صفحہ جواہر ریزے یا علمی مضامین کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ ان جواہر ریزوں میں یا تو ان کی اپنی نظمیں یا کبھی کبھی فکاہات کی شکل میں مختلف تبصرے یا کسی فارسی شاعر کی رباعی یا اس کے کلام پر اظہارِ خیال یا ان کی قادیانیت کے خلاف نظمیں یا جواہر ریزوں کے تحت ان کے بعض منتخب اشعار یا نظمیں یا حدیث دیگراں کے تحت دوسرے اخبارات یا معاصرین کی زمیندار پر تنقید اور بعد میں بعض دفعہ کوئی سیاسی خبر اور اس پر تبصرے مضمون کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔

جواہر ریزوں کے تحت خصوصیت سے ان کی وہ نظمیں شائع ہوتی رہیں جو تصوف یا قادیانیت کے خلاف تھیں۔ مثلاً ۹ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ان کی ایک دِل چسپ نظم "وہ اور ہم" کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے چند شعر یہ ہیں:

اب تک تو یہ سمجھے ہوئے تھے آپ کے دِل سوز
ہے مسخرگی بزمِ حریفاں میں دِل افروز

اب آپ کو وعظوں میں بھی اصرار ہے اس پہ
اللہ و نبیؐ پر بھی کوئی وار ہو دِل سوز

مذہب کی یہ تضحیک ہو یہ بے اَدبی ہو
پھر کیوں نہ ہو ملّت کے تو ہیں آپ ادب آموز

بھانڈ آپ اگر بننے چلے شوق سے بنیے
ممبر پہ ہے کس واسطے وعظِ ستم اندوز

بعض اداریوں کے نمونے

(۱) لاہور میں ایک دارالایامی کی ضرورت۔ دعوتِ کار اور طریقۂ عمل۔

غریب مسلمان بیوائیں جن کی بسر اوقات کا سہارا اگر ہے تو خدائے قدوس کی ذاتِ بے ہمتا ہے، عموماً اپنے سیہ خانوں میں جن کی ظلمت کو شمعِ اُمید کی کرن شاید ہی چیرتی ہو تو چیرتی ہو، مصیبت و کلفت کے عالم میں بیٹھی ہوئی اختر شماری کیا کرتی ہیں۔ خاوند زندگی کا رفیق تھا اور اسی کے دَم سے زندگی کی ساری خوشیاں اور کامرانیاں تھیں، ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے چکا ہے۔ اب درد دُکھ سُنے تو کون سُنے۔ ٹوٹے ہوئے دِل کی پاک آرزوئیں بر آئیں تو کیوں کر آئیں۔ دن کو بے مہر سورج آنکھیں دکھاتا ہے، شام ہوتی ہے تو پہاڑ سی کالی رات مُنہ کھولے ہوئے ایک نیا پیغامِ غم لاتی ہے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں، کسی کو ان کا خیال نہیں۔ کھلے بندوں کھانا کھانے والے، جیبوں میں روپے اور اشرفیاں کھنکانے والے کیا جانیں کہ ان بے چاریوں میں بعض ایسی ہیں جنھیں تن ڈھکنے کو کپڑا تک میسّر نہیں۔ قوتِ لایموت کے لیے ایک ٹکڑا نانِ جَویں اور کوزہ آبِ سرد بھی اطمینان کے ساتھ نہیں ملتا۔ ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ بر پارا

وہ جو بیوہ کی "چُپ کی داد" نہیں دے سکتے، اس حرماں نصیب کے دردِ دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان کی بلا کو کیا غرض کہ جب ایک تیرہ بخت بیوی کا شوہر جب جامِ دہر سے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کی شرابِ تلخ کا فانی گھونٹ پی کر رخصت ہوا تو اس کے پاس کس قدر نقد روپیہ تھا۔ اور وہ کتنی اولاد چھوڑ گیا۔ وہ اس مفت کی جھنجھٹ میں کیوں پڑے کہ غریب بیوہ نے اپنے ننھے معصوم بچّوں کو پالنے پوسنے کے لیے کیا کیا جتن کیے، کیسی کیسی کڑیاں اٹھائی ہیں، کیسے کیسے صدمے جھیلے ہیں، اور وہ یہ دردِ سر مفت میں کیوں خریدے کہ بیواؤں کے شب و روز کیوں اور کس طرح گزرتے ہیں اور وہ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کیا لیتی ہیں، کیا دیتی ہیں۔ سوئی سے رشتہ جوڑ کر دن رات میں دو آنے کے پیسے کماتی ہیں۔ یا پھر رات گئے سے چکّی پیس کر دن ڈھلے بصد دِقّت اپنا دوزخ بھرتی ہے۔

خدا کی رحمت کا سایہ ان ناتوانوں کے سروں پر ہو تو ہو لیکن ہماری بے نیاز قوم کو ان کا خیال تک نہیں آیا اور اگر ہم سے غیرت بالکل نہیں چھین لی گئی ہے اگر دردِ اسلامی جس کا ادعا، بڑے بڑے مفتیانِ شرعِ متین اور حامیانِ دینِ مبین کو ہے اور ان کے دِلوں میں کلامُ اللہ کی آیات مدفون نہیں ہیں کہ وقت آگیا ہے کہ ہم اٹھیں اور بیواؤں کے کس مپرس طبقہ کی طرف دستِ اعانت بڑھائیں کہ اس طرح ہم تلافیٔ مافات کر سکتے ہیں اور خدائے پاک اور اس کے رسُولِ امین ؐ کے دربار میں سُرخ رُو ہو سکتے ہیں۔ ہر کام کے کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک خاص ضابطہ ہونا چاہیے۔ اور طریقۂ عمل کے لیے خاص آئین ہونا چاہیے۔ اور جہاں تک ہم نے سوچا ہے اس کی شکل یہ ہے۔

(الف) ایک مجلس منتظمہ کی تاسیس ہو جو شہر لاہور کی بیواؤں کے متعلق اعداد وشمار فراہم کرے (ب) مجلسِ خزینۃ البضاعت کا قیام۔

فراہمی اعداد وشمار ایک جامع مفہوم ہے جس کے ذیل میں بیواؤں کے متعلّق سب ہی طرح کے کوائف ومعلومات آجاتے ہیں۔ مثلاً اس شہرِ خدّار میں کُل کتنی بیوائیں، بہ اعتبارِ سِن، شباب، کہولت وپیرانہ سالی کے مدارج سہ گانہ میں کس مدارج سے تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے کتنی ایسی ہیں جن کے نان نفقہ کے کفیل ان کے خویش واقارب ہیں۔ جن کا خبر گیراں اور پُرسانِ حال کوئی نہیں۔ کتنی ایسی ہیں کہ جن کا گھر عقدِ ثانی کر کے تھوڑی سی مدد دے کر آباد کیا جا سکتا ہے۔ کتنی ایسی ہیں جنھوں نے اپنی بقیہ عمر رنڈاپے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کتنی ایسی ہیں جنھیں اعفی کے مکانوں میں کسی نہ کسی شکل سے مدد پہنچانی ہمارا فرض ہے۔ کتنی وہ ہیں جو ایک قومی گھر میں جس کا نام ہم نے دارالایامیٰ تجویز کیا ہے، آکر رہنے پر رضامند ہیں کہ یہیں ان کو کام سے لگا دیا جائے۔

(ب) مجلس خزینۃ البضاعت کا کام جو مجوّزہ دارالایامیٰ کے لیے سرمایہ بہم پہنچائے اور بعد فراہمیٔ سرمایہ اس بات کا انتظام کرے کہ تمام بیواؤں کو ان کے طبقات اور جداگانہ حالات کے اعتبار سے کس قدر مدد دی جائے۔ عورتوں کو ہر مُلک اور ہر زبانے میں سُوئی سلائی کے کام سے ایک قسم کا تعلق رہا ہے جس طبقے کی امداد ہمارے پیشِ نظر ہے اس کی اعانت کا ذریعہ بھی اگر سوزن کاری ہی قرار دیا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

انسان کام کے لیے بنایا گیا ہے۔ انسانیت (کا لفظ) آدھی رجال سے مرکّب ہے اور آدھی نساء سے۔ قومی زندگی دونوں کے تعاون سے اپنی اصلی شان سے برقرار رہ سکتی ہے۔ اگر مُلک کی دولت پیدا کرنے والے افرادِ مُلک کی ضرورت کے پورا کرنے میں اپنی بساط کے مطابق اعلیٰ

قدرِ طاقت عورتوں کا بھی ہاتھ بٹائیں۔ ہم اس بات کے مخالف ہیں کہ قوم کے کس طبقے کو جس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، خیرات دے کر مفت خوری کا عادی بنا دیا جائے۔ جو اپاہج ہیں، ضعیف و ناتواں ہیں، بیمار و خستہ ہیں، اپنی قوتِ بازو سے اپنا پیٹ نہیں پال سکتے، ان کا تو خیرات و مبرات پر یقیناً قطعی حق ہے کہ ان کے نان و نفقہ کا انتظام بہرحال ہمیں ہی کرنا چاہیے اور جن کے ہاتھ پاؤں میں سکت ہے اور چشمِ بینا اور گوشِ شنوا رکھتے ہیں، انھیں اپنا پیٹ آپ پالنا چاہیے تاکہ ان کا وجود قوم کو گراں نہ گزرے۔

(۲) اداریہ: ایک بھولا ہُوا فن" (۷ر ستمبر ۱۹۱۷ء)

"شملہ کا سفر ہمارے لیے کئی لحاظ سے مبارک تھا وہ جو کہا گیا ہے کہ "سفر وسیلۃ الظفر" بالکل ٹھیک ہے۔ اس سیاحت میں ادب کے جو موتی ہم رولتے آئے ہیں، ان کی آب و تاب کچھ تو روزنامہ "ستارۂ صبح" کی اشاعت مرتبہ ۲۹ر اگست میں جھلک رہی ہے کہ طرازِ سرورق آنریبل نواب ذوالفقار علی خاں کا ایک پُرلطف تاریخی مقالہ ہے جس کا کچھ حصہ اسی تاریخ کے "ستارۂ صبح" میں جلوہ افروز ہے جن کے محرمِ سراپردۂ جلال کے ضیا اندوز ہاتھوں سے امروز و فردا کے حقۂ گوہریں کی درخشانیاں ودیعت نگاہِ بصیرت کی گئی ہیں۔"

"شملہ سے مراجعت پر چند دنوں کے لیے ہوشیار پور ٹھہر گئے، جہاں کی دل آویز صحبتوں کی یاد ہمیں مدتوں فراموش نہ ہوگی۔ ہمارے بھائی رانا فیروز الدین صاحب نے یہاں ہمیں ہوشیار پور کے دوسرے روشن خیال بزرگوں سے ملایا وہاں بڑا احسان یہ کیا کہ مولوی نیاز احمد صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی جیسے فردِ فرید سے ہمارا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب موصوف نے مذاق کے فاسد ہونے کی طرف اشارہ کیا کہ کنکوے اُڑانے والے، افیون کی چسکی گھول کر پینے والے، مدک کے چھینٹے اڑانے والے، شاہدانِ شوخ و شنگ سے آنکھیں لڑانے والے، داغ کی غزلوں پر سر دُھننے والے، داستانِ امیر حمزہ اور بیتال پچیسی کی ورق گردانی کرنے والے کیا جانیں کہ "ڈارون کس بوزنہ کا نام ہے، رسکن کون مسخرا تھا، اور ریناں کون جانگلو تھا۔"

مولوی صاحب موصوف نے اسی سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "شاید یہ کہا جائے کہ غوامضِ علمیہ سے طبیعتوں کا ناکارہ ہونا اور حقائقِ معقدہ کی گرہ کشائی سے الجھنا اگر قوم کا عام شیوہ رہا ہے تو اس کا باعث کچھ تو تعلیم کا ناقص ہونا ہے اور کچھ صحافتِ حاضرہ کی بدمذاقی ہے جو جمہور کو اس راستے پر لگاتی ہی نہیں؛"

یہ الزام بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہماری تعلیم بھی ادھوری ہے اور ہم اخبار نویس

بھی سخت مجہول اور نامعقول واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں کے مذاق میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور جو اوصاف ہم میں یونی ورسٹیاں پیدا نہیں کرسکتیں انھیں خود پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سردست ہم اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ جس حد تک کم سے کم "ستارۂ صبح" کی ناچیز مساعی کا تعلق ہے ہم اپنے اور اپنے ہم قلموں کی نالائقی کی تلافی ایسے مضامین کی اشاعت سے کرنے کا تہیہ کرچکے ہیں۔ جو علم پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کٹھن کام ہے اور بڑا سخت مرحلہ ہے۔ جس میں چپہ چپہ پر ایک نئی ہوش ربا منزل، قدم قدم پر ایک نئی زہرہ گداز ہفت خواں ہے۔ ایک اکیلے شخص کی قوتِ بازو خواہ وہ رستمِ زماں اور اسفندیارِ دوراں ہی کیوں نہ ہو، اس وادیٔ کرب و بلا کو طے نہیں کرسکتی۔ خدا کی توفیق چراغِ سرِ راہ ہونی لازم ہے۔ اور ہمدرد احباب کی اعانت رفیق طریق ہونی چاہیے۔ مولوی نیاز محمد صاحب کی طرح اگر اور بھی متعدد شریکِ کار ہمارے ساتھ مل جائیں اور ہمارا ہاتھ بٹائیں تو جہاز منزل تک پہنچ سکے گا اور زورق اندیشۂ گرداب بلا سے نکل کر ساحلِ مراد پر آسکے گی۔ انشاء اللہ۔

(۳) اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (تیسرا اداریہ۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۷ء)

کیا ہم رجعت پسند ہیں۔ ہمارے مذہبی و سیاسی عقائد

مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ سوئے ظن سے بچیں اور اپنے بھائیوں کی نسبت کوئی ایسی بری رائے نہ قائم کرلیں جس کی توثیق کے لیے ان کے پاس کوئی حجتِ موجہ اور کوئی برہانِ شافی نہ ہو۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس دورِ آخر میں جہاں ان کی شومئی قسمت قرآنِ حکیم کی دوسری روشن تعلیمات کی طرف سے اپنی آنکھوں پر اعراض کی پٹی کس کر باندھ چکی ہے وہاں وہ اس پاک اصول کی طرف سے بھی روگرداں ہو چکے ہیں کہ کسی اللہ کے بندے کو بدنام نہیں کرنا چاہیے اور بلاسبب اس کی نسبت بدگمانیاں نہیں پھیلانی چاہئیں۔

ہم کو حکومتِ پنجاب نے آزاد کیا کیا کہ طول و عرض میں ہمارے لیے مطاعنِ ناروا اور ملاعنِ ناسزا کا ایک طوفان آفریں پھاٹک کھل گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس آزادی کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ حکومتِ عالیہ نے اپنی تباہ کن ملک و ملت اغراض کا ہم کو آلۂ کار بنالیا ہے اور اس کی قیمت ہماری روح اور زمین اور ہمارے ایمان کو بقدر چالیس ہزار روپے سکۂ چہرہ شاہی، کہ نصف جس کے مبلغ بیس ہزار روپے ہوتے ہیں، ہمیں ادا کر دیے ہیں۔ گویا جیسے شریر النفس ہم ہیں ویسے ہی ہماری حکومتِ عالیہ بھی ہے۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ ہم جو آزاد ہوئے تو ہم نے اپنے ہاتھ سے قبالہ آزادی پر یہ شرط بہ اقرار صالح لکھ دی ہے کہ ہم آئندہ مسلمانوں کو گالیاں دیا کریں گے۔

اور اسلام کی روایات کا استخفاف کیا کریں گے اور روزنامہ ستارۂ صبح میں ایک لیڈر نمک مرچ لگا کر اس طرح کا لکھا کریں گے کہ اسلام کو دنیا سے مٹ جانا چاہیے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جوتا چلوانا، چوں کہ کشورِ ہندوستان میں دولتِ برطانیہ کی عیارانہ حکمتِ عملی کا اصولِ اوّلین ہے اس دولتِ موصوفہ کے نائبین پنجاب نے ہمیں آزاد کہہ کے اس اصول کے پیچ در پیچ فروع ہمارے رنگین قلم سے مرتب کرانے چاہے ہیں کہ ہم تمام کچا چٹھا لکھ کر سررشتۂ پولیس کی شاخِ تحقیقاتِ جرائم کی معرفت بالالتزام حکومت کے اربابِ حل وعقد کے پاس بھیج دیا کریں، اور اس فرض کی بجا آوری میں ہمیں یہاں تک انہماک ہو کہ کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے تو ہو جائے لیکن روزنامہ نویسی کی اس مقدس خدمت کے روزانہ تسلسل میں کوئی ناغہ نہ ہونے پائے۔ کوئی صاحب یہ دُر افشانی فرماتے ہیں کہ شملے جاتے ہی ہماری فطرت کچھ ایسی مست ہو گئی ہے اور ہم انسانیت کے شرف و مجد اور اس کے مقدس ترین حقوق کی حفاظت کی طرف سے ایسے غافل ہو گئے کہ ہم نے دولتِ برطانیہ کے مسلمہ اصولِ جہاں بانی کی روشن آنکھ میں آگ جھونکتے ہوئے اپنے سارے ہم وطنوں کے کان میں اَبدالآباد تک ذلیل ترین غلامی کا حلقہ ڈالنے کا تہیہ اور حریت کو ہنکار کر کہہ دیا کہ "مرجا"

ان بدگمانیوں کی داستان طولانی ہے اور قلم کوتاہ، اور سننے والوں کا صبر اس سے بھی کہتر۔ ہمارے ان عنایت فرما ہم قلموں کے پاس ہمیں مطعون کرنے کے لیے اور تو کوئی شہادت موجود نہیں ہے اور ہو بھی کیسے، جب کہ اس کا وجود ہی کائنات میں موجود نہ ہو۔ مگر یہ ہیں کہ لکیر پیٹے جا رہے ہیں، وہ ہی اپنی پھیکی اور سوکھی رٹ لگائے چلے جائیں گے۔ ؎

"افسوس ملک میں نہ ادب کا رہا مذاق
مستی اڑی شراب سے، پھولوں سے بو گئی"

کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آئین کے اندر رہ کر اور ضابطے کی پابندی کو ملحوظ رکھ کر حکومتِ عالیہ کے کامل ادب و احترام کی رعایت سے ہم ان مسائلِ سیاسیہ پر قلم نہ اٹھائیں جو دور از کار نہیں۔ اور ہم اپنے ہم وطنوں اور اپنے ہم مذہبوں کی جائز اور واجبی آرزوؤں کا اظہار ستارۂ صبح میں نہ کریں، اس لیے کہ ایسا کرنا ایک قسم کا کفرانِ نعمت ہو گا۔"

(۴) اداریہ "ہمارے عقاید"

ہمارے ہم قلموں نے بصیرت کے فقدان یا رقیبانہ چشمک کی انگیخت سے ہم کو جیسا جیسا بدنام کیا ہے اس پر قلم اٹھانے کا حق ہم کسی دوسری اشاعت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ سردست ہمارا روئے سخن صرف ان لوگوں کی طرف ہے جو ان آہو گیران بادیہ پیما کی قلم کاریوں سے متاثر

ہو کر ہم سے کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں۔

"ستارۂ صبح" جن کی نظر سے گزرتا ہے وہ سطور ذیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پہلے تو یہ سوچیں کہ آیا ہم سے ہمارے اقوال و افعال و اعمال کا مواخذہ ہونا چاہیے جس کا اصلی آئینہ دار ستارۂ صبح ہے یا ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی غیر ذمہ دارانہ ہرزہ سرائی ہے جو ہمیں بدنام کرنے کی غرض سے اختیار کی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں وہ گناہ گار ہیں، باطل سے دبنا ہمارا شعار نہیں البتہ حق اور صدق کی پیروی کرنا ہمارا شیوہ ہے۔

ہمارے عقاید، جنھیں آپ پہلے ہی جانتے ہیں، اگر اعادہ کے محتاج ہوں تو ان کی مکمل تفصیل حاضر ہے

(۱) کشورِ ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت کے قیام کو ہم اس ملک کی بہترین اغراض کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

(۲) انگریزوں کی سیادت کی حمایت میں اہلِ ہندوستان کی آئینی آزادی برضامندی دولتِ برطانیہ اپنی انتہائی شکل میں ملنا چاہیے۔ اور اہلِ ہند کا یہ مقدس فرض ہے کہ اس آزادی کے حصول کے لیے قانون اور ادب کے حدود کے اندر رہ کر اپنی جائز تمناؤں اور واجبی ضرورتوں کو ایک مہربان گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کرے اور اس کے عطیے کو شکریہ کے ساتھ قبول کریں لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی طرف سے کوئی ایسی غیر آئینی بات نہیں ہونی چاہیے جو حکومت کو تلخ گزرے۔ اور امن و امان کے درہم برہم ہونے کی نوبت آئے۔

(۳) اسلام کو ہم دنیا کی تہذیب کے اجزاء مہمہ کا ایک رکن اعظم تصور کرتے ہیں اور عالم میں اسے سرفراز و بلند دیکھنا چاہتے ہیں وہ شخص جو رسول اللہ کے دینِ مبین کا دشمن ہو، ہمارا دشمن ہے۔

(۴) ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد اس ملک کی فلاح کے لیے ہماری رائے میں ضروری ہے اور ہر ممکن کوشش اس پاک مقصد کے حصول کے لیے عمل میں لانی چاہیے۔ یہ ہمارے سیاسی و مذہبی عقاید کی ایک اصولی فہرست ہے اس اعلان کے بعد اگر ہمیں دشمنِ ملک و قوم سمجھا جائے تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا گورنمنٹ سے ملک کی تخریب اور اہلِ ملک کی تذلیل کے لیے کوئی خاص سمجھوتا ہوا ہے اور اس کی کوئی قیمت ہمیں روپے، آنوں اور پائیوں میں دی گئی ہے، تو ان کے حق میں ہماری یہی دعا ہے کہ خدا ان کو نیک ہدایت دے۔ ہم ایمان فروش نہیں۔ ہمارے عقیدے میں وہ مسلمان "اسفل السافلین" میں جھونکے جانے کا مستحق ہے جو ایمان جیسی سرمدی

دولت کو دُنیوی جاہ و تمکنت کی ڈھلتی چھاؤں پر نثار کر دے"

نظمیں:

ہم

اللہ کی قدرت کا تماشا ہے کہ کل تک
الزام وہ دیتے تھے مجھے بُت شکنی کا

کہتے تھے اس امرت کی ہر ایک بُوند ہے زہر
ہوتا تھا جو چرچا مری شیریں سخنی کا

لیتے تھے مزے اس لبِ جاں بخش کے دن رات
ہوتا ہے گماں جس پہ عقیقِ یمنی کا

سُوجھا انھیں یہ طعنۂ نورستہ یکایک
دشمن ہے یہ کم بخت رسُولِ مدنی کا

مذہب سے ہے بیزار یہ گمراہ اور اسلام
ہے شکوہ گزار اِس کی دردہ دہنی کا

گھر گھر میں میری یزداں شناسی کی پڑی دھوم
نظّارہ بنے آپ مری اہرمنی کا

دونوں سے کیا آپ کے احساں نے سبک دوش
رکھا نہ مجھے دیں کا، نہ دنیائے دنی کا

اِک جانِ حزیں رہ گئی، لے لیجیے وہ بھی
حق اس پہ ہے کیا آپ کی گردن زدنی کا

راون پرستی

نہیں لنکا سے کچھ بھی کم ہے پنجاب
جسے دیکھو یہاں باون گزا ہے

ہُوا تیار مذہب کا پڑا دا
مگر جھگڑا وہی ڈیڑھ اینٹ کا ہے

خدا کو چھوڑ بیٹھے لالہ و شیخ
پڑا شیطان گھر گھر پج رہا ہے

کوئی کرتا ہے احمدؐ کی غلامی
مگر بنتا بروزی مصطفےٰ ہے

کوئی لیتا ہے مُنھ میں رام کا نام
مگر کہتا ہے راون ہی خدا ہے

ٹھٹک کر رہ گیا ہے پیکرِ عقل
تماشا پُتلیوں کا ہو رہا ہے

(۲۱ر نومبر ۱۹۱۷ء)

جواہر ریزے

جائزہ ہند میں اسلام کا ہم نے جو لیا
تو مساجد کے عوض چند شوالے نکلے

نہ غزالی ہے نہ رازی ہیں کتب خانوں میں
میز پر مِل ہیں جو بستر سے میکالے نکلے

شرک سے جا کے یہ کہہ دے کہ ہے توحید وہ جنس
جو نہ روکے سے رُکے اور نہ نکالے نکلے

وادیٔ عشق میں کانٹوں نے نکالا جب سر
پیشوائی کے لیے پاؤں کے چھالے نکلے

اس شرافت کے عوض جس سے خجل ہو دولت
چند بوسیدہ و فرسُودہ قبالے نکلے

نہ فضیلت رہی باقی نہ شجاعت قائم
مدتیں ہو گئیں یاروں کے دوالے نکلے

لفظ سازی

ستارۂ صبح کی ایک بڑی خصوصیت صحافتی ادب میں لفظ سازی ہے۔ انھوں نے اپنے ادب میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں اور نئی اصطلاحیں اس کثرت سے استعمال کیں کہ صحافتی ادب کی زبان ایک علمی زبان اور مستند زبان ہوگئی۔ ان کے ہاں لفظ سازی کے دو اصول تھے۔ (۱) ہندی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا ملاپ اور (۲) فارسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ کا استعمال۔ (۳) اسی کے ساتھ ادبی الفاظ کو سیاسی معنی میں استعمال کرنا اور محاورات اردو اور عربی کے ٹھیٹھ اور مرکّب الفاظ کو اصطلاحات اور تلمیحات کی شکل میں بیان کرنا۔ (۴) معاصر ایڈیٹروں کے لیے نئے نئے الفاظ استعمال کرنا مثلاً حریفانِ صحافت، موقر جریدہ نگار۔ (۵) فارسی عربی مرکب الفاظ مثلاً حریفانِ بادہ پیما، صلائے خاص، مجتہدانہ دست گاہ، کشمکشِ ثقل، بناگوشِ انتقاد، مجلاتِ ادبیہ، رجعت پسند، یک بام و دو ہوا، فاضلِ متبحر، تحیر خیز انکشافات، سوقیانہ انداز، مبتدیانہ مضمون، فرسودہ بساط، پنجۂ استبداد، للہی ایذا رسانی، مالہٗ و ماعلیہ، شائبۂ ریا، ابلیسانہ جھوٹ، چاندی ٹکلیاں، جالب الفلوس اخبار، شبانہ روز لابہ گری، زرتار کلغی، اندامِ نحافت، انصاف پژوہی۔

عربی الفاظ مثلاً ملون و محنا سہرا، مصادف (بمعنی مطابق) استمزاجاً و استصواباً، اصطباغ، مستحفظ، تفسیق و تکفیر، دارالدیامی، ایابہ آلآباد، انفاس ریاحین، الحانِ طیور، موقت الشیوع، حضرت طاعن، روحِ امتثال، مستجمع الصفات، معرّا، استشار کامل، اجتناب، لومۃ لائم، مرغانِ اولی اجنحہ، تبختر و استکبار، فاطبۃً، انجذاب، اکاذیب و اباطیل، ابکار الافکار، سفیہانہ جدّتِ طبع وغیرہ وغیرہ۔

اردو کے محاورے بھی انھوں نے خوب استعمال کیے۔ مثلاً لٹھ مار مار کر پلپلیھن نکال دیا، شیطان کی آنت کی طرح طویل، نیا شوشہ چھوڑنا، چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا، حاتم کی گور پر لات مارنا، طرح دے کر خاموش ہوجانا، رسّی کو دراز کرنا، قلندر کی ڈگڈگی بجانا۔ نئے الفاظ مثلاً فخندہ لاہور کے مجازی خدا، رفعِ حاجت کے لیے ادب کھانا یا مولوی محبوب عالم صاحب کی دوستی کے لیے یارانِ سرپل، اسی طرح تقدس مآب حاجی، چکنے چپڑے خوش غلاف لیڈر، شبانہ روز لابہ گری، زرتار کلغی، کنبیانا، ممنوع الشرع۔ اسی طرح اسٹرائک کے لیے ایک نیا لفظ "اعتصاب" اور اسٹرائک کرنے والوں کے لیے معتصبین وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ایک طرف ان کی قدرتِ زبان و بیان کے گواہِ صادق ہیں اور دوسری طرف اخبار کو ایک متنوع، علمی اور ادبی پرچہ بنانے کے ساتھ ساتھ قاری کے علم میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

ستارۂ صبح میں خواجہ حسن نظامی اور تصوّف کے خلاف مسلسل اداریے نکلتے رہے اور اسی کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود اور قادیانیت کے خلاف بے شمار مضامین نکلے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے پیر پرستی کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ دوسرا محاذ صحافتی برادری کا تھا۔ ان کے بعض ہم عصر اخبار نویس ان کے خلاف اداریے اور مضامین لکھتے تھے۔ یہ ان کی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ ان اداریوں اور مضامین کو اسی طرح شائع کر دیتے اور اس کے بعد اس کے ہر ہر فقرہ کا رد اور توڑ لکھتے۔ اس رقیبانہ کش مکش میں ظفر الملک کا ایک "مضمون الاشرار" اور حسن نظامی کی بعض نظمیں" یا معاصر اخباروں کے بعض تراشے تھے۔ وہ کبھی بھی ان حملوں سے نہ ڈرے اور اپنی انھی سرگرمیوں میں مصروف رہے کہ جو اُن کا مطمحِ نظر تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں پیر جماعت علی شاہ اور ان کے مریدوں کی طرف سے ایک زبردست میموریل ان کے خلاف تیار کیا گیا جو گورنر کو بھیجا گیا۔ انھوں نے اس میموریل کے خلاف بھی ایک زبردست نظم لکھی۔ یہ نظم "ستارۂ صبح" کے یکم مارچ ۱۹۱۸ء کے پرچے میں شائع ہوئی۔ وہ معرکۃ الآرا نظم یہ ہے:

ستارہ صبح کا ہوں ڈر ہو کیا زحل سے مجھے
ڈرا رہے ہیں وہ اپنے میموریل سے مجھے

یہ زندگی ہے تو کیا خوف ہے اجل سے مجھے
ملی ہے دینِ محمدؐ کی سرمدی دولت

نکالنا ابھی طوفاں ہے اِک بغل سے مجھے
جگر کے سوز سے آنکھ آشنا ہوئی ہی نہیں

کہ لکھنے آتے ہیں مضمون دستِ شل سے مجھے
مجھے بھی نکتہ تصوّف کا ایک ہے معلوم

یہ لازوال سعادت ملی ازل سے مجھے
میرا یہ ہاتھ ہے اور دامن پیمبرؐ ہے

وہ کیوں دکھاتے ہیں پھر روشنی کنول سے مجھے
مَیں آفتاب ہوں اِسلام آسماں ہے میرا

تو کیا غرض ہو کسی گنبدِ خلل سے مجھے
ٹھہر گئی میری اِک آنکھ سبز گنبد پر

حدیث نے مجھے پہنچا دیا ہے قرآں تک
کہ ذوقِ علم میسّر ہوا عمل سے مجھے

ستارۂ صبح سے سُبک دوشی اور حیدر آباد روانگی

نظام حیدر آباد دہلی اور علی گڑھ کے لیے حیدر آباد سے آئے۔ ظفر علی خاں ۲۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ان سے ملے اور جب نظام حیدر آباد علی گڑھ گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ گئے۔ اس سفر سے واپس آکر جو مقالۂ افتتاحیہ آپ نے درج کیا تھا اس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ شاید حضور نظام نے ان کو عثمانیہ یونی ورسٹی میں کوئی عہدہ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ بہر حال ۲۵ر مارچ کو ایک خط مسٹر محمد اکبر نظر علی ہوم سیکرٹری حیدر آباد اسٹیٹ کا ملا کہ اعلیٰ حضرت نے

از راہِ خسروانہ ایک فرمان بدیں مضمون نافذ فرمایا ہے کہ آپ کو حیدرآباد بُلا کر آپ کے سابقہ عہدے پر بحال کیا جائے۔ اس عہدہ کی خدمات کے علاوہ آپ سے عثمانیہ یونی ورسٹی کے متعلقہ کام میں بھی مدد لی جائے گی۔ بس آپ اس فرمان واجب الاذعان کا امتثال کیجیے۔ اس طرح وہ یکم اپریل سے ستارۂ صبح سے دست بردار ہو گئے اور مہر تاریخ کو حیدرآباد پہنچ کر انھوں نے اپنے کام کا جائزہ لیا۔ (بعض صاحبان کا خیال ہے کہ ان کو پنجاب سے نکلوانے میں خود گورنر پنجاب اڈوائر کا اشارہ تھا جنھوں نے ان احتجاجات اور میموریل کے زیر اثر ان کو ایک نئے عہدہ کا لالچ دلوا کر لاہور سے باہر بھیج دیا)۔ بہرحال وہاں بھی ان کا قیام زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اور انھیں اکتوبر ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد سے واپس آنا پڑا۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کا نام اور ضیاء الحق ہاپڑی کا نام لیا جاتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس کا اعتراف بھی کر لیا لیکن بعد میں مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی پر ہمدرد میں زبردست اعتراضات کیے اور ان کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ اور رئیس احمد جعفری نے سیرتِ محمد علی میں اس پورے واقعہ پر روشنی ڈالی ہے جو حسب ذیل ہے:

مولانا محمد علی کا نقطۂ نظر

مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ہمدرد میں خواجہ حسن نظامی پر اعتراضات وارد کیے۔ اور لکھا کہ بقول خواجہ حسن نظامی مولانا ظفر علی خاں کا اخبار ستارۂ صبح نکل رہا تھا۔ اس میں تصوف کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے۔ اس واسطے مجھے مولانا ظفر علی خاں صاحب سے سخت اختلاف تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد بُلائے گئے اور اعلیٰ حضرت کی ان پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں۔ حسن نظامی صاحب کو ایک صاحب (ضیاء الحق ہاپڑی) نے حیدرآباد سے لکھا کہ مولانا ظفر علی خاں اعلیٰ حضرت کو پان اسلام ازم کے سبق پڑھا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ اعلیٰ حضرت اس امر کی وجہ سے کسی بَلا میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ جب انھیں یہ خط ملا تو سلطنتِ آصفیہ اسلامیہ کی حمایت میں اور مولانا ظفر علی خاں کے اثر کے نقصانات سے بچانے کے لیے انھوں نے دِلّی کے چیف کمشنر سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دُوں گا۔" خواجہ حسن نظامی نے اپنی صفائی میں جو بیان دیا اُس سے میں مطمئن نہیں ہوا۔ یاد رکھیے کہ یہ زمانہ جنگِ عظیم کا تھا اور اس جنگِ عظیم میں بھی یہ وقت توڑ کا تھا۔ جب کہ جرمن فوج جنرل گاف کے زیر کمان کاسپین کے موقف کا قلع قمع کر کے دراتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی پھر یہ بھی یاد رکھیے گا کہ غریب ظفر علی خاں صاحب کو کرم آباد میں نظر بند رہتے ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے کہ

انھیں کُتّے نے کاٹا اور کسولی جانے کے بعد کسی طرح شملے پہنچ گئے۔ اور بہ ہزار وقت اڈوائر کو راضی کر کے رہا ہوئے اور حیدر آباد پہنچے۔ ترک اور جرمن حلیف دونوں کے دونوں برطانیہ سے برسرِ پیکار ہیں اور ٹائمز آف انڈیا کا سابق ایڈیٹر مسٹر فرنیز انگلستان کے "ڈیلی میل" میں وہ مضمون شائع کرا چکا ہے جس میں مشرقی دھمکی کو واضح کرنے کے لیے دُنیائے مشرق کا ایک نقشہ دیا گیا تھا۔ کہ اس پر ایک سیدھا تیر قسطنطنیہ سے دہلی تک کھینچ کر بتایا گیا تھا کہ ترکی کے پایۂ تخت سے لے کر ہندوستان کے پایۂ تخت تک دو رویہ مُسلمانوں کی آبادی ہے۔ یا مُسلمانوں کی کثرت ہے اور ہندوستان کے وائس رائے چیمس فورڈ اس خوف سے دہلی میں زعمائے ہند کا وہ اجتماع کر چکے ہیں جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی جیسے اس وقت کے انگریز دوست شریک کیے گئے۔ بلکہ تلک مہاراج کا ایک نائب بھی مدعو کیا گیا تھا تاکہ سب مل کر اور بالخصوص زعمائے ہند وہ تدابیر سوچیں اور انھیں اختیار کرنے کا حتمی وعدہ بھی کریں، جن سے ترکوں کی اِسلامی فوج ہندوستان میں داخل اور یہاں فتح یاب نہ ہو سکے۔ اور باوجود یہ کہ مسز بیسنٹ اور ان کے دو رفقا نظر بندی سے رہا کیے جا چکے تھے۔ 'علی برادران' کے متعلق کونسل میں صاف کہہ دیا جا چکا ہے کہ ان کی صورت مسز بیسنٹ سے مختلف ہے۔ ایسے وقت میں خواجہ صاحب چیف کمشنر کے پاس جاتے ہیں جبکہ ظفر علی خاں حیدر آباد بُلا لیے گئے تھے۔ وہ جا کر کہتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کی ان پر بہت مہربانیاں ہو رہی ہیں اور یہ کہ وہ ان کو پان اِسلام اِزم کا سبق پڑھا رہے ہیں"۔ [۲۵]

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی خاص سازش کے تحت یا ان سے ذاتی دشمنی کے سبب یا سیاسی اختلافات کے باعث ان کے خلاف یہ ریشہ دوانیاں کی گئیں۔ (یاد رہے کہ ضیاء الحق صاحب وہی بزرگوار ہیں جنھوں نے "پولیٹیکل گرگٹ" کے نام سے ایک رسالہ ان کے خلاف شائع کیا تھا جس میں انھیں نہایت رکیک الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ بعد میں یہ رسالہ ظفر الملک ایڈیٹر الناظر کے ایک مضمون کے اضافے کے ساتھ شائع ہوا کہ جس کا نام "پولیٹیکل گرگٹ" اور "الاشرار" تھا۔)

بہر حال ۱۹۱۹ء میں ان کے واپس آنے کے بعد ان کی سرگرمیاں سیاسی لحاظ سے بڑھ گئی تھیں، اس لیے انھیں جون ۱۹۲۰ء کو ایک خط حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سید علی امام نے تاج دارِ دکن کی طرف سے بھیجا جس میں یہ تحریر تھا:

"بذریعہ فرمان مصدرہ ۲۷ شوال ۱۳۳۶ھ میری گورنمنٹ کے سیغۂ ترجمہ کے ملازم ظفر علی خاں صاحب ساکن لاہور کو اپنے وطن میں رہ کر اپنی خدمت کا کام سرانجام دینے

کی اجازت اس شرط سے دی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کے پولیٹیکل معاملے میں کوئی دخل نہ دیں۔ مگر اب پایا جاتا ہے کہ نہ صرف انھوں نے اپنے ترجمے کے کام میں بے جا غفلت کی بلکہ اپنی ملازمت کی شرط کے خلاف انھوں نے اعلانیہ طور پر پنجاب کی پولیٹیکل کارروائیوں میں نمایاں حصّہ لیا ہے کہ ظفر علی خاں صاحب فوراً ملازمتِ سرکارِ اعلےٰ سے موقوف کیے جائیں۔"

دستخط مبارک

اس طرح انھیں مبلغ -/۶۲۵ روپے ماہوار جو ملتے تھے اور دو سو روپے ماہوار کا وہ عطیہ جو اُن کے صاحب زادے اختر علی خاں کو ملتا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ (۱۹۴۴ء-۱۹۴۵ء میں سر محمد یامین ممبر سنیٹرل اسمبلی نے ان کی پنشن کے اجرا یا تنخواہ کے دوبارہ ملنے کے لیے سعی کی تھی۔ اور اغلباً یہ روپیہ انھیں حکومتِ ہند کی سفارش پر نظام حیدر آباد کی گورنمنٹ سے مل گیا۔ [۳]

حواشی :

[۱] ۔ .. مرزا امان اللہ خاں وزیر آبادی کو ابتدا میں عملۂ انتظامیہ میں شامل کیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ مضمون نویسی کی مشق کریں، اگر وہ اہل ثابت ہوئے تو اُن کی خدمات عملۂ ادارت کے سپرد کی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ چالیس دن کے بعد نہ صرف "ستارۂ صبح" سے الگ ہو گئے بلکہ انھوں نے "الصباح" میں مولانا کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ بحوالہ تحریر مولانا ظفر علی خاں، ستارۂ صبح، لاہور، ۱۹۱۷ء۔

[۲] .. رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی، لاہور۔

[۳] .. نواب سر محمد یامین علی خان : نامۂ اعمال، لاہور۔

"زمیندار" کا دُوسرا دَور

۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگریس کا اجلاس اَمرت سر میں ہُوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس میں شرکت کی، اس لیے کہ ان کا زمانۂ نظر بندی ختم ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خلاف غلط فہمیوں اور اعتراضات کے جواب جلسۂ عام میں دیے اور واپس آکر وہ اپنے اخبار کو دوبارہ جاری کرنے کی فکر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اپریل کے آخر سے وہ اس اخبار کو دوبارہ جاری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا سالک مرحوم نے اس کے اجرا کی تاریخ ۲۰ر اپریل ۱۹۲۰ء لکھی ہے لیکن ۱۸ر مئی ۱۹۲۰ء کا جو شمارہ ہمارے پیشِ نظر ہے وہ دورِ جدید کا نمبر ۲۳ ہے۔ اس طرح اس اخبار کے دوبارہ اجرا کی تاریخ ۲۵ر اپریل ۱۹۲۰ء قرار پاتی ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب پنجاب میں مارشل لاء کے مظالم کی یاد دِلوں سے فراموش نہیں ہوئی تھی کہ اس زمانے میں تحریک عدم تعاون چل رہی تھی اور مولانا ظفر علی خاں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اگست ۱۹۲۰ء کو انھوں نے حضرو میں ایک تقریر کی اسی کی بنا پر وہ ۵ر ستمبر کو گرفتار کر لیے گئے۔ اور اکتوبر میں ان کو پانچ سال قیدِ سخت کی سزا سُنا دی گئی۔ اِس طرح مولانا ظفر علی خاں کی براہِ راست ادارت میں یہ اخبار اپریل سے لے کر ستمبر تک نکلا۔ (بعد میں اگرچہ اُس کو دُوسرے حضرات چلاتے رہے لیکن ہمارا نقطۂ نظر صرف ان کے دورِ صحافت کی خصوصیات کو بیان کرنا ہے اس لیے ہم اُن کے اُس دَور کے اخبار کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے۔

اداریے

(۱) ۱۸ر مئی ۱۹۲۰ء۔ عیسائیت سخت خطرہ کی حالت میں (مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے قلم سے)
(۲) ۲ر جون ۱۹۲۰ء۔ مشرق و مغرب۔ کیا یہ دونوں آپس میں مل سکتے ہیں؟
(۳) ۹ر جون ۱۹۲۰ء۔ مشرقی جان اور مغربی جان۔ دونوں کی قیمت کا فرق۔
(۴) ۱۰ر جون ۱۹۲۰ء۔ اعلیٰحضرت نظام الملک کا جدید فرمان اور مدیرِ زمیندار کی برطرفی کا حکم۔

(۵) ۴ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ برطانیہ کا دُشمن کون ہے اسکوینتھ یا لائیڈ جارج۔
(۶) ۱۵ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ ایک لفنگا کرنیل۔
(۷) ۱۷ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ پھر وہی پردۂ زنگاری کا معشوق۔
(۸) ۱۶ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ ایک طعمہ مچھلیاں دو، کش مکش آپس میں ہے۔
(۹) ۲۲ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ کشتگانِ سرکار فیض آثار۔
(۱۰) ۲۳ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ سرحدی ڈاکے۔
(۱۱) ۳۰ر جولائی ۱۹۲۰ء۔ ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام۔
(۱۲) ۱۰ر اگست ۱۹۲۰ء۔ لالہ لاجپت رائے اور کانگرس کا آیندہ اجلاس خاص۔
(۱۳) ۱۱ر اگست ۱۹۲۰ء۔ افریقہ کے بدنصیب ہندوستانی۔
(۱۴) ۱۴ر اگست ۱۹۲۰ء۔ ایک رانڈ دُکھیا کا نوحہ۔
(۱۵) ۱۵ر اگست ۱۹۲۰ء۔ منافقین سے ترکِ موالات کا حکم۔ مولوی مظہر الدین شیرکوٹی کے قلم سے)
(۱۶) ۲۸ر اگست ۱۹۲۰ء۔ مہاجرین کی واپسی اور اُس کی حقیقت۔
(۱۷) ۲۹ر اگست ۱۹۲۰ء۔ اینگلو اِنڈین اخبارات کی غلط بیانی۔
(۱۸) ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۰ء۔ مسٹر لائیڈ جارج حضرت غوث الاعظم کے دربار میں۔
(۱۹) ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۰ء۔ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام۔
(۲۰) ۲۸ر ستمبر ۱۹۲۰ء۔ عدم تعاون اور مسلمان۔ کونسلوں سے مقاطعہ۔
(۲۱) ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ تحریک عدم تعاون اور طلبا۔
(۲۲) ۶ر اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ ہندوستانی وفد کی مراجعت۔ (وفد خلافت)

اس تاریخ تک زمیندار مولانا ظفر علی خان کی موجودگی اور ادارت میں جاری رہا۔ اس کے بعد ان کی گرفتاری کی وجہ سے ان کی ادارت اور نگرانی کا دَور ختم ہو گیا۔ اب اخبار ملکیت تو اُن کی سرور رہتا لیکن ادارت کی باگ ڈور دوسرے ہاتھوں میں تھی۔ ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۰ء سے ان کا نام بحیثیت مالک درج ہوتا تھا۔

(۲۳) ۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ جورِ کہن کی تجدید۔
(۲۴) ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ خواجہ لائیڈ جارج بیدار ہوں گے مگر بعد از خرابیٔ بسیار۔
(۲۵) ۹ر نومبر ۱۹۲۰ء۔ کرنل ڈیجوڈ۔
(۲۶) ۱۳ر نومبر ۱۹۲۰ء۔ حکومتِ ہند کا اعلان۔
(۲۷) ۳۰ر اپریل ۱۹۲۱ء۔ وہ زمین جو آئین سے محروم ہے۔
(۲۸) ۸ر مئی ۱۹۲۱ء۔ لائیڈ جارج سے دو دو باتیں۔

نوٹ: چوں کہ ہمارے موضوع کا تعلق ظفر علی خاں کی صحافت سے ہے لہٰذا ہم صرف ان اخباروں کے متعلق کوائف پیش کریں گے جو ان کی ادارت میں نکلے۔ یہ اخبارات اپریل سے لے کر ستمبر تک کی اشاعت پر مبنی ہیں۔ اس لیے ماہِ ستمبر میں جب وہ گرفتار ہو گئے تو ان اخبارات میں بجائے مدیر کے مالک کا نام شائع ہوتا رہا۔

صفحۂ اوّل کے پہلے کالم کے حصّۂ نظم میں شمس لکھنوی نیاز فتح پوری، لال چند بسمل پشاوری، محمود اور خود مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں، فکاہات کے عنوان سے مولانا حمید سیالکوٹی کی فارسی نظم، ابُو القاسم امرت سری، تلوک چند محرومؔ، محمد حسین عرشی، کی فارسی نظمیں۔ عبدالمجید سالک اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار، احمق پھپھوندوی، انعام اللہ خاں ناصر حسن پوری، محمد حسین عرشی کی اردو نظمیں، مرزا بیضا خاں امرت سری کا سلام، محمد عبدالحکیم خاں، نشتر جالندھری، صبغت اللہ خاں نور مدراسی، عبدالمنعم خاں، لالہ لال چند فلک، حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء لائل پور، اور سلیم پونوی کی نظمیں اس دور کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان نظموں کا عنوان بھی زیادہ تر سیاسی طنز پر مبنی ہوتا تھا۔ اور شعرا اپنے جذبات کا اظہار شعر کی صورت میں پیش کر رہے تھے۔ زمین دار چوں کہ تحریک آزادی کا نقیب تھا اس لیے اس اخبار میں اس قسم کی نظمیں زیادہ شائع ہوتی تھیں۔ ذیل میں ہم چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

(۱) از شمس لکھنوی (سب ایڈیٹر "سخن سنج") — زمیندار ۹ر جون ۱۹۲۰ء

جتنا جی چاہے ستا لیں مجھے، بے داد کریں
دل شکن بات مگر کوئی نہ ارشاد کریں

گر دعا بھی کوئی لکھتے ہیں تو ہو جاتی ہے ضبط
ظلم اتنا تو نہ یہ بانیٔ بے داد کریں

خود بھی سنتے نہیں افسوس فسانہ غم کا
چاہتے ہیں کہ خدا سے بھی نہ فریاد کریں

(۲) نیاز فتح پوری۔ زمیندار۔ ۱۰ر جون ۱۹۲۰ء

حصولِ فطرت مقصد تھا فطرتِ اسلام
نہاں تھے قصر بہ آغوش خانماں بھی

حریفِ خاکِ عرب ہو سکا نہ آخر کار
غرورِ خسروی و افتخارِ کج کلہی

بنائے دولتِ اندلس بتا گئی ہم کو
نہ مٹ سکے گا ستم سے غرورِ بے گنہی

ہر اک شکست ہے سامانِ صد ہزار عروج
نوید نشۂ شب ہے خمارِ صبح گہی

(۳) پیامِ حافظ۔ از ابوالرشید محمد عبدالمجید خاں سالک اسسٹنٹ ایڈیٹر، زمیندار۔

روحِ حافظ سے کہا میں نے کہ اے عشق طراز
تیرا سینہ ہے نہاں خانۂ اسرارِ نیاز

تجھ سے میں پوچھتا ہوں سرِ معمائے حیات
کہ تجھے کہتے ہیں سب اہلِ صفا محرمِ راز

عشق کیا چیز ہے اک محنتِ حرماں انجام
صرف تعمیرِ اجل خال و خطِ حسنِ مجاز

جب فضا دہر کی ہے برقِ فنا سے معمور — کیا اُڑے اوجِ تجسس پہ عمل کا شہباز
سارے ہنگاموں کا انجام ہے جب خوابِ عدم — پھر یہ بے سُود ہے سب گوش و خروش و تگ و تاز
سُن چکا جب یہ خرافات ہلاکت تاثیر — ہنس کے کہنے لگا وہ نازشِ خاکِ شیراز
خیز و در کاسۂ زر آب طرب ناک انداز — پیشتر ز آنکہ شود کاسۂ سر خاک انداز
عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشانست — حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

تحریکِ عدمِ تعاون کے دوران زمیندار نے پورے طور سے عوامی حیثیت اختیار کر لی تھی اور خلافت کانفرنس، آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس اور رپورٹر کے برقی پیغامات، براہ راست زمیندار کے لیے ممالکِ اسلامیہ کی خاص خبریں اور تحریکِ عدم تعاون کے سلسلے میں لوگوں کے بیانات، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی مالٹا سے واپسی، ریلوے کی ہڑتال کا روزنامچہ، مارشل لا کے مظالم کا سلسلہ، ہنٹر کمیٹی کی ترتیب کی خبر اور اس کی تفصیل، ملفوظات مولانا محمود حسن صاحب قبلہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۲۰ء کے پرچہ میں باغیٔ ہندوستان کے عنوان سے ایک کارٹون شائع کیا گیا۔ جس میں ایک طرف ایک گیارہ سالہ فرزندِ اسلام ساکن قصور؛ جرم ملک معظم سے جنگ اور دوسری طرف کندن لال ساکن گجرات عمر دس سال، جرم ملک معظم سے جنگ؛ سزا حبسِ دوام بعبور دریائے شور، دکھایا گیا تھا۔ اور اس کے نیچے حسب ذیل عبارت درج تھی۔

سر مائیکل اڈوائر بدحواسی کے عالم میں چلّا کر "پنجاب باغی ہو گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہمیں اس ملک سے نکالنے کو ایکا کر لیا۔ فوراً مارشل لاء کی اجازت مرحمت ہو ورنہ ہندوستان میں بغاوت پھیل جائے گی۔"

لارڈ چیمس فورڈ (آنکھوں پر پٹی باندھ کر) "مناسب ہے۔ جنگی قانون جاری کر دیا جائے۔"

مسٹر مانٹیگو (نو مہینے کے بعد دہلی اور لاہور کی طرف منہ کر کے) "یہ مارشل لاء کن کے خلاف جاری کیا گیا تھا؟"

لارڈ چیمس فورڈ۔ "دشمنانِ ملکِ معظم کے خلاف، حکومت کا تختہ الٹنے کے خلاف۔"

سر مائیکل اڈوائر۔ "غداروں کے خلاف، باغیوں کے خلاف۔"

زمیندار۔ (تیرہ مہینے بعد لندن کی طرف منہ کر کے) "ان کی سُنیئے، یہ تو اپنی ہی کہیں گے۔ ان سے اتنا پوچھیے کہ ملکِ معظم کے خلاف بغاوت کرنے والے اور ہندوستان انگریزوں سے چھیننے والے وہ دس دس سال کے بچے تو نہیں ہیں جن کی تصویر ملاحظہ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ اگر اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے مارشل لاء نافذ کیا گیا تھا، تو بریں عقل و دانش

ببایدگریست۔

اس کارٹون اور زمیندار کے اس جرأت آمیز تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ کے خلاف کس ہمت اور جرأت کے ساتھ اپنے قلم کی نوک سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں اُتر پڑے تھے۔ چوں کہ یہ زمانہ ہنگاموں اور سیاسی تحریکوں کا تھا اِس لیے اس دَور میں سیاسی مضامین مقالات کا زیادہ زور رہا۔ ادبی مضامین تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔

اس اخبار کا صفحۂ اوّل عام طور سے سیاسی مضامین یا کسی خاص جلسے کی کارروائی اور مولانا ظفر علی خاں کی تقریر، ترک موالات پر مولانا شوکت علی کے بیانات یا کسی اخبار کے نمائندے کے بیان کے لیے وقف ہوتا تھا یا فکاہات کے عنوان سے خود ان کی اپنی نظم ہوتی تھی۔ ذیل میں ہم بعض اخبارات سے صفحہ اوّل کی اہم چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔

۳ر جون ۱۹۲۰ء۔ صفحہ کا عنوان ہے۔ "مدینہ میں ہم پر کیا گزری"۔ (۷۵ ہزار بھوک سے مَر گئے)۔

(۲) وفدِ افغانستان اور اسلامی شعار۔ (وفد افغانستان کے منصوری میں سحری و افطار کے پُرلطف اوقات)۔

(۳) ۱۰ر جون۔ حقیقی دوست کون ہے۔ عارف ہسوی۔

(۴) ۱۵ر جولائی۔ کمانڈر کنو وَردی کی صاف گوئی (فرینک جانسن سُولی پر لٹکا دیا جائے)۔ ڈائر کا کورٹ مارشل ہو اور اڈوائر قانون کی گرفت سے نہ بچنے پائے۔ (لندن کے اخبار انڈیا کے ایک نمایندہ کو ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق کمانڈر کنو وَردی کا بیان)۔

(۵) ۱۶ر جولائی۔ بمبئی کی افواہیں از قلم مولانا ابوالقاسم دلاوری۔

(۶) ۲۲ر جولائی "پیغمبر قادیان کا ترانہ"۔

تکمیل عمر بھر میرے القاب کی نہ ہو — ان پہ اگر اضافۂ سی آئی ڈی نہ ہو
بغداد کے سقوط کا قصّہ ہے ناتمام — جب تک کہ اس میں درج میری ڈاڑھی نہ ہو
کیا مصطفےٰؐ کے بعد نہ آیا مسیلمہ — پھر قادیاں میں کس لیے مجھ سا نبی نہ ہو

(۷) ۲۲ر جولائی۔ ملفوظات حضرت مولانا محمود حسن قبلہ (یعنی اس سپاس نامہ کا جواب، جو مسلمانان کان پور نے حضرت ممدوح کی خدمت میں بوقتِ ورُودِ کان پور پیش کیا تھا)۔

(۸) ۲۳ر جولائی۔ مہاتما گاندھی کے خلاف مسٹر مانٹیگو کی دھمکی۔ تحریکِ خلافت کو بزور دَبا دیا جائے گا۔ حکومتِ ہند کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا۔ مارشل لاء کی پیش گوئی عارف ہسوی کے قلم سے۔

(۹) ۱۴ر ستمبر۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا ایک اور خط مولانا عبدالباری کے نام۔

(۱۰) ۹ر اکتوبر۔ امریکہ میں جلسۂ خلافت۔ از علی محمد خاں۔ مولوی رحمت علی خاں پریذیڈنٹ مسلم ایسوسی ایشن آف امریکہ، صدرِ جلسہ کی خلافت پر تقریر۔

(۱۱) ۱۰ر اگست ۱۹۲۰ء۔ تہذیب کی سند عنقریب بولشیویکیوں کو ملنے والی ہے۔ عارف ہسوی کے قلم سے۔

(۱۲) ۱۱ر اگست ۱۹۲۰ء۔ انصارِ پشاور کی مہاجر نوازی۔ جوشِ اسلامی کے جانفزا نظارے۔ ایک مہاجر کے روزنامچہ کا ایک وَرق۔

(۱۳) ۱۴ر اگست ۱۹۲۰ء۔ تحفۂ صابری، فقیر عبدالعزیز صابر ایم اے، ایل ایل بی علیگ، سرحدی شعبہ اشاعت، خلافت کمیٹی بمبئی کی طرف سے مولانا شوکت علی خادمِ کعبہ کا سرحدی بھائیوں اور جملہ ہندوستانیوں کے نام پیام۔

(۱۴) ۱۵ر اگست۔ زمیندار کا اداریہ صفحۂ اوّل پر۔ از مولوی مظہرالدین شیرکوٹی شعبہ اشاعت مرکزی خلافت کمیٹی۔ بعنوان منافقین سے ترک موالات کا حکم۔

(۱۵) ۲۸ر اگست۔ اداریہ بعنوان پائندہ باد مصر۔ کبھی فرعون کی باری تھی اب دَور ہے موسیٰؑ کا۔

(۱۶) ۱۹ر اگست۔ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار کی راولپنڈی میں پرجوش تقریر۔

(۱۷) ۲۴ر ستمبر۔ مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری۔ ابنائے وطن کی طرف سے ہمدردی۔ گوجرانوالہ میں عظیم الشان جلسہ۔

(۱۸) ۲۸ر ستمبر ۱۹۲۰ء۔ ترک موالات اور مسلمان۔ مولانا شوکت علی صاحب کا پیغام۔

(۱۹) ۲۷ر اکتوبر۔ مسئلہ عدم تعاون اور مسلمان۔

(۲۰) ۹ر نومبر ۱۹۲۰ء۔ ظفر الملّت کے دردناک مصائب۔ سجن لاہور میں صبر جلال کا نظارہ (از معاصر زمانہ کلکتہ)۔

(۲۱) ۱۳ر نومبر ۱۹۲۰ء۔ مسلمانانِ بمبئی کا عظیم الشان جلسہ۔ کابل کے مہاجرین ہندی کا وفد۔ اور میر رحمت اللہ صاحب ہمایوں کا بیان۔

مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بعض اداریے:

ذیل میں ہم مولانا ظفر علی خاں کے اُس دَور کے زمیندار میں سے بعض اداریوں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جب کہ وہ زمیندار کے مدیر تھے اور ان کا نام بحیثیت مدیر کے سَرورق پر لکھا جاتا تھا۔ ان اقتباسات سے ایک طرف زمیندار میں مولانا کے اندازِ تحریر، اُن کا سیاسی

نقطۂ نظر اور اداریہ نویسی کے انداز کا پتا چلتا ہے۔

اداریہ ۔ ۱۰ر جون ۱۹۲۰ء

یہ اداریہ صدر اعظم سیّد علی امام صاحب کے فرمان واجب الاذعان کے سلسلے میں لکھا گیا۔ حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہم عالی کا ارشادِ اقدس سرآنکھوں پر، لیکن ہم نہایت ادب سے بارگاہِ معلّیٰ میں عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اس قسم کے فرامین ہم کو اور ہم جیسے لاکھوں نیازمندوں کو، جو حضرت تاج دارِ دکن کی دولت کے دُعاگو ہیں، دولتِ آصفیہ کے سلوکِ وظیفہ خوری سے خارج کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس جاں نثارانہ محبّت، اس فدا کارانہ عقیدت اور اس غیر متزلزل ارادت کو ہمارے دل سے نکال دینے پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے، جو ہمیں میر عثمان علی خاں کی ذاتِ گرامی سے وابستہ کیے ہوئے ہے۔ جو احسانات حضرت اقدس و اعلےٰ نے مسلمانانِ ہند پر کیے ہیں۔ اور علوم اور فنون کے احیاء اور ارباب حاجت کے انجاحِ مرام میں جس خسروانہ فیاضی کا اظہار آپ نے وقتاً فوقتاً فرمایا ہے، اس کی یاد ہمارے اطمینان پذیر قلوب کی گوشہ گیر ہے۔ یہ ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور ہمیشہ چلی جائے گی۔

جن صاحبان کو بصارت دی گئی ہے مگر بصیرت نہیں مرحمت ہوئی، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس قسم کے نوبہ نو فرامین، جنھوں نے ظاہر بین اسلامی حلقوں میں ایک کھلبلی سی ڈال دی ہے، کیوں جاری کیے گئے ہیں۔ اور ان کا سرچشمۂ تحریک کون سی قوت ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حضرت محی المِلّۃ والدین اپنے پہلو میں ایک سچا دِل رکھتے ہیں جو دردِ اسلامی سے ہم سب کی طرح بے تاب ہے۔ کیا خلافتِ اِسلامیہ کی تباہی سے ان کے قلبِ مبارک پر کوئی اثر نہیں پڑا؟ کیا اسلام کو دم توڑتے ہوئے دیکھ کر ان کی رُوح کو صدمہ نہیں پہنچا۔ کیا اس جاں گزا صدمہ، اس رُوح فرسا مصیبت سے متاثر ہو کر ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں ڈبڈبا آئے۔ ان کے سینہ بے کینہ سے آہیں نہیں اُبھریں۔ اور ان آہوں نے عرشِ معلّیٰ سے ٹکرا کر غیرتِ باری کے پیمانے کو چھلکانا نہیں چاہا۔ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہو تو حضرت میر عثمان علی خان مدظلہ کے نکتہ چین سچے اور ہم جھوٹے۔ لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ ہاتھ جس نے فرمانِ امتناعِ مجلسِ خلافت، فرمانِ اخراج و نظر بندی شیدایانِ اسلام اور فرمانِ برطرفیِ خاکسار مدیر زمیندار پر اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ کس قہرِ امان قوت کی گرفت میں تھا یہی قوت تو تھی جس نے حضرت خلیفۃ المسلمین سے ترکی کے محبانِ وطن کی تکفیر کا فتویٰ صادر کرا دیا۔ اور جب

سلطانِ اعظم کی یہ حالت ہو تو پھر تاجدارِ دکن سے کس ہوش مند کو گلہ ہو سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ ہم نے پولیٹیکل معاملات میں حصّہ لیا ہے اور یہ اتنا بڑا جُرم ہے کہ جس کی پاداش میں جناب ریذیڈنٹ صاحب حیدرآباد اور جناب صدر اعظم صاحب حیدرآباد دکن ہم کو اس طرح سرکارِ عالی کی ملازمت میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ جس طرح متانور کے نظر بندوں کو کھُلے بندوں خلافت کی حمایت میں لب کشائی کرتے نہ سُن سکتے تھے۔ سو ان دونوں بزرگواروں کو واضح رہے کہ یہ تو سوا آٹھ سو روپے ہیں، ہم اپنی جان تک بوقتِ ضرورت خلافتِ اسلامیہ پر نثار کر دینے کے لیے حاضر ہیں کہ پالیٹکس سے یقیناً ان حضرات کی مراد تحریکِ خلافت میں حصّہ لینے سے ہے۔

رہی "ترجمہ کے کام میں بے جا غفلت" سو ہمیں اپنے جُرم کا اعتراف ہے لیکن حضرت میر عثمان علی خاں کی عطا پاشش اور خطا پوشش سرکار ایسے جرائم کو بنگاہ اغماض دیکھ سکتی تھی اور ہم اس عُذر کو اپنی شفاعت میں پیش کر سکتے تھے کہ جب اسلام کے گھر ہی کو آگ لگ رہی ہو تو ہم پہلے اس آگ کو بجھائیں یا تاریخ انگلستان کا ترجمہ کیا کریں۔ لیکن یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل جُرم کے اِرتکاب کے لحاظ سے ہم حضرتِ اقدس کے معتوب نہیں ہیں، بلکہ ریذیڈنٹ صاحب حیدرآباد اور ان کے ان بھائی بندوں کے معتوب ہیں جن کی چیں جبیں زنجیریں بن کر مولانا فاخر کے پاؤں کو بوسہ دے چکی ہیں۔

بہر حال برطرف کیے جانے کے باوجود ہم اپنے آپ کو اعلےٰ حضرت تاجدارِ دکن کا دِرم خریدہ غلام سمجھتے ہیں اور صلہ کی توقع یا کسی انعام کی خواہش کے بغیر وقت نکال کر ترجمہ کا کام برابر انجام دیتے رہیں گے۔

(۲) اداریہ ذیل میں مولانا نے ہندوستان پر برطانوی حکومت کے سیاسی اقتدار اور ہندوستان پر اقتصادی دباؤ اور رائے عامہ کی آزادی کو سلب کرنے پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

اداریہ۔ ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ

مشرق اور مغرب۔ کیا یہ دونوں مل سکتے ہیں؟

"مفسدہ ۱۸۵۷ء کی ہولناک داستان اگرچہ پُرانی ہو چکی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے وہ اربابِ بصیرت کے لیے ہمیشہ تازہ رہے گی۔ برطانیہ کو اُس وقت ایک نئی بنیاد پر سلطنت کا عظیم الشان قصر تیار کرنا پڑا۔ یہ بنیاد ملکہ وکٹوریہ آں جہانی کا وہ مشہور شاہی اعلان تھا۔ جس نے ہندوستانیوں کے دِلوں میں ایک اجنبی حکومت کے متعلق محبت اور اعتماد کے جذبات پیدا کر

دیے ۔ اگر ہندوستانیوں سے اس وقت یہ معاہدہ نہ کیا جاتا کہ عدل و انصاف کے معاملے میں کالے اور گورے یکساں ہیں۔ اور دونوں کو یکساں طور پر ترقی اور کامیابی کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔ تو برطانیہ کو ۶ ہزار میل کے فاصلے سے ۳۰ کروڑ باشندوں پر حکومت کرنے میں سخت دشواریاں پیش آتیں ۔ ان سے نصف صدی پیشتر کے برطانوی مدبروں کو خوب معلوم تھا کہ اگر ہندوستان میں تالیفِ قلوب کی حکمتِ عملی سے کام نہ لیا گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ حکومت کو اپنی انتظامی کل چلانے کے لیے ہندوستانی ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے ان کی تعلیم پر خاص توجہ کی گئی تاکہ کلرکوں اور محاسبوں کی ایک جرار جمعیت تیار ہو جائے۔

ایک عرصہ تک ہندوستانی من حیث القوم اپنی حالت پر قانع رہے۔ غلہ سستا تھا۔ گھی اور دودھ کی فراوانی تھی ۔ سرکاری ملازمت سب سے بڑی عزت اور کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ کیوں کہ حکام سے میل ملاپ اور تعلقات قائم کرنے کا یہ ایک زبردست ذریعہ تھا۔ ہندوستانیوں کا مشرقی اخلاق انھیں انگریزوں کو غیر معمولی وقعت اور عزت سے دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ لیکن چوں کہ ملازمت کی غلامی کا طوق گلے میں پڑ چکا تھا اس لیے ہندوستانیوں میں شرم ناک خوشامد اور چاپلوسی کا مرض پیدا ہو گیا ۔ یہ ایسا خوفناک مرض ہے کہ مریض کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی جسمانی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں زائل ہوتی ہیں اور اس کی سیرت بالکل مسخ ہو چکی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس متعدی مرض میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے ۔

آخر مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب نے جو ہندوستانیوں کے دلوں پر پُراسرار طریق سے اپنا اثر ڈال رہی تھی، ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دیں ۔ فرزندانِ ہند اپنی پستی، کمزوری اور ذلت کو محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے حقوق اور مطالبات کے حصول کے لیے آئینی جد و جہد کے گُر پر عمل کرنا شروع کر دیا اور حکومت کے ذمہ دار اراکین سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ انھیں حکومتِ خود اختیاری نہیں دے دی جاتی ۔

ہندوستان کے انگریز حکام اور اینگلو انڈین حضرات بھلا اس آزادی اور صاف گوئی کی کیسے تاب لا سکتے تھے۔ ان کو یہ خطرہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر ہندوستانیوں کی اس آزادی اور بے باکی کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو پھر ہندوستان کا بہشت ان کے لیے دوزخ بن جائے گا۔ اس خطرے نے انگریز اور ہندوستانیوں میں حقارت اور نفرت کی ایک ایسی وسیع خلیج حائل کر دی ہے کہ اب اس پر مصالحت کا پُل باندھنا ناممکن نظر آتا ہے۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمارا اپنا گھر ہے اور ہم خود اس کا انتظام کریں گے۔

انگریز کہتے ہیں کہ چوں کہ تم اپنے گھر کا بخوبی انتظام نہیں کر سکتے۔ اِس لیے تمھیں اس وقت تک مالک اور خود مختار نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ تم میں انتظامی قابلیت اور سلیقہ پیدا نہ ہو جائے۔ ہندوستانیوں نے انتظامی قابلیت کے جوہر دکھانے شروع کیے تو اینگلو انڈین حکام نے جابرانہ قوانین کے حربہ سے ہندوستانیوں کے جذبات کو دبانا چاہا۔ کون نہیں جانتا کہ قانونِ مطابع، قانونِ تحفظِ ہند، قانونِ امتناعِ مجالسِ باغیانہ اور قانونِ رولٹ نے ہندوستان کی امید افزا تحریکوں کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو ژالہ باری ایک سرسبز اور لہلہاتے کھیت کے ساتھ کرتی ہے۔

مگر کیا قومی تحریکیں جابرانہ قوانین کی طاقت سے فنا کی جا سکتی ہیں؟ گو حکام نے ہندوستانیوں کے دسیوں اخبارات کا گلا گھونٹ ڈالا اور سمجھ لیا کہ اب ہندوستانیوں کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی اور "سڈیشن" کے جراثیم خود بخود ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن حکام کو اپنے تلخ تجربہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ "سڈیشن" کے جراثیم جابرانہ قوانین سے اور زیادہ نشو و نما پاتے ہیں۔ اخبارات کو بند کیا تو کیا اصلی چیزوں کو بھی، جو تمام اخبارات کا منبع اور سرچشمہ ہیں، کوئی انسانی طاقت بند نہیں کر سکتی۔ بند کرنا تو کہیں رہا، جابر سے جابر اور ظالم سے ظالم شخص بھی اس کے مسخر کرنے اور اس پر قابو پانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قانون رولٹ حکام اور رعایا کی باہمی کش مکش اور زور آزمائی کا آخری منظر تھا۔ چوں کہ اس قانون سے رعایا کی جائز آزادی کے سلب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے تمام ہندوستان میں متحدہ اور متفقہ طور پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ حکام نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس مخالفت کو مکھی کی بھنبھناہٹ سے زیادہ وقعت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کی ناراضی نے ایک عالم گیر ہڑتال کی شکل اختیار کر لی۔ حکام اس ہڑتال سے اور زیادہ برافروختہ ہوئے۔ پنجاب میں یہ برافروختگی مارشل لاء کی صورت میں نمودار ہوئی اور تاآخر حکام اور رعایا کی کش مکش کی تاریخ جلیاں والہ باغ میں خونیں حروف سے لکھی گئی۔ اس تاریخ کے لکھنے والے سر مائیکل اڈوائر اور جنرل ڈائر ہیں جن کے کارناموں نے مہذب دنیا میں ایک خاص گونج پیدا کر رکھی ہے۔"

زمیندار کا ایک اہم مقصد معاصر انگریزی اخباروں کی بعض خامیوں کا اظہار کر کے ان کی انوکھی منطق کا تار و پود بکھیرنا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ پہلے اینگلو انڈین اخبارات کے استدلالوں کو پیش کرتے تھے اور پھر اسی کے ساتھ ان کی تردید کرتے وقت اس طرح ادبی انداز میں لکھتے تھے کہ ان کا سارا تار و پود بکھر جاتا تھا۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:

انھوں نے ایک اداریہ، جس کا عنوان تھا "برطانیہ کا دشمن کون ہے۔ اسکویتھ یا لائیڈ جارج؟" لکھا۔

اس میں انھوں نے " انگلش مین " کے دلائل کو رد کرنے کے بعد اس طرح سے لکھا:

" اپنے بے سروپا مضمون میں احرار ترک، مسلمانِ ہند، اعضائے مجلس خلافت اور مسٹر محمد علی پر جو سوقیانہ آوازے " انگلش مین " نے کسے ہیں، وہ کچھ نئے نہیں۔ اس قسم کی صلیبی پھبتیوں نے پہلے بھی ہمارے کانوں میں ناسور ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آئے دن ہم کو سنایا جاتا ہے کہ مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے رفقاء دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ مسلمانانِ ہند بجز چند خاں بہادروں اور سرکاری عہدہ داروں اور " جی حضوری " جاہ طلبوں کے، کہ باصطلاح " انگلش مین " یہی لوگ " صحیح الدماغ " اور تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں، خلافت کے مفہوم میں سلطان المعظم کے دنیوی اقتدار کو داخل سمجھ کر باغیانہ شوریدہ سری کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ خلافت کمیٹی کے اعضا بھی اپنے مضحکہ انگیز مطالبات کے لحاظ سے برطانیہ کے دشمن ہیں۔ اور مسٹر محمد علی تو شوریدگانِ ازلی میں سے ہیں ہی۔ یہ سب کے سب کشتنی و گردن زدنی ہیں۔ ان کی آواز دبادی جاتی چاہیے۔ ان کا گلا گھونٹ دیا جانا چاہیے۔

گالیوں کا جواب گالیاں ہو سکتی ہیں۔ ہم بھی اس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ جواب عموماً اس وقت دیا جاتا ہے۔ جب معقول جواب بن نہ پڑے اور آدمی کھسیانا ہو جائے۔ مسئلۂ خلافت کا مسلمانوں کے لیے جزوِ ایمان ہونا، اس ایمان کی بقا کے لیے اس بات کا لازمی ہونا کہ جو شرائطِ صلح مسٹر لائیڈ جارج اور ان کے حلیفوں نے ترکوں سے منوانی چاہی ہیں وہ منسوخ کر دی جائیں۔ اور انگریز ان علاقوں کو خالی کر دیں جنھیں اسلام اپنا قومی گھر سمجھتا ہے۔ مسئلۂ تحفظ ہند کا مسئلہ تحفظ خلافت مقدسۂ اسلامیہ کے ساتھ وابستہ ہونا۔ دنیا کے امن و امان کی بحالی اور ہندوستان کے اضطراب کے سدِ باب کا مسلمانوں اور ہندوؤں کے متفقہ مطالبات کے تسلیم کر لیے جانے پر موقوف ہونا، یہ سب وہ باتیں ہیں جو قرآن و حدیث کے کھلے ہوئے احکام اور سیاسی مصالح کے مسلمہ حقائق کی سفارش پر بکرات و مرات حکومتِ برطانیہ کے گوش گزار کی جا چکی ہیں۔ اور ان کا اعادہ محض تحصیلِ حاصل ہے "

انھوں نے آگے چل کر فرانس اور انگلستان کے تعلقات کی کشیدگی پر اس طرح سے اظہارِ خیال کیا۔ اور یوں لکھا ہے:

" اس بارے میں ہم صرف چند فقروں پر اکتفا کریں گے۔ پیرس جو کل تک لندن کے ساتھ دانت کاٹی روٹی کھاتا تھا، آج دانتا کلکل پر اتر آیا ہے۔ اور اس کی وجہ " انگلش مین " نے خود بتائی ہے۔ خدا ہی ہے جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طناب رفاقت مسٹر لائیڈ جارج کی ہوسِ جہانگیری کے نو بہ نو جھٹکوں سے سلامت رہے اور ٹوٹ نہ جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسٹر لائیڈ

جارج نے اپنی طرف سے اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ ہر ناشدنی حرکت کر گزریں گے۔ ہر ناکردنی فعل کے مرتکب ہوں گے مگر ترکوں کو صفحۂ ہستی سے ضرور مٹا کر چھوڑیں گے۔ بولشویکوں کے ساتھ باوجود ان کی اس "وحشیانہ سفاکی" کے جس کے اشتہار دُنیا بھر میں دیئے جا رہے ہیں، یارانہ گانٹھیں گے اور اپنے اس بے اصولے پن کو یہ کہہ کر حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ کسی قوم کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ اس قوم کے اخلاق بھی پسندیدہ ہوں۔ فرانسیسیوں کو موصل کے تیل کا کچھ حصہ بانٹ دیں گے کہ اس مُنہ تھتھاتے ہوئے دوست کے آنسو پچھ جائیں اور وہ ترکوں کے ساتھ خفیہ سازباز کرنے سے باز آجائے لیکن یہ ترکیبیں کارگر ہوتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ پولینڈ میں مسٹر لائیڈ جارج کی حکمتِ عملی کا دو فصلاپن کہ مُنہ سے تو حسبِ معمول صُلح صُلح پکارتے چلے جاتے ہیں لیکن در پردہ کروڑوں روپے اور لاکھوں من بارُود سے پولینڈ والوں کی مدد کر کے اسے رُوس کے خلاف اُبھار رہے ہیں۔ بولشویکوں کے دلوں میں انگلستان کے خلاف نفرت آمیز غصہ کا طوفان پیدا کر رکھا ہے۔ فرانس کے ساتھ بھی مسٹر لائیڈ جارج کا سلُوک کچھ اچھا نہیں۔ اور اگر مشرقِ وسطیٰ میں آپ کی ریشہ دوانیوں کو وہ معاندانہ رقابت کی نظر سے دیکھے تو ہمیں ذرا تعجب نہیں ہو سکتا۔

مسٹر لائیڈ جارج موسیو ملیرینڈ سے مُلاقات کر چکے ہوں گے۔ موصل کا تیل بقدر دس بیس کنستروں کے آپ نے اپنے محترم حلیف کے سامنے ضرُور پیش کیا ہوگا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس دھمکی سے آپ نے موسیو ممدُوح کی تواضع کی یا نہیں جو "انگلش مین" نے اپنی رگِ گردن سے مستعار لے کر انھیں سمجھائی ہے۔ لیکن نتیجہ اس ملاقات کا یہ نکلتا ہے کہ ۲۷ جون ۱۹۲۰ء کو فرانسیسی دار المباحثہ میں جب سابق وزیرِ اعظم موسیو ملیرینڈ نے فرانس کی شاہی حکمتِ عملی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے حکومت کو انگریزوں کے قدم بقدم چلنے کا مشورہ دیا جو مشرق میں اپنے حریف پر گھونسوں کا تار باندھ دیا کرتے ہیں خواہ مشت زن حریف بھی ان کی کنپٹی پر برابر کے گھونسے کیوں نہ جما دے۔ تو یہ مشورہ رَد کر دیا گیا۔ موسیو ملیرینڈ نے اس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے ایشیائے کوچک اور شام کے جنگی مصارف کے لیے پچاس کروڑ فرانک کی منظوری طلب کی اور بیان کیا کہ فرانس ان مشرقی ممالک میں آیندہ کوئی کارروائی بزورِ شمشیر نہ کرے گا بلکہ میرانہ ساز و باز کو اپنی مشرقی حکمتِ عملی کا نصب العین قرار دے گا۔"

فرانس کا یہ اعلان اپنا شارح آپ ہے۔ اس اعلان سے اس خبر کی تصدیق ہو گئی جو "زمیندار" کی کسی گزشتہ اشاعت میں درج ہو چکی ہے کہ فرانس مصطفےٰ کمال پاشا۔ بر

صُلح و آشتی کے ڈورے ڈال رہا ہے۔ پچاس کروڑ فرانک کی رقم جو فرانس کی وزارتِ جنگ نے طلب کی ہے، وہ ایشیائے کوچک میں جنگی مصارف پر خرچ نہ کی جائے گی بلکہ اس سے امیر فیصل اور مصطفےٰ کمال پاشا کو اس طرح مدد دی جائے گی، جس طرح مسٹر لائیڈ جارج پولینڈ کو دے رہے ہیں۔ گویا اب عراق عرب میں انگریزوں کو تین دشمنوں کی متفقہ یورش کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ایک مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے گرد حلیف، دوسرے امیر فیصل کہ انھوں نے بھی پاشائے ممدوح کے دوش بدوش ہو کر لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور تیسرے فرانسیسی، جنھیں مسٹر لائیڈ جارج نے پہلے تو علاقہ رائن میں بطور خود پیش قدمی کرنے کے موقع پر متکبرانہ لہجہ میں ڈانٹنے سے، اور پھر موصل چکا دینے سے اپنا دشمن بنا لیا' — الخ

(۲) ایک طعمہ مچھلیاں دو، کش مکش آپس میں ہے۔ ذیل کا اداریہ سیاسی کش مکش کے اظہار کے ساتھ مولانا کے اس اسلامی عقیدہ اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے جو ان کا سرمایۂ ایمان اور توشۂ آخرت تھا۔ انھوں نے فلسفیانہ انداز میں خیر و شر کے مسئلے کو خوب واضح کیا ہے۔ ذیل میں ہم اُن کا یہ پُر مغز اداریہ پیشِ نظر کرتے ہیں:

اداریہ۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۰ء مطابق ۲۵ر شوال ۱۳۳۸ھ

دارالعوام انگلستان میں جو معرکۃ الآرا مباحثہ ہنٹر کمیٹی رپورٹ کے متعلق ہوا ہے۔ اس کی روئداد قارئینِ کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس روئداد سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس وقت دو قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ایک یزدانی، جو نیکی سے تعلق رکھتی ہے اور ایک اہرمنی، جو بدی پر حکمران ہے۔ ان قوتوں کا وجود آج سے نہیں۔ خیر و شر کا امتیاز اور نیکی و بدی میں فرق و تفاوت تو اُس دن متعین ہو گیا تھا جب خدائے قدوس نے کلمۂ کُن سے کائناتِ عالم کو نمودار کیا، آدم کی تخلیق عمل میں آئی اور ابلیس لعین نے ارشادِ خداوندی کے خلاف اِبا و استکبار سے کام لے کر لعنتِ ابدی اور ذلتِ سرمدی کا طوق پہنا اور خدائے بزرگ و برتر نے "وقتِ معلوم" تک ابلیس کو مہلت دی کہ من مانی حرکتیں کیا کرے تاکہ شر کا وجود جو علےٰ سبیلِ اعتبار و بطریقِ تعارضِ خیر کے فروغ کا باعث ہو۔

اسلام کے ظہور سے پہلے مجوس نے فلسفۂ خیر و شر پر اپنے مجوسی عقاید کا رنگ چڑھا کر دو قوتیں مشخص کر دیں۔ جن میں سے ایک کا نام یزدان اور دوسری کا اہرمن رکھا۔ جن انسانوں کی فطرتوں میں خدائی نور کا شرارہ جلوہ ریز تھا، انھوں نے یزدان سے پیمانِ وفا باندھا، اور جن کے خصائصِ طبع میں ابلیسیت غالب تھی وہ اہرمن کے بندگانِ بے دام بن گئے۔

اسلام نے منصۂ شہود پر آتے ہی خیر و شر کو اچھی طرح جانچا اور نیکی و بدی کا ایک ایسا نظام قائم

کیا۔ اور ان دونوں میں ایک ایسا نمایاں خطِ فاصل کھینچا جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق تھا۔ اور جس سے ہمیشہ کے لیے خیر و شر کا ایک امتیاز صریح قائم ہو گیا اور آج تک اسلام کے تمدن میں ان معاملات کے متعلق جو موثر انسانی حقوق ہیں اس آسمانی اصولِ خیر کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس وقت انگلستان کی پارلیمنٹ میں جو کش مکش جاری ہے۔ یہ "مدبرین" اور رجعت پسندوں کی کش مکش نہیں بلکہ خیر و شر کی کش مکش ہے، جو نیکی اور بدی کی کش مکش ہے۔ یزداں اور اہرمن کی چپقلش ہے۔ انصاف اور جبر کی لڑائی ہے۔ ایک طرف مسٹر پٹ، مسٹر سپنسر، مسٹر چرچل، مسٹر اسکوبیتھ، مسٹر مانٹیگو اور کرنل ویجوڈ جیسے انصاف پسند اور حریت دوست حضرات ہیں اور دوسری طرف جنرل ڈائر اور سر مائیکل اڈوائر کے حامی سر ایڈورڈ کارسن اور کرنل جیمس اور بنسن بکس جیسے کوتاہ نظر، تنگ خیال اور رجعت پسند لوگ ہیں۔ جن کے نزدیک انصاف و حریت ایسے الفاظ ہیں جو شرمندۂ معنی نہیں۔ وہ جبر و استبداد ہی کو حکومت کا مدارِ علیہ سمجھتے ہیں اور ظلم و جور کی پھسپھسی بنیادوں پر سلطنت کا قصر استوار کرنا چاہتے ہیں۔

مسٹر مانٹیگو اور ان کے حامی دنیا کی سیاست کے نباض اور حکومتِ برطانیہ کے حقیقی خیر خواہ ہیں۔ سو وہ جانتے ہیں کہ جبر و تشدد کی حکمتِ عملی اقوامِ عالم پر حکومت کرنے میں ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ قدیم سلطنتیں اس تباہ کن طرزِ عمل سے ایسی برباد ہوئیں کہ آج ان کا کوئی نام لیوا نظر نہیں آیا۔ رومۃ الکبریٰ کی سطوت و شوکت اس حکمتِ عملی کے ہاتھوں ایسی بے نشان ہوئی۔ کہ اس کے زوال کی تاریخ قوموں کے لیے سرمایۂ عبرت ہے۔ یونان اسی وجہ سے مٹ گیا۔ مصر اور کالڈیا کی زیر دست حکومتیں استبداد کے اہرمن کی دست برد کا شکار ہو گئیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان پر عدل و انصاف، مساوات و رواداری کے اصول سے حکومت کریں تاکہ برطانیہ کے اقتدار کو ثبات و استقلال ہو اور سلطنت کی تکالیف و مصائب روز افزوں نہ ہوتی جائیں۔"

اس کے بعد آپ نے لکھا:

"ان کے مقابلے میں ڈائر اور اڈوائر کے حمایتی یہ چاہتے ہیں کہ انصاف و رواداری کو اپنے پنجۂ استبداد میں لائیں اور اس طرح پامال کریں کہ پھر سر نہ اٹھا سکے۔

سرزمینِ ہند میں برطانوی استبداد کے سندر کے مہنتوں کو خواہ وہ سنگین سزا ملے یا نہ ملے جس کے وہ اس درجہ مستحق ہیں لیکن دارالعوام کے امرت سری مباحثہ نے کم از کم ایک حقیقت کو روزِ روشن کی طرح آشکار کر دیا ہے۔ یعنی اس واقعۂ فاجعہ نے جسے مسٹر اسکوبیتھ تاریخِ برطانیہ

کے ظالمانہ واقعات کی فہرست کا ایک خوں چکاں عنوان قرار دیتے ہیں۔ جمہوریہ ہندوستان کے دل میں ان فرائض کا احساس پیدا کر دیا ہے جو ان پر بنی نوع انسان کی طرف سے عاید ہوتے ہیں۔ اگر مسٹر مانٹیگو کا داؤں چل گیا تو شہنشاہیت پرست مستبدین کی یہ حکمتِ عملی اب کارگر نہ ہوگی کہ مشرق میں انگریزی اقتدار صرف ان کے فولادی گھونسے کے زور سے قائم رہ سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ کہنے سے کر دکھانا بہتر ہے۔ وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب محض چند دل خوش کن سیاسی فقرات کا جادو نہیں چل سکتا۔ اور ڈائر کو صرف اتنی سزا دے کر کہ اسے فوجی خدمت سے برطرف کر دیا جائے، ہندوستانیوں کی اشک شوئی نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان کا اعتماد بحال کرنے کے لیے انگلستان کو اپنا قول و فعل ایک کر دکھانا چاہیے اور ڈائر اور اڈوائر اور ان کے تمام خواجہ تاشوں کا کورٹ مارشل کرنا چاہیے۔

کسی گزشتہ افتتاحیہ میں ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ برطانوی قوم نے اہلِ ہند کے حقوق کے تحفظ کی جو مقدس امانت گورنمنٹ ہند کے سپرد کی تھی۔ اس کے متعلق ہنٹر رپورٹ کے نتائج اور گورنمنٹِ ہند کی روش سے عام طور پر ہندوستان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت کے ذمہ دار عمال اس امانت کے متعلقہ فرائض کی انجام دہی میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ واقعات نے روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ خود فرزندانِ ہند کو اپنے حقوق کی حمایت کے لیے آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو پہلے اسے ایجی ٹیشن یعنی شورش قرار دیا گیا، اور جب اس شورش نے، جو بالکل آئینی تھی، ایک دیرپا اور مستقل رنگ اختیار کر لیا تو اسے اعلانیہ سڈیشن یعنی باغیانہ تحریک سے تعبیر کیا گیا۔ جب یہ فرضی باغیانہ تحریک بھی فرو نہ ہوئی تو حکومت کے اہل کاروں نے جابرانہ قوانین کے نفاذ سے رعایا کے جذبات کو دبانا چاہا۔

لیکن جذبات بمنزلہ بھاپ کے ہیں جن کا روکنا یا بند کرنا ہمیشہ خطرناک ثابت ہوا ہے۔ اگر ہندوستان میں حکومت اور رعایا کے باہمی تعلقات پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ہندوستان میں اچھی خاصی خانہ جنگی نظر آتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت ہندوستان کی حریت اور حکام کی اقتدار پسندی کے درمیان ایک ایسی سخت جدوجہد جاری ہے جس کے نتیجہ پر ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ گزشتہ سال کے ہولناک واقعات اس خوفناک جدوجہد کی ایک زندہ تصویر ہیں۔ اگر اس جدوجہد کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا اور گورنمنٹ ہند کے باہمی تعلقات میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جاتی جو ہز میجسٹی ملک معظم کی دلی آرزو ہے تو ہم تلخیوں اور رنجشوں کے غبار کو اپنے دل کے آئینہ سے دھو ڈالتے۔ ہم بارہا اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہندوستان کا برطانیہ کے ساتھ ایک دائمی تعلق رہے، لیکن اس

تعلق کی وہی شان ہونی چاہیے جو ہمیں برطانیہ کے نوآبادیوں کے آئینِ حکومت میں نظر آتی ہے۔ صرف یہی ایک سمجھوتا ہے جس کی بنا پر ہندوستان اِنگلستان کا حقِ رفاقت ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

پنجاب میں ڈائر نے اپنے وحشیانہ کھیل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے نزدیک انگریزی جان کی کیا قدر و قیمت ہے اور ہندوستانی جان کی کیا حیثیت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ گزشتہ فساد میں پانچ یا چھ انگریزوں کی جانیں تلف ہوئیں لیکن سر مائیکل اڈوائر اور ڈائر نے ان چھ انگریزوں کا انتقام کس شکل میں لیا۔ امرت سر کے باشندوں کو کتوں کی طرح مارا گیا اور انھیں سانپ کی طرح زمین پر رینگ کر چلنے پر مجبور کیا گیا۔ بید سے ان کی ننگی پیٹھ کی کھال اُدھیڑ دی گئی۔ بے گناہوں پر ہوائی جہاز سے بم گرائے گئے۔ غرض کہ بدبخت ہندوستانیوں کے ساتھ وہ شرم ناک سلوک کیا گیا جس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ان تمام وحشیانہ اور قاتلانہ جرائم کی پاداش میں ڈائر کو صرف اس قدر سزا ملی کہ اُسے ہندوستان کی فوجی خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ جب ہنٹر رپورٹ شائع ہوئی تو وزیرِ ہند نے ایک لطیف اور معتدل پیرایہ میں ڈائر کے افعال پر نکتہ چینی کی اور ساتھ ہی یہ کہہ کر ڈائر کی اشک شوئی کر دی کہ اُس نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا۔ لیکن امرت سر کے دو ہزار مجروحین اور مقتولین کے مقابلہ میں ڈائر کی شخصیت زیادہ قابلِ عزت خیال کی جاتی ہے۔ کلکتہ کی یورپین ایسوسی ایشن نے اپنے پریذیڈنٹ کو، جو اس وقت اِنگلستان میں ہے، اس مضمون کا تار دیا ہے کہ جب پارلیمنٹ میں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کا وقت آئے تو پارلیمنٹ میں اس بات پر زور دیا جائے کہ ہندوستان میں یورپینوں کی عام جماعت بڑے زور کے ساتھ جنرل ڈائر کی حمایت اور گورنمنٹِ ہند کی کارروائی پر ملامت اور نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ یورپین ایسوسی ایشن کا یہ تار ایک طرح کی دھمکی ہے جو گورنمنٹ ہند اور وزیرِ ہند کو دی گئی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اگر ہندوستان کے مقابلہ میں ڈائر کی توہین کی گئی تو یہ تمام برطانوی قوم کی ذلت تصور ہوگی۔"

تبصرہ

اس طرح مولانا ظفر علی خاں نے مارشل لاء کے خلاف زبردست اداریہ لکھ کر اہلِ وطن کے جذبات کا اظہار کیا اور اپنی صحافت کے ذریعے "مشرقی جان اور مغربی جان" (اداریہ) لکھ کر نہ صرف یہ کہ دونوں کی قیمت کا فرق بتایا بلکہ اسی ضمن میں میتھی کرانیکل نے اپنی ایک اشاعت میں پنجاب کے مظالم پر بحث کرتے ہوئے سوال اٹھایا تھا کہ اگر مشرق میں مغرب کا حکومت کا بنیادی اصول یہی ہے تو پھر مشرق کے امن اور بنی نوع انسان کی ترقی کے لیے اس سے زیادہ خطرہ قیاس میں نہیں

آسکتا " کی تائید بھی کی اور وہ اینگلو انڈین اخبارات جو ہندوستانیوں کو گزرے ہوئے واقعات کے درگزر کرنے کے اصولوں کی تعلیم دیتے ہیں اور گزشتہ رنجشوں کو دل سے مٹا دینے کا وعظ کرتے تھے اور ہندوستان کی یورپین ایسوسی ایشن کی وہ کارروائی کہ جس میں انھوں نے جنرل ڈائر کی حمایت اور گورنمنٹ ہند اور وزیرِ ہند کی کارروائی پر ملامت اور نفرت کا اظہار کیا، انھوں نے اس کے خلاف بھی نہایت بے باکی اور جرأت سے لکھا ۔ اس طرح ظفر علی خاں کی صحافت نے ہندوستان کی صحافت کا رُخ موڑ دیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتے رہے۔ اس سلسلے میں کم سے کم اُردو اخبار نویسی میں وہ اپنی مثال آپ تھے ۔

مولانا ظفر علی خاں ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے ۴ نومبر ۱۹۲۲ء تک قید رہے۔ ۱۹۲۰ء سے پانچ ۱۹۲۶ء تک کا دور مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کا دور ہے جس میں انھوں نے اخبار کی ادارتی ذمہ داریوں کو نہ صرف سنبھالے رکھا بلکہ اس کے ادبی اور سیاسی معیار کو کسی طرح گرنے بھی نہیں دیا ۔ لیکن یہ دور چوں کہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اِس لیے اس دور پر صرف اِس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی کیا صحافتی خدمات ہیں ۔

۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو مولانا ظفر علی خاں جیل سے رہا ہوئے ۔ اور ان کی رہائی کے بعد زمیندار میں ان کے ادبی مضامین اور حبسیہ نظمیں شائع ہوئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ادبی مضامین ۔ تصریحات	لطائف الادب کے ضمن میں ..	۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء
سیاسی مضامین ۔ فسانۂ حجاز (کی طویل قسطیں)		۳۰ نومبر ۱۹۲۴ء
		یکم دسمبر ۱۹۲۴ء
		۳ دسمبر ۱۹۲۴ء
		۴ دسمبر ۱۹۲۴ء
ظفر علی خاں کا پنجاب پروونشل خلافت کانفرنس امرت سر میں معرکۃ الآرا خطبہ ۲۲ کالم میں شائع ہوا ۔	.. ..	۱۰ دسمبر ۱۹۲۴ء
اسلام اور قتلِ مرتد پر مولانا ظفر علی خاں کا ایک علمی مقالہ .. .. .. (نوٹ ۔ مولانا غلام رسول مہر نے دراصل یہ مقالہ تحریر کیا تھا جو مولانا ظفر علی خاں کے نام سے شائع ہوا) ۔		۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء
مولانا کا معرکۃ الآرا خطبۂ امرت سر "پیام حیات" کے نام سے		مئی ۱۹۲۵ء
ادبی مضمون "شاہِ قاچار"		اپریل ۱۹۲۵ء
خلیفۂ روم پر ایک نظر		۱۰ جولائی ۱۹۲۵ء

سیاسی بیان۔ بحیثیت صدر وفد خلافت "ہنگامہ پانی پت" پر (۱۱ کالمی بیان)۔ ۱۸ محرم

اداریے :

مولانا نے تقاریر کے سلسلوں کے باعث بہت ہی کم اداریے اس زمانے میں اپنے قلم سے لکھے اور صحیح معنوں میں مولانا غلام رسول مہر ہی مدیر مسئول تھے تاہم بعض اداریے، جو اس زمانے میں انھوں نے لکھے، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) یکم جولائی ۱۹۲۵ء۔ "عیدالاضحیٰ اور اسوۂ ابراہیمیؑ"۔ (ایک علمی اداریہ جو اہم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے)۔

(۲) جولائی ۱۹۲۵ء۔ "افغانستان اور اٹلی"۔

(۳) ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء۔ "حضورؐ کے غلامانِ غلام"۔

(۴) جنوری ۱۹۲۶ء۔ جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب۔ (۲ کالمی)

شعر و سخن :

رہائی کے بعد ان کی مختلف نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ ان میں عقائد کے اختلاف کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ان کے عنوان بھی بہت سخت تھے۔ مثلاً "بریلی کا ڈاکو"۔ اسی طرح جولائی میں طاہر دباغ پر بھی ایک اہم نظم شائع ہوئی۔ اسی طرح ابن سعود کے لیے "شہسوارِ نجد" کے نام سے نظم شائع ہوئی اور ایک اور "تطہیر حجاز" کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ اسی طرح اس دور میں ان کی صحافتی نظمیں مثلاً "علمائے ملت مولانا محمد علی کی نظر میں"۔ (۲) فسانۂ اسلام کی ایک عبرت اندوز فصل۔ (۳) سلام کا جواب ککڑوں کوں۔ (۴) فتنہ کے درخت کی دو ٹہنیاں۔ غرض عقائد کے اختلافی مسائل پر ان کی کئی نظمیں ہوئیں جس میں انھوں نے ابن سعود کے تمام کارناموں کو سراہا تھا۔ یہ سب نظمیں ان کے بہارستان کے مجموعے میں موجود ہیں۔

فکاہات :

ظفر علی خاں کے قلم سے مئی ۱۹۲۵ء میں نثر میں اور اس کے بعد کبھی کبھی شعر و سخن کے ضمن میں نظم بھی کچھ چیزیں نکلیں۔

دوسروں کے مضامین :

(۱) اس دور میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون "شغل تکفیر" کے نام سے شائع ہوا۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک طویل مضمون اور

(۳) رشید رضا مصری کا ایک طویل مضمون بھی شائع ہوئے۔

افکار و حوادث میں بدستور مولانا عبدالمجید سالک قلم کی گل کاریاں دکھاتے رہے اور جیسا کہ

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نکاہات کے عنوان سے کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں علامہ حسین میر مدیر "ضیافت پنچ" نے زمیندار اخبار میں شرکت کرلی اور ان کے پُرزور مزاحیہ مختصر نوٹ اور اسی کے ساتھ ملا رموزی کی گلابی اردو بھی اخبار کی زینت بنتی رہی۔

خلافت کانفرنس پٹنہ:

فروری ۱۹۲۶ء کو پٹنہ میں خلافت کانفرنس کے سلسلے میں ان کی ایک زبردست تقریر اُردو کی اہمیت اور اس کی حمایت میں ہوئی۔ ان کی وہ معرکۃ الآرا تقریر تھی جس کے بعض اجزا اسی مہینے زمیندار اخبار میں شائع ہوئے۔ مولانا کی یہ فی البدیہہ تقریر تھی۔ انھوں نے اس میں اُردو کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ یہ تقریر سرعلی امام نے بہت پسند کی اور مولانا کی اُردو خدمات کو ایک مخصوص دعوت میں خاص طور سے سراہا گیا تھا۔

اختلافات کے سال: ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۷ء

اس زمانے میں کارکنانِ خلافت میں مسئلۂ حجاز کے باب میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ستمبر ۱۹۲۵ء میں مولانا نے وفدِ حجاز کا ایک ممبر بن کر جانا منظور کرلیا۔ چناں چہ وہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو حجاز روانہ ہو گئے۔ ۹ فروری ۱۹۲۶ء کو ان کی واپسی ہوئی۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے کلبتہً ابنِ سعود کو سلطانِ حجاز تسلیم کر کے اس کے ہر فعل کی تائید شروع کر دی اور یہی امر مولانا محمد علی مرحوم سے سخت کشیدگی کا باعث ہوا۔ "ہمدرد" اور "زمیندار" میں اس موضوع پر (اور قتلِ مرتد کے موضوع پر بھی طویل بحثیں چھڑیں جس کے نتیجے میں اس دور میں تمام اخبارات نزاعی مسائل کا مرکز بن گئے۔ اس طرح ان صحافتی جھگڑوں نے ادب پر بھی اثر ڈالا اور صحافت میں ادب پر سیاست غالب آ گئی۔ معاصرانہ چشمک بہت بڑھ گئی۔ مولانا سید حبیب صاحب ایڈیٹر اخبار "سیاست" بھی جو مولانا کے مخلص خیرخواہوں میں سے تھے، اس مسئلے میں مولانا سے سخت ناراض ہو گئے اور خود لاہور میں احناف اور دیوبندی عقائد کی بحث نے وہ شدت اختیار کی کہ کسی نے مولوی دلدار علی صاحب کے صاحب زادے پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ چوں کہ احناف ابن سعود کی روش سے سخت ناراض تھے اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تقریروں اور اخبار کے ذریعے ابنِ سعود کی سخت حمایت کی تھی۔ اس طرح یہ پورا دور اندرونی اختلاف اور معاصرانہ چشمک میں گزرا۔

۱۹۲۷ء میں زمیندار نے اپنا ہفتہ وار ایڈیشن بھی نکالنا شروع کر دیا تھا۔ دستیاب شدہ پرچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں زمیندار کا ہفتہ وار ایڈیشن اپنی ادبی اور علمی اہمیت کے لحاظ سے ایک قابلِ ذکر پرچہ تھا۔ چنانچہ اس اخبار میں ایسے علمی اور ادبی مضامین شائع

ہوئے جو عام معیار سے بہت بلند تھے۔ (۱۹۲۱ء سے مولانا غلام رسول مہر نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کے قید ہو جانے کے بعد زمیندار کو اپنے عالمانہ اداریٔ مقالوں کے ساتھ اور عبدالمجید سالک نے اپنے افکار و حوادث (فکاہات) سے اس کے ادبی مذاق کو دلچسپ اور پُرلطف بنا دیا۔ مولانا غلام رسول مہر فاضل متبحر تھے، اس لیے انھوں نے اپنی عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ زمیندار کے وقار کو بحال رکھا)۔

۱۹۲۷ء میں زمیندار کے برائے نام ایڈیٹر لال شاہ ایک ناخواندہ بزرگ تھے۔ اور یہ پرچہ اس زمانے میں منصور اسٹیم پریس میں شائع ہوتا تھا۔

۱۹۲۷ء کے اہم اداریے حسب ذیل ہیں:

(۱)۔ عازمین حج کی مشکلات۔ (ڈیڑھ کالمی اداریہ) ۲۳ر جنوری ۱۹۲۷ء

(۲)۔ حکومتِ پنجاب اور مسلمان۔ (حفاظتِ حقوق کا اقتضا) مسلمانوں کی تباہی پر ایک دل سوز اداریہ۔ (ڈھائی کالمی) ۶ر فروری ۱۹۲۷ء

(۳)۔ موتو بغیظکم از ظفر علی خاں (خدام الحرمین کے حج کے لیے روکنے کے خلاف اداریہ) ۲ر اپریل ۱۹۲۷ء

(۴)۔ ابن سعود کو شوکت علی کا الٹی میٹم۔ از ظفر علی خاں۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۲۷ء

(۵)۔ مصیبت زدوں کی دست گیری کی فکر۔ از ظفر علی خاں۔ ۸ر مئی ۱۹۲۷ء

(۶)۔ مغرب الاقصیٰ میں غازیانِ اسلام کا فاتحانہ اقدام۔ ۱۵ر مئی ۱۹۲۷ء

(۷)۔ پانی پت کے مسلمان امتحان گاہِ صبر میں۔ اداریہ از ظفر علی خاں۔ ۲۱ر مئی ۱۹۲۷ء

(۸)۔ گالیاں اور تہمتیں۔ از ظفر علی خاں۔ ۲۲ر مئی ۱۹۲۷ء

(۹)۔ سلطنتِ آصفیہ کا خاتمہ۔ از قلم ظفر علی خاں۔ ۲۹ر مئی ۱۹۲۷ء

(۱۰)۔ رنگیلے رسول کا مقدمہ (عدالتِ عالیہ پنجاب کے فیصلے پر ایک نظر) ۵ر جون ۱۹۲۷ء

(۱۱)۔ عید الاضحیٰ اور سنتِ خلیل اللہ علیہ السّلام۔ ۱۱ر جون ۱۹۲۷ء

(۱۲)۔ سر مائیکل اڈوائر کا تازہ کلام، از قلم ظفر علی خاں۔ مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۲۷ء

(۱۳)۔ سر میلکم ہیلی سنگھٹنیوں کے نرغہ میں، از ظفر علی خاں۔ ۲۲ر جون ۱۹۲۷ء

(۱۴)۔ محمد مصطفےٰؐ کے دشمنوں کا انجام، از ظفر علی خاں۔ ۳ر جولائی ۱۹۲۷ء

(۱۵)۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کا التوا، اور مجلس خلافت پنجاب کا جدید لائحہ عمل۔ ۱۷ر جولائی

(۱۶)۔ مجلسِ وضعِ قوانین کے اجلاس پر ایک نظر۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۲۷ء

(۱۷)۔ فرقہ وارانہ مناقشات اور جہادِ حریت۔ ۱۴ر اگست ۱۹۲۷ء

(۱۸)۔ ہندوستان کا امن خطرے میں، ستیارتھ پرکاش کی عافیت سوز تعلیم۔ (ڈھائی کالمی اداریہ)۔ ۲۰ر اگست ۱۹۲۷ء۔

(۱۹)۔ مولانا شوکت علی اور مجلسِ خلافتِ پنجاب ۔ ۲۷ر اگست ۱۹۲۷ء

(۲۰)۔ مسوّدۂ قانونِ توہینِ مذاہب۔ از قلم ظفر علی خاں۔ ۲۸ر اگست ۱۹۲۷ء

(۲۱)۔ شیعہ سُنی کی خانہ جنگی (اے گرفتارِ ابوبکر رضؓ و علی رضؓ ہشیار باش) ۹ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۲)۔ راہ نماؤں کا اعلان، مفاہمت کی تجویز۔ ۴ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۳)۔ زمیندار عید میلاد نمبر۔ حجتِ حق کا ظہور۔ از قلم ظفر علی خاں۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۴)۔ مسلمانانِ ناگ پور کی داستانِ مظلومیت، سنگھٹی ذہنیت کا ہولناک مظاہرہ۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۵)۔ موتمرِ اتحاد (مرض کا اصلی علاج) ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۶)۔ مسلمان اور سرکاری ملازمت۔ (حفاظتِ حقوق کا مسئلہ) ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۷)۔ دارالعلوم دیوبند کے قضیہ کا خاتمہ۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۷ء

(۲۸)۔ محکمۂ تعلیم اور مسلمان۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

(۲۹)۔ مسئلۂ افیون۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

(۳۰)۔ اعلیٰحضرت ابنِ سعود اور روزنامہ خلافت۔ اداریہ از قلم ظفر علی۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

(۳۱)۔ لالہ لاجپت رائے اپنے اصلی رنگ میں۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

(۳۲)۔ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) ۲ر نومبر ۱۹۲۷ء

(۳۳)۔ آریہ کانگریس کا اجلاس۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء

(۳۴)۔ فتنۂ تفرنج اداریہ از قلم ظفر علی خاں۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۷ء

(۳۵)۔ ہندوستان اور پارلیمنٹ انگلستان۔ ۲ر دسمبر ۱۹۲۷ء

(۳۶)۔ سائمن کمیشن کا مقاطعہ۔ ۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء

(۳۷)۔ شہریارِ غازی کی آمد۔ پردۂ استقبال کی چھنتی ہوئی روشنی۔ (یہ اداریہ ظفر علی خاں کے قلم سے نثر کی بجائے نظم میں لکھا گیا تھا)۔ امان اللہ خاں نمبر (مشتمل بر ۲۲ صفحات) ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء

تبصرہ :

سال ۱۹۲۷ء زمیندار کی زندگی میں ایک انقلابی سال تھا۔ اب تک مولانا غلام رسول مہر، (مارچ ۱۹۲۷ء تک) عام طور سے افتتاحیہ لکھتے تھے۔ کارکنانِ زمیندار کو ان کی تنخواہیں مہینوں سے

نہیں ملی تھیں۔ گزشتہ دور بھی زمیندار پر ابتلا کا دور تھا۔ جب مولانا ظفر علی خاں قید میں تھے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہوئی کہ ادارہ کے کارکنوں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ مولانا ظفر علی خاں کو ایک معتدبہ رقم سلطان ابنِ سعود کی طرف سے امداد کے طور پر ملی ہے۔ اس رقم کے ملنے کے باوجود ادارہ کے لوگوں کے مطالبات باقی ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر ان کے لیے تکلیف کا باعث تھا اور جب انھیں وقتِ مقررہ پر تنخواہیں نہ ملیں تو آخرِ کار انھوں نے بے چینی کا اظہار شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ مولانا غلام رسول مہر اور سالک مرحوم کی ہمدردیاں ان حالات میں کارکنان کی طرف ہی تھیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے کارکنان کے کہنے پر اس امر کی کوشش کی کہ لوگوں کے بقایا جات فوراً ادا کر دیئے جائیں۔ کسی نامعلوم سبب کی بناء پر مولانا ظفر علی خاں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اس رقم کی ادائیگی کے لیے یہ دونوں صاحبان (مہر اور سالک) کارکنان کو انگیخت کر رہے ہیں۔ سالک مرحوم نے تو زمیندار کی خاطر قید و بند کی تکلیفیں بھی سہی تھیں اور بعد میں بھی ناگوار حالات کو برداشت کرتے ہوئے وہ اور ادارہ کے تمام کارکن زمیندار کے لیے بہت جاں فشانی سے کام کر رہے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اس واقعے سے بہت برہم تھے اور جب انھوں نے کارکنان کو بلا کر فرداً فرداً ان سے پوچھا کہ تم غلام رسول مہر اور سالک کے ساتھ ہو یا ہمارے ساتھ۔ تو مزید غلط فہمی بڑھ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا غلام رسول مہر اور سالک نے زمیندار سے دست برداری اختیار کر لی اور گھر بیٹھ گئے۔ کارکنان نے ہڑتال کر دی۔ (اس طرح یہ مہینہ ان کے لیے خاصی پریشانی کا باعث تھا اور زمیندار کو اپنی حالت سنبھالنے میں بہرحال ایک عرصہ لگا۔) اس کے باوجود مولانا ظفر علی خاں نے بہت ہی صبر و ہمت کے ساتھ اس نقصان کو برداشت کیا۔ اور جب وہ دونوں صاحبان باوجود بلانے کے بھی نہ آ سکے تو انھیں خود اپنی سیاسی سرگرمیوں، تقریروں اور جلسوں میں شرکت کے علاوہ اخبار کی براہِ راست نگرانی کرنی پڑی لیکن اس کے باوجود وہ نہ مشکلوں سے گھبرائے اور نہ ان حالات سے ہراساں ہوئے بلکہ وہ اپنی طبیعت کے فطری تقاضے کے باعث پورے اطمینان کے ساتھ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے۔

زمیندار کا پہلا صفحہ ۱۹۲۷ء میں۔

(۲) عام طور سے روزانہ پرچے کا پہلا صفحہ کسی مضمون پر مشتمل ہوتا تھا اور بعض دفعہ صفحۂ اوّل پر مولانا ظفر علی خاں کی جلی قلم سے نظم شائع ہوتی تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ ہفتہ وار ایڈیشن کی، جو اتوار کے روز نکلتا تھا، یہ نمایاں خصوصیت رہی اور اس میں کبھی بھی فرق نہیں آیا۔ صفحۂ اوّل پر جلی قلم سے مولانا ظفر علی خاں کی معرکۃ الآرا تازہ ترین نظمیں شائع ہوتی رہیں اور اس

اخبار کی بھی یہی خصوصیت تھی جس کے سبب اس اخبار نے غیر معمولی طور پر نمایاں اہمیت حاصل کر لی تھی ۔ ذیل میں ہم چند مثالیں اس سلسلے میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً :

(۱) کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ (۲۳ر جنوری ۱۹۲۷ء)

یہ شُدھی کیا اور اس کی کیا حقیقت — یہ پدی کیا اور اس کا شوربا کیا
جنھیں جگنو پہ سورج کا گمان ہو — ان اوندھی عقل والوں سے گلہ کیا
بُروں کی جان کو رویا اگر مَیں — تو بتلاؤ بُرا مَیں نے کیا کیا

(۲) سرکارِ دو عالمؐ سے التجا ۔ ۶ر فروری ۱۹۲۷ء ۔

نجد ترا ہے، مصر ترا ہے روم ترا ہے شام ترا — ہند میں لیکن کفر پہ غالب آ نہ سکا اسلام ترا
خوفِ خدا تو اٹھ ہی چکا تھا، شرمِ نبی کی بھی نہ رہی — مسلم ہندی دیدہ وروں نے دیکھ لیا انجام ترا
تاک رہا ہے بامِ حرم کو "اوم" کا جھنڈا گوکل سے — مضحکہ اُڑتا دیکھ رہے ہیں بُتکدے میں اصنام ترا

(۳) نوائے درد ۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۲۷ء

ناداں ہیں جو کرتے ہیں بھروسہ رُفقا پر — تکیہ وہی اچھا ہے جو ہو اپنے خُدا پر
راضی ہو ہر اک حال میں مولا کی رضا سے — رکھ اپنی نظر شیوۂ شاہِ دوسرا پر
کچھ تُو نے سُنا بھی ہے کہ کیا ہند میں گزری — اندور کی بستی کے اسیرانِ بلا پر
وہ سر جو جھکا تھا فقط اللہ کے آگے — رکھا ہُوا ہے کُفر کے نقشِ کفِ پا پر
ہے کوئی جو کلیجے کو تھامے ہوئے نکلے — اسلام کے آفت زدہ بچوں کی صدا پر
بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی — چلتا نہیں کچھ زور قدر پر نہ قضا پر

(۴) شُدھی کی آنکھ اور سنگھٹن ۔ ۱۵ر مئی ۱۹۲۷ء

صدا کل شب یہ اٹھی مالوی جی کی حویلی سے — تمھاری آبرو کا بھاڈ پانی سے بھی سستا ہے
گرو کل مبتدا ہے اور خبر لاہور ہے اس کی — اُدھر بجلی چمکتی ہے اِدھر بادل برستا ہے
پڑا ہے سنگھٹن سے اور شُدھی سے ہمیں پالا — اُدھر اس بھڑنے کاٹا اور اِدھر وہ سانپ ڈستا ہے

(۵) کہاوتیں ۔ ۲۹ر مئی ۱۹۲۷ء

ایسے لیڈر پر اور اس کی لیڈری پر تین حرف — جو ہر ایک تجویز بے جا کو بجا کہنے لگے
کانگرس پر جب سے غالب آ گئی ہندو سبھا — مالوی جی کو وہ اپنا دیوتا کہنے لگے
جب سے سیوا جی کو اپنانے لگے شوکت علی — ڈاکٹر مونجے انھیں اپنا چچا کہنے لگے

(۶) حریفوں سے دو دو باتیں ۔ ۱۱ر جون ۱۹۲۷ء

جن سے مقابلہ ہے وہ ہیں نام کے حریف — میداں میں اب تک آ نہ سکے کام کے حریف

کوٹھوں پہ چڑھ کے پھینک لیں اینٹیں تو کیا ہُوا
جب ہے مزا کہ رَن میں ہوں صمصام کے حریف

وہ اور کوئی ہوں گے جنھیں بندے ماترم
بتلا رہا ہے لالہ منی رام کے حریف

ہم کو بھی شکوہ ہے کہ مُسلمان کیوں ہوئے
شُدھی کے آفتاب لبِ بام کے حریف

تاروں کو رکھ کے دیکھ لیں سوُرج کے سامنے
ہیں برتر از شمار یہ اِسلام کے حریف

(۷) چودھری افضل حق - ۱۴ اگست ۱۹۲۷ء

ڈٹ کے کونسل میں کھڑا جس وقت افضل حق ہُوا
حق کی ہیبت چھائی ایسی رنگِ باطل فق ہُوا

جس نے جھوٹوں کی خوشامد کی وہ ٹھہرا عقل مند
جو نہ سچی بات سے جھجکا وہی احمق ہُوا

صوفیوں کا دعوئے عِشق پیمبر ہے کہاں
کوئی پوچھے کیا وہ ان کا نعرۂ ہُو حق ہُوا

میرے اس دعوے کے ہر ہر جملہ کا ایک ایک حرف
مولوی احمد علی کے وعظ سے مشتق ہُوا

(۸) ہفت خوانِ ہند - ۲۰ اگست ۱۹۲۷ء

ملیبار سے تا بہ اقصائے خیبر
ضیا ریز ہے مالوی جی کا جلوہ

کہیں گائے کی پونچھ پر سر پھٹول
کہیں باجا بجنے بجانے پہ بلوا

مُسلمان بے چارا کِس کِس سے نبٹے
اِدھر ہیں ہنود اُدھر ہیں کلوا

نہیں پیرہن ہی کو ان سے شکایت
یہ کانٹے وہ ہیں جن سے چھلنی ہے تلوا

خُدایا محمدؐ کی عترت کے صدقے
ہمارا بھی ایک ایک ارماں نِکلوا

مُسلماں کے بازُو کو زورِ علیؓ دے
حریفوں کی چھاتی پہ مونگ اس سے دلوا

(۹) اسماء الرجال - ڈاکٹر محمد عالم - ۲۸ اگست ۱۹۲۷ء

اُدھر ہیں ڈاکٹر مونجے، اِدھر ہیں ڈاکٹر عالم
اُدھر گوبر اِدھر عنبر اُدھر گنگا اِدھر زمزم

یہاں حق کی علم داری، وہاں باطل کی سالاری
یہاں طوفاں، وہاں تنکا، یہاں سورج وہاں شبنم

مشیر حسین قدوائی۔

لاجپت رائے سے وہ عشق ہے قدوائی کو
کسوت اور اُسترے سے بھی جو نہیں نائی کو

دیتے ہیں گاندھی و نہرُو پہ بھی ترجیح انھیں
دیکھتے جایئے مشقِ سُخن آرائی کو

(۱۰) حکومت کے سنگھٹنی خواب - ۲ ستمبر ۱۹۲۷ء

ہُوا ہے جذبہ پیدا سنگھٹنوں میں حکوُمت کا
مگر سمجھے نہیں اب تک وہ اس جذبے کی خامی کو

اُڑا سکتے نہیں جو ناک پر بیٹھی ہُوئی مکھی
نکالیں گے وہ بت کس طرح توپوں والے ٹامی کو

جُھکائی جس نے گردن اپنی غیر اللہ کے آگے
مسلط کر دیا اللہ نے اُس پر غلامی کو

تمام اس مُلک میں ہو کر رہے گا نورِ حق اِک دِن
مہِ نو لائے گا حجت میں اپنی ناتمامی کو

مسلمانوں سے پوچھو، ہندوؤں سے پوچھتے کیا ہو
مری شیوہ بیانی کو مری شیریں کلامی کو

(۱۱) نغمۂ جشنِ میلاد - ۱۰ر ستمبر ۱۹۲۷ء

رونقِ بزمِ دودۂ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
جادہ شناسِ منزلِ وحدت جلوہ نمائے نورِ حقیقت
ہادیٔ اکبر، مصلحِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
ہوگئی اُس پر ختم رسالت دیتے گئے ہیں جس کی شہادت
موسیٰ عمراں، عیسےٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم
کہتے ہیں جس کو سطوتِ کبریٰ تھی وہ اک اس کی مشتِ سراپا
گردنِ ہر قل جس سے ہوئی خم صلی اللہ علیہ وسلم
عرشِ بریں سے فرشِ زمیں تک فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک
غلغلہ برپا ہے یہی پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۲) حدیثِ آرزومندی - ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۷ء

مَیں خبر جس مبتدا کی ہوں کہاں گم ہو گیا
میری آنکھوں کو ہے تیرے نقشِ پا کی آرزو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں مَیں اسلام کو لے کر چراغ
کافرِ مسلم نما کو ہے خدا کی آرزو

(۱۳) بادۂ کہن - ۹ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

اتنی ہی آرزو ہے مرے دل میں اے خدا ۔ اسلام کو زمانہ میں دیکھوں مَیں سربلند
دنیا میں سرنگوں علمِ مصطفےٰ نہ ہو ۔ ہم خواہ خود ذلیل ہوں اور خواہ ارجمند

(۱۴) گئوشالہ پرستوں کے بڑھتے ہوئے حوصلے - ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

خدا وہ دل بھی دے، ہو جذبہ جس میں سرفروشی کا
مسلماں کو اگر اس کفرزارِ ہند میں سر دے
الٰہی ارجمندی حسبِ فطرت بخش انساں کو
جو گنگا مالوی کو دے تو اجمل خاں کو کوثر دے
زمیندار اور "مسلم آؤٹ لک" کو صبر دے یارب
"ملاپ" اور "تیج" کو توفیقِ نشرِ فتنہ و شر دے
سلیقہ گالیاں دینے کا بخشا ہے اگر اُن کو
تو ہم کو شیوۂ تسلیمِ ابراہیم آذر دے

(۱۵) رازہائے سربستہ - ۲۰ر نومبر ۱۹۲۷ء

پوچھ لیتا ہے فرنگی بھائی سے بھائی کا راز
ایشیا میں ہے یہ اُس کی کارفرمائی کا راز
سلطنت قربان کی گوسالہ و ناقوس پر
آشکار ہو گیا ہندو کی رسوائی کا راز
نشۂ توحید میں سرشار ہے ابنِ سعود
ہے فقط اتنا ہی اُس کی شان دارائی کا راز

(۱۶) پیامِ وقت - ۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء

جو کرنی ہے جہانگیری محمد کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پہ رکھ خداوندِ عجم ہو جا

ہو سرکش سَرو کی مانند گر باطل نکالے سر
اگر حق آگے آئے ماہِ نو کی طرح خم ہو جا

کرانا ہے قلم ہاتھوں کو روداد جنوں لکھ کر
تو اس دَورِ ستم پرور میں میرا ہم قلم ہو جا

(۱۷) نذرِ عقیدت - ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء

(افغانستان کے جواں بخت تاج دار کے حضور میں)

اے سایۂ جلالِ خداوندِ کائنات
ہیں جمع تیری ذات میں اسلاف کی صفات

مغرب کے حلقہ حلقہ میں رخشاں ترا فروغ
مشرق کے ذرہ ذرہ میں تیری تجلیات

یورپ کی سیر کے لیے جا اور خوشی سے جا
اور جاتے جاتے سن لے ہماری بھی ایک بات

اِس حشمِ جاو داہ کی افسوں گری سے بچ
اب تک نہ جس سے بابلیوں کو ملی نجات

اسلام رکھ کے ہار دے باقی ہر ایک نرد
پھر تیری جیت ہے نہ تبدیل مسلمات

شاہا دو رُخ بدہ و دِل آرام را مدہ
فیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت مات

مولانا ظفر علی خاں کی ان مجاہدانہ نظموں، صحافتی معرکوں اور پُرجوش و معنی خیز اشعار کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نہ صرف عوام پر ان کی ذہنی اپج اور جدت کی ہیبت بیٹھ گئی بلکہ ان کے اشعار کی چاشنی نے لوگوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور وہ اسلام کے حریفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صف آرا رہے اور ان کی عوامی تحریکات میں ان کے اشعار رجز کا کام کرتے رہے - اور ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک اقلیت ہونے کے باوجود مُسلمانوں میں کبھی ذہنی اور اقتصادی پستی کا احساس ہی پیدا نہیں ہُوا، اور اس طرح اقلیت پر اکثریت غالب آنے کی جرأت نہ کر سکی۔ اور دُوسرا ایک ادبی فائدہ یہ ہُوا کہ ان کی ان نظموں نے باذوق حضرات کے ذوقِ شعری کو مہمیز کیا اور اس کے نتیجے میں زمیندار کے سنڈے ایڈیشن میں ان صاحبان کی نظمیں بھی اسی جلی قلم سے اسی طرح چوکھٹے میں شائع ہونے لگیں جس طرح مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ یہ سب حضرات خواہ مستقل طور پر شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا سکے ہوں یا باقاعدہ بحیثیت شاعر کے مشہور نہ ہوں لیکن ان کی نظموں کے ادبی معیار اور ظفر علی خاں کا تتبع دونوں اس بات کے متقاضی تھے کہ ان کی ادبی کاوشوں کو زمیندار اُجاگر کرے۔ چناں چہ زمیندار نے اس ادبی فریضہ کو بخیر و خوبی انجام دیا۔ ان ممتاز لوگوں میں عارف گجراتی، تصدق حسین خالد ایم اے۔ حضرت تاثیر۔ جلال میرزا خاں افغانی۔ عبدالصمد تبسمؔ۔ پیرزادہ احمد شاہ زارؔ ہوشیارپوری، حکیم غلام قادر صاحب اثرؔ جالندھری۔ اصغر حسین نظیرؔ لودھیانوی، میرزا بیضا خاں اور مرتضیٰ احمد میکش

خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۲) زمیندار کے اہم علمی، ادبی اور سیاسی مضامین میں سب سے پہلے خود مولانا ظفر علی خاں کا نمبر ہے جنھوں نے اداریوں کے علاوہ بعض اہم سیاسی مضامین، اَدبی مضامین یا معاشرتی مضامین لکھے۔ ان مضامین میں ایک مضمون "ایشیا میں برطانیہ کی حکمتِ عملی کا مدوجزر" چار مسلسل قسطوں میں شائع ہُوا۔ (ب) "فسانۂ حجاز" جو قید خانہ میں لکھی گئی تھی، دس طویل اقساط میں اُسی دَور میں شائع ہُوئی۔ (ج) "کلام اللیل" کے نام سے شہرۂ آفاق مغربی بذلہ سنج مارک ٹوئین کے قلم سے بزبان ظفر علی خاں طویل ترجمہ ہو کر شائع ہُوا۔ اس ترجمے میں انھوں نے زبان کی پاکیزگی کے ساتھ اُردو کے روزمرہ اور محاورہ کو اس طرح استعمال کیا کہ یہ ترجمہ ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے مثلاً:

"آخر جی کڑا کر کے مَیں نے آدابِ لباس کے قیود سے آزاد ہو جانے کا تہیہ کر لیا۔ اور پتلون جھاڑ کر اور پیشانی رومال سے پونچھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا کہ دوسری جُراب کے بغیر ہی باہر چلا جاؤں۔ اس قصد سے مَیں نے دبے پاؤں دروازے کا رُخ کیا۔ مگر دروازہ اِدھر نہ تھا۔ مَیں سیدھا دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہاتھ پھیلائے ہُوئے نہ ہوتے تو پیشانی لہُو لہان ہو جاتی۔ دیوار کے ساتھ ایک چھتری کھڑی تھی۔ میری ٹانگوں کی اضطراری جنبش نے اسے نیچے گرا دیا۔ چکنے سنگِ مَرمَر کے فرش پر جو قالین سے معرّا تھا، اُس کے گرتے ہی پستول کے گِرنے کا تڑاخا ہُوا۔ مَیں سانس روک کر ہیرس کے جاگ اٹھنے کا منتظر تھا۔ مگر وہ سویا رہا اور میری جان میں جان آئی۔ میری جو کم بختی آئی، چھتری کو فرش پر ہی پڑا رہنے دینے کے بجائے مَیں نے اُسے اُٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دینا چاہا۔ مگر میرا ہاتھ اس کے دستہ سے الگ ہُوا ہی تھا کہ اُس کے نیچے کی نوک پھسل گئی۔ اور ایک اور تڑاخا ہُوا۔ ہیرس کی نیند کو اس شور کی کیا پرواہ تھی۔ لیکن میرے خاموش غصّے کا پارا کھولاڈ کے درجہ سے بھی اُوپر چڑھ گیا اور اگرچہ مَیں بہت ہی مہذّب اور متین واقع ہُوا ہُوں۔ کبھی کوئی جملہ جو پایۂ ثقاہت سے گِرا ہُوا ہو، میری زبان پر نہیں آیا۔ لیکن اس وقت جو اوّل فوّل دَبی زبان سے میرے مُنہ پر آیا اگر حرف بحرف اس کتاب میں درج ہو جاتا جسے گرجا جانے سے پہلے پڑھتے ہیں، تو یقیناً یہ کتاب بھی حضرت پاپائے روم ضبط ہو جاتی۔

چھتری کے حادثہ کے بعد پھر مَیں دروازہ کی تلاش میں چلا۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل رینگنے سے اس قسم کے حوادث کے اعادے کا کم احتمال تھا۔ اس لیے مَیں نے پھر یہی ترمیم شُدہ وضعِ حیوانی اختیار کی۔ اور خُدا ہی کو علم ہے کہ کس

طرف گیا۔ کہاں گیا۔ کتنی مرتبہ کرسیوں سے ٹکرایا۔ کتنی چوٹیں کھائیں۔ ہاں البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایک مرتبہ جو کھڑے ہو کر میں نے دروازہ ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پانی سے بھرا ہوا ایک شیشہ کا کنٹر، جو کسی بلند تپائی پر رکھا ہوا تھا، اُلٹ گیا اور کسی سخت چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ میں اس نئی افتاد کے عواقب و نتائج کا اندازہ ڈرتے ڈرتے کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً ہیرس کا طلسمی سکوت ایک نئے انداز سے ٹوٹا اور اُس نے اپنے اس شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیا کہ ڈاکو، قاتل، چور، لیجیو، پکڑیو جانے نہ پائے۔ مجھے تو پانی میں بالکل ہی ڈبو دیا۔" الخ

(د) اسی طرح ان کا ایک پُرلطف افسانہ "مریم عیسیٰ" کے نام سے اور (ر) "لمحات" کے نام سے بھی دِل چسپ انداز میں مختلف واقعات بھی شائع ہوئے۔ ظفر علی خاں کے ان مضامین نے اور ان افسانوں نے عوام میں ادبی ذوق کو نہ صرف پیدا کیا بلکہ ایک شُستہ زبان کے شستہ تراجم اور سیاسی مضامین کی اشاعت نے لوگوں میں اس ادبی صحافت کی وجہ سے اپنے ذوق کو جِلا بھی دی۔ اس لیے زمیندار کا خصُوصی ایڈیشن اپنی خصُوصیات کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔

(۴) اُس دَور کے زمین دار کی ایک اور خصُوصیت "افکار و حوادث" کے نام سے روزمرّہ واقعات پر ایک دِل چسپ تبصرہ ہوتا تھا۔ مارچ ۱۹۲۷ء تک یہ افکار و حوادث سالک کے قلم سے لکھے جاتے رہے۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے جُملے اور ادبی چوٹوں نے اس اخبار کو اور بھی پُرلطف بنا دیا۔ مثلاً ۲ر فروری ۱۹۲۷ء کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے:

"ایک دسویں صدی کا غزنوی تھا۔ جس کی ۱۷ یلغاروں کی یاد سے آج تک بھارت ورش لرزہ براندام ہے۔ جس کی چمکتی ہُوئی تلوار کی نوک نے سوم ناتھ کے بُتوں کی گردن کے ساتھ وہ ہی سلوک کیا جو اُس کے آقا و مولا کے عصائے قدسی نے بیت الحرام کے کثیر الانفار اصنام کے ساتھ کیا تھا۔ جس کا نام سُنتے ہی بڑے بڑے جغادری سنگھٹینوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ ایک اِس بیسویں صدی کے غزنوی ہیں۔ جن کی حمیّتِ اسلامی کا یہ عالم ہے کہ اس کلیسہ کی ہر جنبش پر جس سے بُت کدہ کا قفل کھُلتا ہے، بے تابانہ رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ حرم سے مُنہ موڑ کر اور دَیر سے رشتہ جوڑ کر چاندی کی چند بے حقیقت ٹکلیوں کی خاطر کرسیٔ اقتدار پر چند روزہ نشست کی تمنّا میں مسلمانوں کے مفاد سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور ہندوؤں کی رضا جوئی کو اپنا ایمان بنا لیتے ہیں۔

نام کو دونوں غزنوی ہیں۔ مگر ایک کا کام غزنوی تھا، دُوسرا نام کا غزنوی ہے۔ روزگار

سفلہ پرور کے کرشمے نہ دیکھے تھے تو اب کلکتہ میں جا کر دیکھ لو۔"

سالکؔ کے بعد "افکار و حوادث" کے بجائے یہ عنوان "فکاہات" سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس میں کبھی کبھی خود مولانا ظفر علی خاں "نقاش" کے فرضی نام سے بھی قلم کی روانیاں دکھاتے اور زمیندار کے نائب مدیر کسی نہ کسی حد تک اپنے سابقین کی پیروی اور ان کے انداز کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں فکاہات کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں نے اس طرح اپنے قلم کی شگفتگی سے دو واقعات کو یک جا کر کے بیان کیا :

"یورپ میں آج کل ایک نوخیز مطرب کی جادو نوائی نے فنِ موسیقی کے مبصروں کے حلقے میں غلغلۂ احسنت وزہ برپا کر رکھا ہے۔ اس نو عمر گویے کا نام جونؔ ہے مسٹر جونؔ کو موسیقی سے دُور کی نسبت بھی نہ تھی اور بچپن سے لے کر رعنا شباب تک کسی نے ان کو گاتے نہ سُنا تھا۔ لیکن ایک دن فنونِ لطیفہ کی دُنیا کو اس محیرّ العقول واقعہ نے یک بہ یک چونکا دیا کہ جان گا رہا ہے۔ اس معجز واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جان پر، جو جنگ عمومی میں زخمی ہو گیا تھا، کلورو فارم سُنگھا کر عملِ جرّاحی کیا گیا۔ عمل ہُوا اور کامیاب ہُوا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جان آنکھیں کھولتے ہی گانے لگ گیا۔ اور آج اس کا شمار یورپ کے گویّوں کی صفِ اوّل میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کلورو فارم بھی موسیقی آموز ہے؟ اگر ہے تو کیا وجہ ہے؟ کہ سنگھٹن کو بھی یہی پُر اسرار صفت ودیعت نہ کی گئی ہو۔ ہمارے خیال میں اگر مسٹر جانؔ کو ہندوستان بُلا کر شُدھ کر لیا جاتا اور وہ کسی مہابیر دَل میں شامل ہو جاتے تو پہلے ہی مسجد کے دروازہ پر پہنچنے کے ساتھ جھٹ باجے کی گت پر بھاؤ بتا بتا کر وہ گاتے کہ تان سینؔ کی رُوح بھی جھومنے لگتی۔"

(۵) اس کے حصّہ مضامین میں خواہ عام اخبار ہو یا ہفتہ وار ایڈیشن، کبھی کبھی مستقل مضامین کی صورت میں اور کبھی مراسلات کی شکل میں معاشرتی اور سیاسی مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔ حصۂ مضامین میں ہندوستان کے بعض سیاسی مضامین کے علاوہ اسلامی حکومتوں اور ان کی ترقیوں پر مسلسل اور بے شمار مضامین نکلتے رہے۔ مثلاً افغانستان نمبر میں افغانستان کی ترقیوں اور اس کے سیاسی، معاشی اور تاریخی حالات پر مشتمل مخصوص مضامین لکھوائے گئے تھے۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق بھی مختلف مضامین نکلتے رہے۔ جن میں عہد امان اللّٰہی کا افغانستان، افغانستان کا دورِ عروج اور ترقی، حجاز اور ابن سعود، اُمتِ وسطیٰ اور قرونِ وسطیٰ، مکتوب قسطنطنیہ، اور مسلمان عورتوں کے حقوق از سید سلیمان ندوی یا دُوسرے ادبی مضامین مثلاً ایک بیش بہا

"زمرّد کی خوف ناک داستان"، سالکؔ کے قلم سے، مشاہداتِ کمال پاشا، (ترجمہ) "مسلمانانِ رُوس اور بولشویک حکومت" فضل اللہ صاحب مدیر روزنامہ رسالت کے قلم، حضرت سُلطان ابنِ سعودؒ کا عہد میمنت مہد، اسلامی الخطاط، ائمہ مساجد کی اہم ذمہ داری اور دین کی حفاظت، اِسلامی پردہ، بیسویں صدی کے ہندو، مصر اور ترکی کی نسوانی تحریکات، اسی طرح خود افسانہ کے نام سے، مسٹر ولیم بیکفرڈ کا ایک افسانہ وقائع امیر المومنین واثق باللہ عباسی کا ترجمہ خود مولانا کے قلم سے امّ المومنین سلمہ رضی اللہ عنہا۔ یہ اور اسی قسم کے وہ ادبی مضامین تھے کہ جو علمی اور سیاسی واقعات پر مبنی ہوتے تھے۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں کا اہم ادبی مضمون ادبیات عرب (پہلی صدی ہجری کی شاعری) قابلِ ذکر ہے۔

(۶) اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت اس اخبار کی یہ تھی کہ اس نے اسلامی خصوصیات کے واقعات پر بے شمار خصوصی علمی نمبر شائع کیے۔ جن میں عید میلاد نمبر، عیدالاضحیٰ نمبر، محرم نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان ایڈیشنوں نے اپنی نظم اور نثر کے اعتبار سے نہ صرف اعلیٰ ادبی معیار قائم کیے۔ جن سے عوام کے ذوقِ مطالعہ کو جلا ملی۔ عید میلاد نمبر ستمبر ۱۹۲۷ء میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کئی مضامین ہیں جو آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اس اہم پرچے میں ایک عجیب و غریب چیز یہ بھی شامل کی گئی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں نے "گنج شائیگاں" کے نام سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس احادیث کا ترجمہ اردو نظم میں کر کے شامل کیا تھا۔ (فارسی میں "اربعین جامی" کے نام سے ان احادیث کا منظوم ترجمہ مشہور ہے) چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) الوعدہ دین"

کسی سے وعدہ کرتے ہو تو لازم ہے وفا کرنا — کہ یہ اک قرض ہے اور فرض ہے اس کا ادا کرنا

(ب) المجالس بالامانتہ

کسی محفل میں شامل ہو تو اس نکتہ پہ عامل ہو — کہ راز اس کی امانت ہے بنے تم جس کے حامل ہو

(ج) البلاء موکل بالمنطق

زباں اس کو نہ سمجھو ہے یہ اِک آفت کا پرکالا — نہ رکھو گے اگر قابو میں تو کر دے گی نہ وبالا

(۷) اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ "اقتباسات" کے عنوان سے دوسرے اخباروں کے قابلِ ذکر ٹکڑے نقل کیے جاتے تھے۔

(۸) "دِل چسپ معلومات" کے عنوان سے بھی مختلف دِل چسپ چیزیں درج ہوتی تھیں۔

(۹) "ممالکِ خارجہ" کے عنوان سے باہر کے ملکوں کی خبریں ایک یا دو کالموں میں درج ہوتی تھیں۔

(۱۰) کبھی کبھی ہندو دنیا کے نام سے ہندو اخباروں کی مخصوص تحریریں جن میں مسلمانوں پر چوٹیں ہوتی تھیں ۔ وہ بھی بعینہٖ نقل ہوتی رہیں۔ ملاپ، بھیشم، اکالی، پرتاپ، بندے ماترم، تیج وغیرہ اخبارات سے مختصر اقتباسات درج ہوتے رہے۔

(۱۱) اس دور میں یہ بھی خصوصیت رہی کہ ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں پر ظلم وستم کے واقعات کو اس اخبار نے مضامین کی شکل میں بالتفصیل شائع کیا۔ مثلاً ناگ پور کے، امذوہ کے، اور لاہور حویلی کابلی مل کے فسادات کے واقعات اور ان کی تمام تفصیل پورے طور سے شائع کیں۔ اور ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں دبے ہوئے تھے، ان پر ظلم وستم اور ریشہ دوانیوں کی اس زمانے میں پورے طور سے قلعی کھولی گئی۔

(۱۲) اداریوں کے علاوہ دوسرے واقعات پر تبصرے اور نوٹ بھی اس کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ مثلاً ہندوستانی ریلوں کی انتظامی روداد، نظر بندانِ بنگال کی مقاطع ہوئی، راج پال اینڈ کو کی تازہ شرارت، یورپ اور امریکہ کی فوجی طاقت میں اضافہ، امیدوارانِ امتحان پر ظلم، سنگھٹن ہندوؤں کی اصلی ذہنیت، غیر مسلموں کے ہاتھوں مصحف مقدس کی توہین، مجمع الجزائر کی تحریک آزادی کی روح، روس کی جون آف آرک، بیکاری، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں مثلاً صدر بلدیہ لکھنؤ کی منطق، بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس لیے کہ یہ مختصر نوٹ ان شکایات کی یا ان اہم چیزوں کے متعلق روشنی ڈالتے تھے جو عمومی حیثیت سے الگ تھے۔

(۱۳) خبریں

اِس کے علاوہ اس میں ایسی خبریں خاص طور سے درج ہوتی تھیں جن کا تعلق مفادِ اسلامی سے ہو۔ مثلاً خلافت اور مسلم لیگ کی خاص طور سے خبریں درج ہونے کے علاوہ اخبار کی غلطیوں کے سلسلے میں مقدمات اور فسادات کے سلسلے میں مختلف خبریں اس اخبار کا خاص حصہ تھیں۔

(۱۴) زمیندار نے اسلامی تحریکات کے سلسلے میں اور لوگوں تک اس کی آواز پہنچانے میں ایک بڑا کام کیا۔ مثلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ نسبت دوم منعقدہ امرت سر کی پوری تفصیل اور مولانا غلام حسین وزیر معارف امورِ داخلہ ریاست بہاول پور کا پورا خطبۂ صدارت شائع کیا۔ اسی طرح سے انجمن حمایتِ اسلام یا اور دوسرے قومی اداروں کی خدمات اور ان کی سرگرمیوں کو بالتفصیل شائع کرتا تھا۔

(۱۵) اس دور میں اس اخبار نے اپنے زمانہ کی شائع شدہ اور بغرض تبصرہ و تنقید آمدہ کتابوں پر تبصرے کیے۔ کتابوں کے مصنفین اور مولفین کے تعارف نامے لکھے اور ان کتابوں کی علمی ادبی یا سیاسی حیثیت کو واضح کر کے لوگوں کی توجہ اس طرف دلائی تاکہ وہ اچھی کتابوں کو پڑھیں اور اس طرح اردو ادب میں اضافہ بھی ہوتا رہے اور لائق مصنفین کی علمی کوششیں نظر کے سامنے آتی رہیں۔

ظفر علی خاں کے قلم سے اداریے :

خصوصی طور پر ظفر علی خاں نے جو اداریے اپنے قلم سے لکھے ان کی علمی اور ادبی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہم ان میں سے دو اداریے پیش کر رہے ہیں۔

(۱) لاہور۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ۔ "حجت حق کا ظہور"

ہنوز آں ابر رحمت در فشاں است　　خم و خمخانہ با مہر و نشاں است

"آج کی ساعت سعید اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر تاقیام قیامت اپنا جواب آپ ہوگا۔ آج دنیا کا وہ سب سے بڑا انقلاب برپا ہوا جس نے دنیا والوں کی کایا پلٹ دی۔ خدائے بزرگ و برتر کی دیرینہ حجت اپنے بندوں پر ختم ہو گئی۔ وہ جیتا جاگتا ارمان جو آذر کے حقیقت شناس بیٹے کے سینے میں مضطرب تھا، تڑپ کر باہر نکل آیا۔ وہ زندہ تمنا جو موسیٰ عمران اور عیسیٰ مریم کے دلوں میں سمائی رہی۔ ساری کائنات میں ایک ہنگامہ رست خیز بپا کرنے کے لیے آشکارا ہو گئی۔ باطل ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا۔ انسان کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ آزادی کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ یوم الست کے بھولے ہوئے میثاق کی تجدید ہوئی۔ مدتوں کا بھاگا ہوا غلام آقا کے قدموں میں آگرا۔ کالے اور گورے کا امتیاز، اونچ نیچ کا فرق جاتا رہا۔ مسندوں والے اور کمبلوں والے ایک بوریے پر بٹھا دیے گئے۔ خزاں رخصت ہوئی۔ بہار آگئی۔ رات بیت گئی، دن نکل آیا۔ یعنی حضور رحمت عالمیاں، صفوت کامیاں، تتمۂ دور زماں محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ بابائنا و امہاتنا جلوہ افروز منصۂ شہود ہوئے۔

ہمارے آقائے نامدار آئے اور دونوں جہانوں کی رحمتیں اپنے جلو میں لے کر آئے۔ ابر نیساں کی طرح جس کی لطافت طبع پر چمن اور دمن کا یکساں حق ہے، ہمارے حضور کا لطف بے نہایت بھی اپنے آغوش رافت کو مشرق و مغرب اور سپید و سیاہ کے لیے ایک سی فیاضی کے ساتھ کھولے ہوئے ہے۔ بلال رض حبشی اور سلمان رض فارسی یہاں ایک کانٹے میں تلتے ہیں۔ مکہ ہو یا ہردوار، مدینہ ہو یا لندن، حضور ص کی آواز ہر جگہ ایک ہی لے میں گونج

رہی ہے اور وہ آواز یہ ہے ۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا

اپنے پروردگار کے نام کا وِرد کر اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہ ۔ وہ مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے ۔اس کے سوا دوسرا کوئی لائق عبادت نہیں ۔پس تو اسی کی کارسازی کا دامن تھام لے ۔

جن سعیدان ازلی نے اس آواز پر کان دھرا اور ماسوا سے رشتہ توڑ کر یہ آواز بلند کرنے والے کی طرح اپنے اللہ ہی کے ہو رہے ۔ ان کے عالم افگن کارناموں پر گزشتہ تیرہ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے ۔ اس آواز میں اب بھی وہی اثر ہے' اور اگر دل کے کان اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو تاریخ اپنا اعادہ کرنے میں ذرا تامل نہ کرے گی ۔ اور حضورؐ خواجہ دوسرا کے غلام آج کل کے قیصروں اور کسراؤں کے تخت از سر نو اُلٹتے ہوئے دیکھے جائیں گے ۔"

۱۹۲۸ء کا سال مولانا ظفر علی خاں کے لیے اس اعتبار سے بھی سخت تھا کہ ماہ مارچ ۲۸ء سے مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک زمین دار سے الگ ہو گئے ۔ انھوں نے اپنا اخبار الگ جاری کر لیا ۔ اور مولانا ظفر علی خاں سے قلمی لڑائیاں شروع ہو گئیں ۔

علمی مضامین

ظفر علی خاں کے قلم سے علمی مضامین بھی زیبِ قرطاس ہوتے رہے اور یہ وہ طویل مضامین تھے جن میں ان کے قلم کی گل کاریوں نے ادبی ،سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر خامہ فرسائی کی تھی مثلاً (۱) ۱۵ر جنوری ۱۹۲۸ء کو یہ طویل مضمون شائع ہوا تھا "کیا اورنگ زیب ہندو کُش تھا یا ہندو نواز" اسی طرح "کشف غطا" کے نام سے ادبی ندرت کے ساتھ جنگِ عمومی کے فسانے کی ایک بصیرت افروز تفصیل ۔ (۳) عبید زاکانی ہزل نگاران عجم کا پیشوا "ازالۃ الخفا" کے عنوان سے ماہ اپریل کی کئی قسطوں میں ان کے اپنے قلم سے اپنے حالات پر اور اپنی سیاسی زندگی اور صحافتی زندگی کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ۔ (۴) ایک دِل کشا صحبت ابنِ سعود کے ساتھ اور مسائل حاضرہ پر تبصرہ ۔ (۵) قیام مصر کے حالات اور مولانا کا طویل ترین بیان مصر کی سیاسیات کے متعلق ۔ (۶) عربستان کی آزادی کا مسئلہ اور عربی ممالک کا اتحاد ۔ (۷) مکتوبِ مصر ۔ظفر علی خاں کے قیام مصر کے حالات ۔"

دُوسرے مضامین نگار حضرات میں عبدالرزاق ملیح آبادی ، مولانا علم الدین سالک ، مولانا محی الدین احمد قصوری ، سید صالح محمد عارف ، حامد الانصاری غازی ۔ افغان سیاست پر خصوصیت سے لکھنے والے ۔ سید سرور شاہ گیلانی اسلامی پردے پر ۔ مولانا ابو تراب محمد نور الحق ۔مولانا شاہ عبدالعزیز صابری حنفی ۔ قاضی زین العابدین میرٹھ ۔ مولانا مفتی عبدالقادر ۔

مُلّا رُموزی جرنلسٹ۔ مولانا عبدالرحمٰن نظامؔ خلیل آبادی۔ سفرِ یورپ از قلم ٹھاکر دت شرما۔ سیّد زبیر ایم، اے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت گرامی مرحوم کا کلام بھی اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہا۔ اور خصوصیت سے ۲۶ فروری ۱۹۲۸ء کو ان کا غیر مطبوعہ فارسی کلام بھی شائع۔ جن میں سے چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں۔

محمد عربی ختم انبیائے جلیل
خلیل راست مثال و کلیم راست مثیل
تبارک اللہ امام رسل پیمبر ماست
کہ خواند فارقلیط اش مسیح در انجیل

زود آمدہ ام اگرچہ دیر آمدہ ام
سر بر خط حضرت امیر آمدہ ام
در مے کدۂ ساقیٔ کوثر رفتم
پیمانہ کش خم غدیر آمدہ ام

حرفے ز علی بگو امیرم اینست
پیدا و نہفتہ در ضمیرم اینست
آں دستِ خداست دستگیری بکند
دستم گیرد کہ دست گیرم اینست

رفتم ز جہاں ولی ولی میگویم
ہر دم ایمان علی علی میگویم
من حلقہ بگوش اہل بیتم ز ازل
جاں میدہم علی علی، میگویم

خبروں کے سلسلے میں اس اخبار کا طریق کار حسبِ سابق باقی رہا کہ ملک کی کانفرنسوں یعنی آل پارٹیز کانفرنس، کانگرس اور مسلم لیگ، کے متعلق جملہ خبریں اہم عنوانات اور نکات کے ساتھ شائع کرنا اس کا صحافتی اصول تھا، اِسی سلسلے میں اس نے دیگر راہ نماؤں کے

خطبہ ہائے صدارت اور ان کی اہم تقاریر کی خبریں شائع کیں۔ سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جو سیاہ جھنڈیوں سے استقبال ہوئے یا پنجاب کونسل میں بحث و مباحثے ہوتے رہے زمیندار نے ان پر پورے طور سے تبصرے کیے اور اداریے بھی لکھے۔ اس طرح عوام کے نقطۂ نظر کو پورے طور سے پیش کیا اور عوامی نقطۂ نظر کو حکومت تک پہنچایا۔

۱۹۲۸ء کا سال اردو صحافت میں اس لحاظ سے ایک افسوس ناک سال تھا کہ افکار و حوادث کے سبب سالک نے زمیندار کے خلاف جو ادبی چٹکیاں لیں وہ کسی نہ کسی حد تک آگے بڑھ کر ذاتیات تک پہنچ گئیں۔ ظفر علی خاں کے لیے یہ بات افسوس کا سبب بھی تھی اور رنج کا بھی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک مضمون میں مولانا ظفر علی خاں کی علمی ادبی اور صحافتی اور گراں قدر خدمات کا انکار کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا گیا کہ بیج ناقص ہے یا زمین شور زار ہے۔ یہ پھبتی ان کے لیے اور زیادہ تکلیف کا باعث بنی جس کے نتیجے میں یہ صحافتی لڑائی زیادہ بڑھ گئی اور ظفر علی خاں کو اپنے سلسلے میں کئی نظمیں بھی لکھنی پڑیں۔ اور ادارت الحفا کے نام سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے ساتھ انھوں نے نظموں میں معرکۃ الآرا جواب دیے جس کا ذکر ہم سابق میں کر چکے ہیں۔

نظمیں :

سالِ گزشتہ کی طرح اس سال سنڈے ایڈیشنوں میں بدستور ان کی نظمیں پہلے صفحہ پر جلی قلم سے شائع ہوتی رہیں۔ اور یہی خصوصی نمبروں کی خصوصیت ہمیشہ رہی۔ البتہ کبھی کبھی دوسرے ممتاز شعرا کی نظمیں بھی صفحۂ اوّل کی زینت بنتی رہیں۔ صفحۂ اوّل کے علاوہ اخبار میں جن دوسرے شعرا کی فارسی اور اردو نظمیں شائع ہوتی رہیں، ان میں حضرت گرامی مرحوم، نیر واسطی، مرزا بیضا خاں ایرانی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ظفر علی خاں کی جو مشہور نظمیں اس سال اخبار کی زینت بنیں ان میں سے بعض کے عنوانات اور اقتباسات درجِ ذیل ہیں :

یکم جنوری ۱۹۲۸ء

(۱) بعنوان "جستجو"۔

خم خانۂ الست کے خمار ہیں کہاں
عہدِ سلف کے رند قدح خوار ہیں کہاں

جھکنے لگی ہے غیر کی دہلیز پر جبیں
اے ربِّ کعبہ تیرے پرستار ہیں کہاں

آپس کی پھوٹ ختم ابھی تک نہیں ہوئی
آزادیٔ وطن کے طلب گار ہیں کہاں

۸ر جنوری ۱۹۲۸ء

(۲) "آزادی و غلامی"

نہیں جن کو ملی توفیقِ اقدامِ عمل اب تک
ہمالہ سے بھی اونچا لگ رہا ہے ڈھیر ردّی کا

ہے مرکز آج کل لاہور ان رجعت پسندوں کا
وفاداری کے دفتر میں خوشامد کے پلندوں کا

۱۵ر جنوری ۱۹۲۸ء

(۳) "انقلاب"

اِنقلابِ زمانہ دیکھیے گا
قطع رشتے ہوئے اخوت کے
جھک گئی تھی جو بارِ احساں سے
ہوتی آئی ہے یونہی دُنیا میں

کل جو تھے دوست آج ہیں دشمن
بھائیوں کا بگڑ رہا ہے چلن
ہے اب اکڑی ہوئی وہی گردن
رسم ہے روزگار کی یہ کہن

۲۰ر جنوری ۱۹۲۸ء

(۴) "عبرت"

وہ ملّت جو دنیا میں خیرالامم تھی
ہٹی ہند میں اپنے مرکز سے ایسی

ارادہ تھا جس کا خدا کی مشیّت
کہ آج اس کا مذہب ہے لامرکزیت

۵ر فروری ۱۹۲۸ء

(۵) "اعتراف"

ہم خود ہیں اپنے تئیں جرائم کے معترف
پنجے میں ہیں مہاجنوں کے ہم پھنسے ہوئے

جاہل بھی ہیں، ذلیل بھی ہیں اور فقیر بھی
اور چل رہے ہیں ہم پہ حکومت کے تیر بھی

۱۹ر فروری ۱۹۲۸ء

(۶) "نویدِ امن"

سرجان سائمن کو ہمارے خروج میں
صیاد پھانسنے ہمیں آیا تھا جال میں
برطانیہ سے ہم نے موالات ترک کی

اپنے عروج کا نظر انجام آگیا
آتے ہی لیکن آپ تہِ دام آگیا
تھا ایک پاس حربہ وہی کام آگیا

۹ر ستمبر ۱۹۲۸ء

(۷) "میدانِ عرفات میں میری مناجات"

تلخیاں جتنی زمانہ کی ہیں سب سہنی سکھا
سینکڑوں طوفاں ہیں پنہاں جس کی اک اک موج میں

جانِ شیریں کو حریفِ لذّتِ آزار کر
اس سمندر سے مسلمانوں کا بیڑا پار کر

جو سزا چاہے انھیں دے لے کہ تو مختار ہے　　لیکن اپنوں کو نہ غیروں کی نظر میں خوار کر

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء

(۸) "دہلی میں تاج دارِ دکن کی آمد"

اگر آڑے نہ آتی ہمت آصف جاہ ہفتم کی　　قوی جن کے ہیں بازو جا بلے ہوتے ضعیفوں میں
دکن نے اپنا حق مانگا تو لندن سے جواب آیا　　کہ احساں کی جزا احساں نہیں ہوتی شریفوں میں
نواسنجانِ دہلی کو صلائے عام دیتا ہوں　　کہ دادِ فکر دیں ان قافیوں میں ان ردیفوں میں

۳۰ ستمبر ۱۹۲۸ء

(۹) "باریش بابا ہم بازی"

در حق ما ہر چہ گوید از رہِ طعن انقلاب　　باطل اندر، باطل اندر، باطل اندر باطل است
دستِ گستاخش نگر بر ریش بابا ہم رسید　　طفلکِ ناداں ز بازیہائے بابا غافل است

"ذکاہات" از نقاش (مولانا ظفر علی خاں کے قلمی نام سے)

سر جان سائمن نے مارچ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی مرتبہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے خاکِ لاہور کے ذرہ ذرہ کو یمن و سعادت کا ایک ایک آفتاب جہاں تاب بنانا چاہا تو اس شہرِ غدار کے بے بصرانِ ازلی نے گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور از راہِ غایتِ شوخ چشمی یہ اعلان کر دیا کہ جس دن یہ بن بلائے مہمان ہمارے گھر کی دہلیز پر قدم رکھیں گے ہم سیاہ ماتمی جھنڈیوں کو بلند کیے ہوئے ان کو پکار کر کہہ دیں گے کہ منھ کالا کیجیے اور ٹھنڈے اپنے گھر کو واپس تشریف لے جائیے۔

"پیامِ مشرق" کے شہرۂ آفاق مصنف حضرت علامہ اقبال اور ان کے حبیب لبیب سر محمد شفیع کی رائے مبارک میں اہلِ لاہور کا یہ نامطبوعہ رویہ نہ صرف مشرقی مہمان نوازی کی شان دار روایات کے لیے باعثِ صد ہزار توہین تھا بلکہ ملتِ بیضا کے اغراض و مقاصد کے ساتھ بھی جو برطانوی ملوکیت ہی کے آغوشِ عاطفت میں پرورش پاکر پروان چڑھ سکتے ہیں، کھلی ہوئی غداری سے کم نہ تھا۔ اس لیے حضرت علامہ اور دوسرے دیدہ ورانِ ملت نے ایک ہنگامہ خیز اشتہار راتوں رات شہر کی دیواروں پر چسپکوا دیا جس میں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تھا کہ کفار ہنود کے ساتھ مل کر اپنی عاقبت خراب نہ کریں اور سر جان سائمن کے ورودِ مسعود پر مقاطعہ اور ہڑتال کا نام بھی نہ لیں۔ ورنہ ان کی ہستی یقیناً اسی طرح گردِ روزگار میں دب کر فنا ہو جائے گی جس طرح بابل و نینوا مٹ کر گم نام و بے نشان ہو چکے ہیں۔

یہ حکیمانہ ارشادات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل تھے لیکن افسوس کہ مجلسِ خلافت

پنجاب کے سرپھرے ارکان پر ان کا خاک اثر نہ ہوا اور انھوں نے سالمن صاحب کے مقاطعہ کی تیاریوں میں دن رات ایک کر کے اسلام کے شرف و مجد کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بیڑے کی تباہی میں جو رہی سہی کسر تھی وہ مولانا محمد علی نے دہلی سے آکر پوری کر دی اور ایسی آگ لگانے والی تقریر کی جس کا دھواں ابھی تک مزنگ روڈ اور میکلوڈ روڈ کے اطراف و جوانب سے اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہمیں طول و عرض ہند میں کسی ایسے نالائق مسلمان کا علم نہیں جس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں کے جنازوں کو بھی کندھا نہ دیا اور نہ کسی ایسے احمق ہندو کی ہمیں خبر ہے جس کے نزدیک کسی مسلمان کا اپنے ہی کسی ہم مذہب کے جنازہ کو کندھا نہ دینا ہندوؤں کی کوئی مذہبی یا سیاسی خدمت ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک مسلمان کو ہم جانتے ہیں جس نے بال گنگا دھر تلک کو آں جہانی کی ارتھی کو کندھا بھی دیا تھا اور ماتھے پر تلک بھی لگایا تھا۔ اور یہ حضرت بابائے خلافت ہیں۔ "خلافت" کے افتتاحیہ نویس کا روئے سخن دراصل حضرت ممدوح کی طرف تھا لیکن یہ "غیر ضروری حرکت" اصل واقعہ پر پردہ ڈالنے کے لیے ان "انتہا پسند مسلمانوں" پر چسپیک دی گئی جن کا کہیں وجود نہیں۔ اس صورت میں سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیا بابائے خلافت اپنی انتہا پسندی کے مقامِ رفیع سے ذرا نیچے اتر سکتے ہیں یعنی اکابر ہندوؤں کی ارتھیوں کو کندھا دینے اور جیبیں پر قشقہ لگانے کی حرکاتِ غیر ضروری سے باز آسکتے ہیں؟

ہمارے آقا و مولا جب دنیا میں تشریف لائے تو بالکل اکیلے تھے، صرف رفیق الاعلیٰ ساتھ تھا کہ وہ بہترین رفیق ہے۔ اس کی رفاقت کے بل پر حضورؐ نے یکہ و تنہا سارے عرب کو مسخر کر لیا۔ اور جب دنیا کا یہ سب سے بڑا گلیم پوش تاج دار، جو ایک ہی وقت میں فقیر بھی تھا اور بادشاہ بھی۔ عابد شب زندہ دار بھی تھا اور افواج جرار کا سپہ سالار بھی۔ ابجد تاشناس بھی تھا اور فلسفیانہ عالمِ ادب آموز بھی۔ مجسمۂ جمال بھی تھا اور پیکرِ جلال بھی۔ سونے چاندی کے انباروں سے گھرا بھی تھا اور پیٹ پر پتھر باندھ کر کئی کئی دن تک فاقہ کرنے والا بھی۔ تیئیس سال کی قلیل مدت میں مفاسد کو زیر و زبر کر کے راہ گزار عالمِ جاودانی ہوا تو اپنے جاں نثاروں کو یہ پیغام دیتا گیا:

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان کے ساتھ خدا کا پختہ وعدہ ہے کہ وہ انھیں روئے زمین کی سلطنت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح اگلی امتوں کو عطا ہوئی اور اس دین (اسلام) کو جو ان کے لیے پسند کیا گیا ہے، پائندہ استوار بنائے گا اور ان کے خوف کو امن و امان سے بدل دے گا۔"

یہ اٹل اور امرٹ پیغام مسلمانوں کی فرماں روایانہ حیثیت کے لیے بارگاہِ رَبّ السمٰوٰت والارض سے ایک جاودانی سند ہے۔ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان جن کی تعداد سے بدر کے تین سو تیرہ جاں بازوں کو کوئی نسبت نہیں، اس وعدۂ الٰہی کے الفاظ پر غور کریں اپنے آقا و مولاؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک واقعہ سے سبق لیں اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب دے لیں کہ اس مُلک میں جہاں وہ ہزار سال تک نقارۂ انا ولا غیری بجا چکے ہیں۔ کم از کم عزّت اور آبرو کی زندگی بسر کرنے کا سامان کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ یہ نہ کریں تو پھر آج کا دن جو ان کی ہستی کا آسمانی دیباچہ ہے، ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فقط

ظفر علی خاں

(۲) ظفر علی خاں کے زورِ بیان نے بے پردگی کے خلاف جس شدّت کے ساتھ مندرجہ ذیل اداریہ میں احتجاج کیا ہے وہ اس بات کی روشن مثال ہے کہ انھیں افراد کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں بلکہ وہ اسلام کے اصولوں کے خلاف کسی سے بھی مصالحت نہیں کرنا چاہتے۔ خواہ وہ کسی قدر گھر لنے اور بلند مرتبہ اشخاص اور افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۲۷ء کے "تہذیبِ نسواں" میں محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کا ایک مضمون شائع ہُوا جو پردے کے سراسر خلاف تھا۔ اور چوں کہ مولانا سیّد ممتاز علی صاحب، ایک ذی علم بزرگ کے زیرِ ادارت یہ بلند پایہ اخبار نکل رہا تھا جس میں یہ حجاب سوز مضمون شائع ہُوا تھا۔ اس مضمون کے زہریلے اثرات کو جو کچھ انھوں نے محسوس کیا اس کا رَدّ کرنے کے لیے خود اپنے قلم سے یہ زوردار اداریہ لکھا۔ ذیل میں ہم اُن کا یہ اداریہ من وعن نقل کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ وہ لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر اسلام کے اصولوں کی حفاظت میں کس طرح سینہ سپر رہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے غلو حجاب پرستی کے خلاف بھی جس انداز سے لکھا، وہ انھی کا حق تھا۔

فتنۂ تفرنج :

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا

مغربی معاشرت کی کورانہ تقلید کا جنون جو پہلے مشرقی مَردوں کے سر پر سوار تھا، اب ان کی عورتوں پر بھی اپنے طلسمی ڈورے ڈالنے لگا ہے۔ حرم سرائیں آج تک سیلابِ تفرنج سے محفوظ تھیں لیکن اب اس کی بلاخیز موجیں ان کی چار دیواری کو بھی بوسہ دینے لگی ہیں۔ مَرد کوٹ پتلون پہن کر، داڑھی منڈا کر مغربیت کے حمام میں، جہاں سبھی ننگے ہیں، برہنہ رقص کرنے لگ ہی گئے تھے، عورتیں بھی بے تاب ہیں کہ برقعے اتار پھینکیں اور "قرن فی بیوتکن" کے ارشاد

اگلے وقتوں کا ڈھکوسلا سمجھ کر گھروں سے باہر نکل آئیں اور خوب ہی کھُل کھیلیں۔

مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنا دماغی توازن کھو کر ترکنوں کی بے پردگی کا خود سامان کیا تھا۔ اناطولیہ سے یہ فتنہ اٹھا اور اب دنیائے اسلام کے بہت کم ایسے حصّے ہیں جن پر اس کا تھوڑا بہت اثر نہ ہُوا ہو۔ مصر کا تو پوچھنا ہی کیا۔ پیرس اور لندن کی آزادیوں نے قاہرہ کی خاتونوں کے دلوں میں پہلے ہی اپنا گھر کر رکھا تھا۔ ہمارے عزیز دوست علّامہ سیّد سلیمان ندوی جب وفدِ خلافت کے سلسلے میں وہاں گئے ہیں تو قاضیٔ مصر نے بڑے فخریہ لہجے میں ان سے کہا تھا کہ خاکسار کی صاحب زادی ناچتی خوب ہیں۔ ایران اور افغانستان میں بھی لکھّی پڑھی اب زیادہ دِنوں پردہ میں بیٹھتی نظر نہیں آتیں۔ مسٹر داؤد واپسن کہتے ہیں کہ افغانستان کے متمدن خاندانوں میں برقع و مقنع زیادہ سے زیادہ دو سال کا مہمان ہے۔ مغرب میں اگر ناموسِ شریعت غرا کی پاسبانی کو عبدالعزیز ابن سعود موجود نہ ہو جاتا تو یہی دن اسے بھی دیکھنے پڑتے۔ رہا ہندوستان تو اس کے متعلق جدید ترکی انقلاب سے مدتوں پہلے حالات دیکھ دیکھ کر اکبر مرحوم نے کہہ دیا تھا کہ ؎

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئیں کی چلمن کی تیلیاں کب تک

اس قول کی تصدیق مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں اوّل عطیہ فیضی خانم نے ایک بھرے جلسہ کے اندر، اس بے باکانہ انداز سے کہ ساری نئی پود عش عش کر اٹھی اور مولینا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جیسے دقیانوسی قل اعوذ پڑھے منہ بسورتے ہی رہ گئے۔

ہمارے مخدوم مولینا سیّد ممتاز علی صاحب اگرچہ عمر کی ستّر سے زاید منزلیں طے کر چکے ہیں لیکن آپ کا جذبۂ حمایتِ آزادیٔ جنسِ لطیف ہنوز اپنے پورے شباب پر ہے۔ اور آپ کے اہتمام میں "تہذیبِ نسواں" کے نام سے جو بلند پایہ ہفتہ وار اخبار رسالہا سال سے نکل رہا ہے وہ ہندوستان میں منطق کے زور سے وہی خدمت انجام دینے میں مصروف ہے جسے مصطفےٰ کمال پاشا نے قانون کے بل پر اناطولیہ میں انجام دیا۔

۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء کے "تہذیبِ نسواں" میں محترمہ نذر سجاد حیدر" دوزخ کا نظارہ" کے آتشیں عنوان سے ایک رنگین مقالہ سپردِ قلم فرماتی ہیں جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ناقص العقل کہا چھین لی آزادی ہے
شدّتِ پردہ ہوئی باعثِ بربادی ہے

محترمہ ممدوحہ نے جس آزادی کے چھین لیے جانے کا شکوہ اس تلخی سے فرمایا ہے۔ اس کی

بحالی کا نقشہ کھینچنے سے پہلے آپ نے اپنا زورِ طبیعت ایک تمہید پر صرف کیا ہے جس کا اقتباسِ ذیل دید کے قابل ہے :

"کوئی میری رائے کو پسند کرے یا ناپسند۔ فی زمانہ قابلِ عمل خیال کی جائے یا دشوار۔ اس کے نتائج اچھے سمجھے جائیں یا نقصان دِہ۔ مگر میں باوثوق کہہ سکتی ہوں کہ ہندوستان میں بھی بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جو آج مہذب و متمدن ممالک اسلام مثلاً ٹرکی میں آچکا ہے اور زمانہ جانتا ہے کہ باوجود بے حد مخالفتوں کے وہاں نئے خیالات اور نئے رواج ترقی پر ہیں اور تقریباً یہی حالات افغانستان، عربستان (عرب کا ذکر رہنے دیجیے، وہاں کتاب و سُنت کی حکومت ہے۔ متفرنجانہ ذہنیت کا استیلا نہیں) اور ایران کے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد ہندوستان میں بھی گزشتہ پندرہ سال میں بہت کچھ آگے بڑھ گیا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ تبدیلی و آزادی مفید ہے یا مضر، اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا (وہی ہوگا جو یورپ میں ہوا اور اس کی عدالت ہائے طلاق کی روداد وں میں درج ہے) مگر اتنا ہم جانتے ہیں کہ جو ہو رہا ہے، ہو کر رہے گا۔ ہماری جاہل قوم زمانۂ جاہلیت ہی میں اخلاقی عیوب سے کب پاک تھی۔ جو ہم اب اس خطرے یا وہم سے لرزیں کہ آزادی کا نتیجۂ بد دیکھنا ہوگا۔"

عورتوں کے غیر محرم مَردوں سے بے حجابانہ مِلنے جُلنے سے جن خرابیوں کا پیدا ہونا ابدہ البدیہات ہے۔ ان کی طرف سے آنکھوں پر اس قدر بے تکلفی کے ساتھ پٹی باندھ لینے والی خاتون ہندوستان کے واژگوں بخت مسلمانوں کو مشورہ مندرجہ ذیل ہی دے سکتی ہے :

"صرف اتنے حوصلے اور فراخ دلی کی ضرورت ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاندان جو پردہ میں بہت کچھ کمی کر چکے ہیں وہ ان اچھے تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکوں کو گھروں میں آنے دیں جن کو وہ دامادی کے لیے پسند کر سکتے ہیں۔ اور ان کے بعد متوسط درجے کے لوگ، جن میں تعلیم بھی متوسط ہی ہے اور پردے کی شِدت ہے، وہ اتنی مہربانی کریں کہ لڑکی کے جوان ہوتے ہی ان کے خاندان کے لڑکوں مثلاً لڑکیوں کے چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھائیوں سے پردہ نہ کرائیں بلکہ انھیں آپس میں مِلنے جلنے دیں اور خود ان کے رُجحان، خیالات و میلانِ طبائع کا خیال رکھیں اور غور کرتے رہیں کہ کون سا بھائی کون سی بہن کو زیادہ پسند

کرتا ہے۔ کس کی کس سے محبت ہے اور اس پسندیدگی کو گھر بھر خوش گوار ئ تعلقات کی بنا سمجھ کر منگنیاں کر دیں۔ اس صورت میں ان شدید پردہ دار گھرانوں کو غیر لڑکوں سے بے پردگی کرانی نہ ہوگی۔ اگر قریبی رشتہ داروں میں اچھا لڑکا میسر نہ آسکے تو ذرا سی اور ہمت کریں کہ اپنے پہلے سے شادی شدہ سسرالوں کو جو غیر ہیں دِل سخت کر کے اپنا عزیز خیال کر لیں ... مگر یہ ترکیبیں ہیں شدید پردہ داروں کے لیے، ورنہ آج کل جو اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہے، وہاں قریب قریب پردہ مفقود ہے اور ان کو ہر طرح آسانی حاصل ہے۔"

نذر سجاد حیدر صاحبہ کے مضمون کی یہ پہلی قسط ہے۔ اور قارئین کرام نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا کہ مغربی معاشرت کی اندھا دھند پیروی کی دُھن میں ہماری محترمہ اس حیا سوز آئین کا خاکہ کھینچ گئی ہیں جسے مسیحی دُنیا "کورٹ شپ" کہتی ہے۔ معلوم نہیں دوسری قسط کو حوالۂ کاغذ کرتے وقت ان کی گریز پا آزادی کا بے پناہ جذبہ انھیں کہاں سے کہاں لے جائے گا۔

یہ ہیں صحیح اسلامی تربیت نہ ہونے کے نتائج۔ ہمارے علما کس خوابِ خرگوش میں ہیں اور ہماری درس گاہیں کس بسم اللہ کے گنبد میں پڑی ہیں۔ کیا ان کی آنکھیں اس دن کھلیں گی جب شریعت اسلامی کے نوامیس مقدسہ کا جنازہ ان کی مادر پدر آزاد بہو بیٹیوں کے کندھوں پر سرِ بازار نکل چکا ہوگا۔

مَیں نے نذر سجاد حیدر صاحبہ اور ان کی ہم نواؤں کی متفرنجانہ شوخ چشمیوں پر تو لے دے کر لی۔ اب چند وہ پرانی وضع کے بزرگ بھی سُن لیں جن کا غلو حجاب پرستی اصل بناءِ فساد ہے۔ میں ایسے خاندانوں سے واقف ہوں جہاں پردہ کی سختی کا یہ عالم ہے کہ گھر کی عورتوں کے کپڑے تک دُھلائی کے لیے دھوبیوں کو نہیں دیے جاتے مبادا اس سراپا پردہ گراں عفاف کے محرم کو نامحرموں کی انگلیاں چھُو جائیں اور خاندان کی عزت کو بٹہ لگ جائے۔ نذر سجاد حیدر اسی متشددانہ ذہنیت کی منطقی پیداوار ہیں۔ وضعِ قدیم و وضعِ جدید میں یہی وہ بلا انگیز بُعد المشرقین تھا جو فطرت انسانی کے اس مشہور نقاد اکبر الہ آبادی کی زبان پر یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا تقابل آیا:

قدیم وضع کا رہتا ہوں مَیں اگر پابند — تو صاف کہتے ہیں سید کا رنگ ہے میلا
جدید وضع اگر اختیار کرتا ہوں — تو اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمینڈ بھی چھُو نہیں سکتا — اُدھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحیِ مے لا
اِدھر یہ دفترِ تدبیر و عقل سب ناپاک — اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را　　بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

قرآنِ کریم کی قائم کی ہوئی حدود سے اگر ہمارے پُرانی وضع کے بزرگ متجاوز نہ ہوتے اور عورتوں کو صرف اتنی باتوں کا پابند بنائے رکھتے جن کی وہ شرعاً مکلّف ہیں تو آج انھیں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا اسوۂ حسنہ چھوڑ کر دیارِ مغرب کی ترساز ادیوں کی تقلید کا شوق کیوں چرّاتا۔ نکاح سے قبل ہر عورت شرعاً یہ حق رکھتی ہے کہ اس مرد کی صورت دیکھ لے جس کے ساتھ اسے عمر کاٹنی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس غریب نوشہ بھی اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا عموماً مستحق ہے کہ کسی کالی کلوٹی، لنگڑی لولی دُلھن کو اس کے گلے تو منڈھ نہیں دیا جاتا۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ جوڑا ایک دوسرے کے شمائل، ایک دوسرے کے خصائص سے اچھی طرح واقف ہو۔ سو اگر تربیت صحیح اسلامی طریقے پر ہوئی ہو تو اوّل تو اس واقفیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور اگر بہت ہی قدغن ہو تو ماں باپ اور خویش و اقارب کس مرض کی دوا ہیں۔ حسن تو پردہ میں چھپ سکتا ہے اور شاید زشت روئی بھی چھپ سکتی ہو، لیکن ایسا کوئی پردہ آج تک ایجاد نہیں ہوا جو عادات و خصائل کی شہرت کو خاندانوں کی سن گن چھپا سکے۔ نکاح سے پہلے صورت دیکھنے کے ساتھ اگر باقاعدہ میل جول یعنی باصطلاح فرنگ کورٹ شپ بھی ہونے لگا تو　　وائے گر از پسِ امروز بود فردائے!

ظفر علی خاں

اداریے ۱۹۲۸ء

(۱) آل انڈیا کانگرس میں مفاہمت .. .. یکم جنوری ۱۹۲۸ء
(۲) کانگریس میں مفاہمت کی قرارداد تصفیۂ حقوق کا مسئلہ .. .. ۸ر " "
(۳) سائمن کمیٹی کا حشر .. .. ۱۵ر " "
(۴) افغانستان .. .. ۲۰ر " "
(۵) غازی امان اللہ خاں سے ہندوستان کی اُمیدیں (از ظفر علی خان) .. ۲۳ر " "
(۶) غازی امان اللہ خاں کی کجکلاہی کا نیا دَور (از ظفر خاں) .. .. ۳۰ر " "
(۷) نوجوانانِ وطن سے خطاب .. .. ۲ر فروری "
(۸) تحریص و تخویف کے حربوں کی بے اثری (سائمن کمیشن پر) .. .. ۵ر " "
(۹) بیا تا دست افشانیم و مے در ساغر اندازیم .. .. ۱۹ر " "
(۱۰) سر محمد شفیع کا نیا مشغلہ .. .. ۲۴ر " "
(۱۱) استقلالِ حجاز .. .. ۲۸ر " "

(۱۲) سر میلکم ہیلی کے تازہ ترین ارشادات .. .. ۳ر مارچ ۱۹۲۸ء

(۱۳) مطلع عرب پر جنگ کے بادل سلطان ابن سعود کی مجاہدانہ عزیمت ۱۲ر ” ”

(۱۴) کاسۂ لیسانِ ازلی کی حرکت مذبوحی .. .. ۱۳ر ” ”

(۱۵) ہلالِ عید سے دو دو باتیں (نظم میں غازی امان اللہ خاں کی ..
تصویر عید کا چاند دیکھ کر) ظفر علی خاں کے تاثرات .. .. ۲۳ر ” ”

(۱۶) سائمن کمیشن اور ہمارا فرض .. .. ۲۹ر ” ”

(۱۷) مذہب کے خلاف جنگ .. .. ۲۴ر اپریل ”

(۱۸) ڈاکٹر محبوب عالم قریشی اور مولانا غلام رسول مہر (از ظفر علی خاں) ۲۹ر ” ”

(۱۹) تعاون کا حشر .. .. ۲۰ر مئی ”

(۲۰) لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک (از ظفر علی خاں) ۶ر ” ”

(۲۱) آل پارٹیز کانفرنس .. .. ۲۶ر ” ”

(۲۲) یادگارِ حسینؑ .. .. ۲۹ر جون ”

(۲۳) باردولی کا ستیاگرہ، استقلال کی ایک نادر مثال .. .. ۳ر جولائی ”

(۲۴) سر شادی لال اور مسلم آؤٹ لک .. .. ۲۱ر ” ”

(۲۵) مجوزہ دستور اساسی .. .. ۲۵ر اگست ”

(۲۶) آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاسِ لکھنو .. .. .. ۲۶ر ” ”

(۲۷) سرکارِ دو عالمؐ کی شانِ رحمت للعالمینی .. .. .. ۲۹ر ” ”

(۲۸) شبِ امید کہ بد منکشف پردۂ غیب .. .. .. ۴ر ستمبر ”
گو بروں آئے کہ کارِ شبِ تار آخر شد :

(۲۹) سر جان سائمن کا اعترافِ شکست .. .. ۲۱ر ” ”

(۳۰) اقلیتوں کے حقوق .. .. ۹ر ” ”

(۳۱) سائمن کمیشن کو اپنے فرض کا احساس ہے .. .. .. ۱۸ر اکتوبر ”

(۳۲) مقدسین جمیعت کا عتابِ بے جا .. .. ۲۸ر ” ”

(۳۳) نظام الملک آصف جاہ ہفتم مغربی استعمار کی
چیرہ دستیوں کا حریفِ اعظم (از ظفر علی خاں) } .. ۶ر نومبر ”

(۳۴) شملے میں سرکاری تیلیوں کا ناچ .. .. ۲۰ر ستمبر ”

(۳۵) پنجاب کونسل میں جدید گورنر کی تقریر .. .. ۲ر دسمبر ”

ذیل میں ہم مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے نوشتہ اداریوں میں سے دو اداریے درج کر رہے ہیں۔ یہ اہم اداریے ان کے دِلی جذبات اور تاثرات کے ساتھ اُن کے پُروقار اور سنجیدہ اندازِ تحریر میں ادبیت کو پورے طور سے سموئے ہوئے ہے جس سے ان کے زورِ بیان کا اندازہ پورے طور سے ہو سکتا ہے اور زبان پر فاضلانہ قدرت کا۔ ہمارے خیال میں ان کے یہ اداریے کارکنانِ زمیندار اور عملۂ ادارت کے لیے ایک بہترین نمونہ تھے جس کو سامنے رکھ کر زمیندار اسکول اپنے صحافتی خصائص کو زمیندار کے صفحات پر ظاہر کرتا رہا۔ اور اس طرح ملک کے نوجوان افراد کو زمیندار نے صحافت کے اعلےٰ معیار سکھائے۔ جہاں ان نوجوانوں نے ظفر علی خاں کے علمی، ادبی اور سیاسی مضامین، تراجم اور ان کے اداریے پڑھے اور ان کے عالمانہ طرزِ تحریر سے زمیندار اسکول نے ایک خاص امتیاز حاصل کیا۔

(۱) لبّیک اللّٰہم لبّیک لا شریک لک لبّیک۔

؎ رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

"خاکِ کعبہ کی وہی چار ہزار سال کی پرانی کشش جو آذر کے حقیقت شناس بیٹے کو کالڈیا کے چمنستانوں سے حجاز کی غیر ذی زرع وادی میں کھینچ لائی جس نے عبد المطلب کے عالی مقام پوتے کی جاذبیت سے سرشار ہو کر بنی آدم کی ان گنت نسلوں کے ساتھ ہر سال وہی سلوک کیا ہے جو مقناطیس لوہے کے ساتھ کرتا ہے، آج مجھ ذرّۂ بے مقدار کو بھی بے تاب کر رہی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے پندار کے صنم کدہ کو ویران چھوڑ کر دیوانہ وار حق و صدق اور اخوت و مساوات کی ابدی آزاد چار دیواری کی طرف دوڑ پڑوں جس کے ساتھ تیرہ صدیوں سے ملّتِ بیضا کی مرکزیت قائم ہے۔

وفدِ خلافت کا رئیس ہو کر جب سلطان ابن سعود سے گفتگو کرنے کے لیے آج سے تین سال قبل میں عازمِ حجاز ہوا تو صرف فریضۂ عمرہ کی بجا آوری کی سعادت نصیب ہو سکی اور حج کی حسرت دل ہی میں باقی رہ گئی۔

پھر حج کے موقع پر مولانا شوکت علی اپنے احباب کے ساتھ موتمر عالم میں شریک ہونے کی غرض سے تشریف لے گئے اور مجھے اپنا عزم زیارتِ حرمین اس خیال سے ملتوی کرنا پڑا کہ مبادا حجاز میں میری موجودگی ان شبہات کے لیے وجہ تقویت بن جائے جن کا اظہار ان حضرات نے اپنی رپورٹ میں اپنی واپسی پر بے اختیار فاش کر دیا۔ اس دفعہ کوئی حقیقی یا وہمی مصلحت مجھے وہ فرض ادا کرنے سے روک نہیں سکی جس پر میری اسلامی زندگی کے پانچویں حصہ کا کامیابی

کے ساتھ تمام ہونا منحصر ہے۔

اللہ کا نام لے کر میں رہ گزارِ ارضِ مقدس ہوتا ہوں تاکہ اپنی فطرت کو اس چشمہ میں غوطہ دے سکوں جو ابھی تک اپنی اوّلین صفائی کے ساتھ اُبل رہا ہے اور مغربی آلائشوں سے مکدّر نہیں ہوا۔ میں مکۂ معظمہ اور مدینۂ منوّرہ کا عازم ہوں جہاں ابھی تک اسلام کا قانون نافذ ہے جہاں شریعتِ مطہرہ کا آئین جاری ہے۔ جہاں کا ضابطۂ دیوانی کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ ہے۔ جہاں کا فرماں روا توحید کا خلف الصدق ابنِ سعود ہے۔ خدا اسے دیر تک زندہ رکھے۔ کیوں کہ تفرنج کے اس دورِ پُرفتن میں ناموسِ شریعت کے تحفّظ کی اُمیدیں آج اسی کے دم سے زندہ ہیں

ہندوستان کو مژدہ کہ یارانِ نجد سے
دُنیا میں سربلند نبی کا علَم کیا
خدمت حرم کی سونپ دی ابنِ سعود کو
کتنا بڑا خدا نے یہ ہم پر کرم کیا

بیت اللہ پہنچ کر اور حضور خواجہ دوجہاں کے آستانہ پر باریاب ہو کر میں تو مسلمانوں کے لیے دعائیں مانگوں گا ہی لیکن مجھے امید ہے کہ مسلمان اپنی پنج وقتہ دعاؤں میں مجھے بھی فراموش نہ کریں گے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ (از ظفر علی خاں)

(۲) نظام الملک آصف جاہ ہفتم۔ مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کا حریفِ اعظم

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا اِک بار ابھی

خود دار ہندوستان کو حریفانِ فرنگ سے اپنا ناموس بچانے کے لیے آج جس جاں گسل آویزش کا سامنا ہے اس کی تاریخ سپردِ قلم کرتے وقت مستقبل قریب کا بالغ نظر وقائع نگار اس حقیقت کا خواہی نخواہی اعتراف کرے گا کہ برطانیہ کے بے پناہ استعماری حربوں کے مقابلے میں برِّ اعظم ہند کے ایک ثلث یعنی گیارہ کروڑ انسانوں کی طرف سے جو طاقت پوری توانائی کے ساتھ اوّل اوّل سینہ سپر ہوئی، وہ دکن کے جلیل المنزلت تاجدار کی ذات گرامی تھی۔ کانگریس اور خلافت نے بے شک برطانوی ہند کی کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے کر انگریزی اقتدار کے خلاف جدّوجہد شروع کر دی، لیکن دیسی ریاستوں کو جو برطانیہ کے ستم ہائے بے حساب کا بازیچہ بنی ہوئی ہیں، اس وقت تک کے لیے اپنے حال پر چھوڑ دیا جب انگریزوں کی قہرمانی گرفت برطانوی ہند پر ڈھیلی پڑ جائے گی اور پھر وہ ہندوستانی حکومت جو انگریزی اقتدار کے کھنڈروں

پر قائم ہو گی، ان ریاستوں کے ساتھ اپنے حلیفانہ سیاسی تعلقات کی طرح ڈال سکے گی۔
خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ وقت کب آئے گا۔ لیکن اگر اس کے انتظار میں والیانِ ریاست ہائے ہند ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو ڈلہوزی کی وہ حکمتِ عملی جسے کرزن نے حیاتِ تازہ بخش کر ریڈنگ کے زمانہ میں منتہائے اشتداد پر پہنچا دیا۔ ان سب کو صفحۂ روزگار سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی اور ان کا شمار یا تو جلا وطنوں میں ہوتا یا ہر برطانوی ریذیڈنسی کے چپڑاسیوں میں۔

شرف و مجد ہند کی اس انتہائی تذلیل کا اوّلین احساس اس شخص کو ہوا جس کی رگوں میں قلیچ خاں کا گرم خون ابھی تک اپنی پوری حرارت کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ 'آصف جاہیوں' کی دو صد سالہ تمکنت جس کی پشت پر اسلام کی سیزدہ صد سالہ غیرت تھی، اس بات کو گوارا کر سکتی تھی کہ فرنگستان کے نو دولتیے جنھیں نپولین نے ایک مرتبہ زر پرست بنیوں سے تشبیہ دی تھی، شرفائے کشورِ ہند کو یوں رسوا کریں گے۔ میر عثمان علی خاں کی فاروقی حمیت کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ ان کی حدودِ سلطنت کے اندر جو رقبۂ فرانس سے کم نہیں، انگریز سیاہ و سپید کے مالک ہوں اور ان کے ہم چشموں میں سے جس کو چاہیں، گدی سے اتار دیں۔ جس کو چاہیں، جلا وطن کر دیں۔ جس پر چاہیں مقدمہ چلا دیں۔ بیشۂ اسلام کا یہ شیرِ عریں، مادرِ ہند کا یہ مایۂ ناز سپوت یہ جانتے ہوئے کہ اس کا مقابلہ دنیا کی سب سے مہیب عسکری طاقت سے ہے، اپنے آبائی حقوق کی طاقت کے لیے دیوارِ آہن بن کر کھڑا ہو گیا اور حکومتِ انگریزی کو ذیل کا الٹی میٹم بھیج دیا۔

(۱) برار جو دولتِ آصفیہ کا جزوِ لاینفک ہے، واپس کر دیا جائے۔ (۲) دولتِ آصفیہ اپنے اندرونی معاملات میں بالکل اسی طرح خود مختار ہو گی جس طرح ہند ہے۔

اس یادگارِ زمانہ تحدی نے برطانوی امپیریلزم کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بھڑکتی ہوئی آگ پر رکھے ہوئے توے کی سرخی دانۂ اسپند کے ساتھ کرتی ہے۔ میر عثمان علی خاں کا ایک بھی مطالبہ ایسا نہ تھا جو حق و انصاف پر مبنی نہ ہو اور جس کا مداوا وہ مقدس عہدنامے نہ ہوں جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد تاجدارِ برطانیہ نے فرماں روایانِ دکن کے ساتھ وقتاً فوقتاً کیے لیکن حق و انصاف کی آواز وہ تہذیب کب سن سکتی ہے جس کے کان صرف توپوں کی گرج سے آشنا ہوں اور معاہدات کی تقدیس کا پاس اس قوم کو کس طرح ہو سکتا ہے جس کے نزدیک عہد و مواثیق کی حقیقت ایک پرزۂ کاغذ سے زیادہ نہیں۔ جس کی اڑان کا تماشا آئے دن

فضائے مغرب کو دکھایا جاتا ہے۔

اس یہودی نے جس کا نام لارڈ ریڈنگ ہے باردولی کا مورچہ سر کرنے کا مغرورانہ فیصلہ کرلیا کہ تاجدارِ دکن کو اس "تمرّد" کا مزا چکھایا جائے گا اور اسے بتایا جائے گا کہ دولتِ برطانیہ اپنے "تاریخی حلیف" کی حیثیت ہندوستان کے ایک معمولی رئیس سے بڑھ کر نہیں سمجھتی۔ ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت نخوت کے اس اسرائیلی پتلے نے جو مکتوب مسئلۂ دکن پر شائع کیا۔ وہ رہتی دنیا تک برطانیہ کی ہندوستانی حکمتِ عملی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن کر چمکتا رہے گا۔ اس مکتوب نے آخری بار اس تلخ حقیقت کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کر دیا کہ برطانیہ کی لغت میں احسان پذیری، حق شناسی اور انصاف پسندی وہ الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔

اس کے بعد دکن پر برطانوی استعمار کے ہاتھوں جو کچھ گزری وہ جبر و استبداد کی ایک خوں چکاں داستان ہے جسے یہاں دُہرا کر میں اپنے اور قارئینِ "زمیندار" کے دُکھے ہوئے دلوں کو اور زیادہ دکھانا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ انگریز لارڈ ریڈنگ کے آدمیت سوز اعلان کے بعد دکن کے نظم و نسق کی رگ رگ اور نخ نخ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں .... اور دکن کی عزت و حرمت اگر اب بھی ہندوستان کے دل میں باقی ہے تو اس کا سرمایہ ایک اکیلے آصف جاہ ہفتم کی وہ عزیمت ہے جو تزلزل سے آشنا نہیں، وہ دل ہے جو نا امیدی کا شناسا نہیں۔ وہ سر ہے جو بجز خدائے بزرگ و برتر کے آستانۂ کبریائی کے کسی کے آگے جھکنا نہیں جانتا۔

دوسرے والیانِ ملک نے یہ دیکھ کر کہ مغرب کا استعماری بگولا ان کے چمنِ دولت و اقبال کو اڑائے لیے جا رہا ہے، سر جوڑ کر مشورہ کیا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے برطانیہ سے عاجزانہ التجائیں کریں۔ لندن تک اپنے وفد لے جائیں اور بٹلر کمیٹی کے رُوبرُو اپنی فریاد پیش کریں لیکن میر عثمان علی خاں کی غیرت نے اس کو اپنی شانِ کج کلاہی کے منافی سمجھا اور برکن ہیڈوں اور بٹلروں سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہ رکھا۔

حضور اب دہلی تشریف لائے ہیں اور آپ کا مقصد صرف چند روزہ سیاحت ہے۔ غالباً لارڈ ارون آپ سے ملیں گے اور یقیناً مسائلِ دکن پر بھی آپ سے تبادلۂ خیالات کریں گے۔ لیکن آپ کے خیالات کو دُنیا جانتی ہے کہ جب تک دَم میں دَم ہے نہ چھوڑیں گے، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔" "ظفر علی خاں"[1]

---

[1] روزنامہ "زمیندار" لاہور۔ عثمان نمبر۔ ۶ فروری ۱۹۲۸ء مطابق ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ

"زمیندار" کے اداریے - ۱۹۲۹ء

(۱) غازی امان اللہ خاں کی کج کلاہی کا نیا دور	۲۰ر جنوری ۱۹۲۹ء
(۲) غازی امان اللہ خاں سے ہندوستان کی امیدیں (از ظفر علی خاں)	۲۳ر " "
(۳) سر محمد شفیع کا نیا مشغلہ	۲۲ر فروری "
(۴) جنرل نادر خاں کے دعاوی و عزائم۔ چند کھری کھری باتیں (از ظفر علی خاں)	۱۲ر مارچ "
(۵) تشدد کا آغاز	۲۲ر " "
(۶) مسلمانانِ کشمیر اور مہاراجہ سر ہری سنگھ	۲۳ر جون "
(۷) یوم النبی ؐ کی حقیقی شان (از ظفر علی خاں)	۱۸ر اگست "
(۸) مسلمانو! اٹھو اور منزلِ مقصود کی طرف لپکو	۱۱ر اکتوبر "
(۹) افغان ریلیف فنڈ	۲۰ر " "
(۱۰) عدالتِ عالیہ کا وقار خطرے میں	۶ر جولائی "
(۱۱) زمیندار اور جرنیل نادر علی خاں	۱۰ر نومبر "
(۱۲) خالصہ کی نفیرِ عام۔ (فرزندانِ اسلام کو دریائے خون میں شناوری کی دعوت)۔ از ظفر علی خاں۔	۱۹ر ستمبر "
(۱۳) مسلمانوں کے مطالبات	۳ر نومبر "

اداریہ از قلم ظفر علی خاں - ۸ر اگست ۱۹۲۹ء مطابق ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۳۴۸ھ

"یوم النبی ؐ کی حقیقی شان"

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

مسلمانانِ ہند کے ہاتھ سے دولت جا چکی، علم جا چکا، سلطنت جا چکی۔ صرف ایک چیز نہیں گئی اور وہ آقائے دوجہاں محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی کے ساتھ بے پایاں محبت و عقیدت کا والہانہ جذبہ ہے اور یہ وہ موہبتِ عظمیٰ ہے۔ جس کے آگے اس دنیا کی تمام دولتیں اور تمام سلطنتیں ہیچ ہیں۔

اس ہمہ گیر ہنگامۂ تشتت و افتراق میں جس نے مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اگر کوئی قوت فرزندانِ توحید کو ایک مرکز پر لاسکتی ہے تو وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے جس کے زبان پر آتے ہی ملتِ بیضا کے ہر فرد کے تنِ مردہ میں جان پڑ جاتی ہے۔

دلوں کی افسردگی شگفتگی میں بدل جاتی ہے۔ ٹھٹھری ہوئی رگوں کا منجمد خون تیزی سے دوڑنے لگتا ہے اور دنیا والوں کو جو اپنے نزدیک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو ہمیشہ کے لیے مٹی دے چکے ہیں، پیچ و تاب کھا کھا کر خواہی نخواہی اس حقیقت کبریٰ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لوحِ کائنات پر کندہ ہے۔ اس نام پاک پر مر مٹنے والوں سے زندگی کی صلاحیت کا چھین لینا ایک خیالِ خام ہوگا ایک وہم باطل ہوگا۔

مسلمانوں کی فطرت کے اس رمز سے آشنا ہو کر بعض بزرگوں نے مجالس سیرت کے قیام کی طرح ڈالی۔ اور طول و عرض کشورِ ہند میں اعلان کیا کہ ۱۲ ربیع الاوّل کو، جو حضور سرورِ کون و مکاں کے عالم ہستی میں جلوہ افروز ہونے کا مقدس دن ہے، ہندوستان بھر میں جلسے کیے جائیں اور اس تقریب سعید پر حضور صلعم کی مبارک زندگی کے حالات شرح و بسط کے ساتھ بیان کر کے جہاں مسلمانوں کو حضور صلعم کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دی جائے۔ وہاں غیر مسلمانوں کو بھی موقع دیا جائے کہ آئیں اور دیکھیں کہ اس دنیا میں حضور صلعم کی تشریف آوری کائناتِ انسانی کے لیے کتنی بڑی رحمت تھی اور حضور صلعم نے ابیض و احمر اور اسود و اصفر کے تمام امتیاز مٹا کر بنی آدم کے لیے اخوت و آزادی اور مساوات کا کیسا عظیم الشان انعام دلایا۔

مجالس سیرت کی یہ تحریک، جیساکہ خیال ہو سکتا تھا، بجلی کی رَو کی طرح اقصائے ہند میں دوڑ گئی اور آج ملک کا کوئی شہر، کوئی قریہ، کوئی ناحیہ ایسا نہیں، جہاں ایک نہ ایک سیرت کمیٹی قائم نہ ہو گئی اور اس کے اہتمام میں جشنِ میلاد نبی صلعم کے بڑی دھوم دھام کے ساتھ منانے کی تیاریاں نہ کی جا رہی ہوں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بانیانِ مجالس نے مسلمانوں کی فطرت کا نہایت صحیح اندازہ لگایا تھا۔ افغانستان کی ہمسایہ اسلامی سلطنت دیکھتے دیکھتے تباہ ہو گئی مگر اس کی تباہی مسلمانوں کو ایک مرکز پر نہ لا سکی۔ عرب و عجم پر مغربی استعمار کی تیرہ و تار گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ مگر اس خطرۂ مہیب کے عواقب کا تصور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع نہ کر سکا۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی بیڑا تباہی کے قریب آن لگا ہے۔ لیکن مسلم لیگ، جمیعت خلافت، جمیعۃ العلماء کی بڑی بڑی اور صدہا دوسری اسلامی انجمنوں کی چھوٹی چھوٹی آوازیں انھیں ایک پلیٹ فارم پر لا کر نہ بٹھا سکیں۔ مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی جس آواز پر بیدار ہوئی وہ سیرت کمیٹی کی آواز تھی۔ اور اس لیے جاگی کہ اس کو محمد مصطفٰے صلعم کے نام پاک کا واسطہ دلایا گیا۔

اس تحزب، اس تفرق، اسی تشتت نے ان کی رسوائیوں اور ذلتوں کا پیمانہ چھلکا دیا۔

لیکن وہ اپنی ان بدبختانہ آویزشوں سے باز نہیں آئے پر نہیں آئے۔ سیرت کمیٹیوں کی دعوت پر اپنے آقا و مولا کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اتحاد کے یہ شیدائی، اعتصام بحبل اللہ کے یہ مدعی، محمد مصطفےٰ کے نقشِ قدم پر چلنے کے یہ آرزو مند ایک جگہ جمع ہوتے ہی پہلے سے بھی زیادہ جاہلانہ تلخی کے ساتھ لڑنے نہ لگ جائیں گے۔ ایک اگر کہے گا کہ محمدؐ خدا کے بندے بھی ہیں اور اس کے رسول بھی، تو دوسرا اس کا منہ یہ کہہ کر نوچ لے گا کہ محمدؐ کو بشر کہنے والا کافر، اکفر اور قطعی جہنمی ہیں۔ ایک رسول اللہؐ کے واقعاتِ ولادت پڑھتے وقت تعظیماً کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرا اس قیامِ تعظیمی کو خلافِ شرع سمجھ کر بیٹھا رہے گا اور اپنے اس جرم کی پاداش میں محفل سے کان پکڑ کر نکال دیے جانے کے خطرے میں مبتلا ہوگا۔ ایک اس موقع پر جلوس نکالنے، چراغاں کرنے اور اسی قسم کی دوسری نامطبوع بدعتوں کو جائز قرار دے گا، دوسرا اس کی سختی سے شرعی مخالفت کرے گا۔ اور اسلام اور اسلام کی عزت کا دشمن ٹھہرے گا۔ ایک طرف بریلوی ہوں گے دوسری طرف دیوبندی۔ ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد ہوں گے اور دوسری طرف مولانا عبدالماجد بدایونی قدس سرہ اور مولانا منظہر الدین شیر کوٹی غفرلہ۔ پھر کیا یہ سب کچھ اتحاد کا سامان ہے یا افتراق کا لازمہ ہے؟

سیرت کمیٹیوں کے مہتمموں کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ تقریبِ سعید جس کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں اگر شرعاً جائز ہو سکتی ہے تو بحالت موجودہ صرف اسی طرح جائز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس پہلو کو عامۃ المسلمین کے سامنے نمایاں کیا جائے جس میں اخلاقی و روحانی دنیا کا یہ فقید المثال تاجدار بابانا وا ہاتنا فداہ انسانی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بن کر ظاہر ہوتا ہے جس نے اپنی مادی بے مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود دیکھتے دیکھتے بڑی بڑی باجبروت قوتوں کا تختہ الٹ دیا، اور جس نے چند شتربانوں کو چٹکی بجاتے میں جہاں بان بنا دیا۔ اگر سیرت کمیٹیاں مسلمانوں کے دلوں میں اس مجاہدانہ سرفروشی و حریت کوشی کی ایک تڑپ پیدا کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ یہ تحریک نہایت مبارک ہے ورنہ ..... الخ"

منظومات - ۱۹۲۹ء :

صفحۂ اول پر سنڈے ایڈیشن میں سابقہ روایات کی طرح مولانا ظفر علی خاں کی تازہ نظمیں جو موجودہ سیاسی حالات یا اہم واقعات پر مبنی ہوتی تھیں، ہمیشہ شائع ہوتی رہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا رہا کہ ادارتی کارکن حضرات کی نظمیں صفحۂ اول کی زینت بنتی رہیں جن میں مولانا

خدا بخش اظہر امرتسری، قاضی احسان اللہ مرحوم وزیر آبادی، محمد اسعد خاں بی اے ملتان، راز رام پوری کے علاوہ خصوصیت سے اقبال کی بعض نظمیں بھی شائع ہوتی رہیں۔ (مثلاً ۱۸ر اگست ۱۹۲۹ء کو بتقریب یوم النبیؐ "ارمغانِ محقر" کے نام سے اقبال کی فارسی نظم جلی قلم سے شائع ہوئی جس کے دو شعر یہ ہیں:

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پروائے من　　بر نخیزد یک شرار از حکمتِ نازائے من
چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز　　قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرائے من

ظفر علی خاں کی نظموں میں سے حسبِ ذیل نظمیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

(۱) ۲۳ر جنوری ۱۹۲۹ء

نغمۂ نورس

خدا کی شان اک سقے کا بچہ　　مقابل ہے محمد زائیوں کے
نہیں دیکھے پٹے کے ہاتھ اُس نے　　امان اللہ کے شیدائیوں کے
حریف اس عہد میں پیر اور مُلّا　　ہوئے اللہ کی یکتائیوں کے

(۲) ۱۲ر مارچ ۱۹۲۹ء　　ہنگامۂ نو

اگر جاگا جہانِ ایشیا خوابِ گراں سے ہے　　چلا اِک تیر اس شوخ کی بانکی کماں سے ہے
اگر پھوٹی ہیں خورشیدِ درخشاں سے نئی کرنیں　　اگر چھوٹی یہ نور افشاں ہوائی آسماں سے ہے
اگر قندھار میں بجتا ہے آج احرار کا ڈنکا　　اور اس کی گونج ٹکرانے لگی دارالاماں سے ہے
سمجھ ہنگامہ ہے مخلوقِ فیضِ خواجۂ یثرب　　اور اس ہنگامہ کی رونق امان اللہ خاں سے ہے

(۳) ۲۲ر مارچ ۱۹۲۹ء　　شورِ بازاری ہمہمہ

شورِ بازار کی آفت نہ ٹلی تھی سر سے　　کہ بپا غلغلۂ فتنۂ چکنور ہوا
آن پہنچے علما کُفر کے فتوے لے کر　　دیں سراپردۂ اوہام میں مستور ہوا
چند ہی دن میں یہ سُن لوگے کہ مُلاؤں کے ساتھ　　کفر کابل کی مضافات سے کافور ہوا
ٹوٹ ہی جائے گا طاغوت کی ٹولی کا طلسم　　غلبۂ حق اگر اللہ کو منظور ہوا

(۴) ۲۲ر جون ۱۹۲۹ء　　فریاد بحضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب　　صبحِ ازل ہے تیری تجلّی سے فیض یاب
زینت ازل کی ہے تو ہے رونق ابد کی تو　　دونوں میں جلوہ ریز ہے تیرا ہی رنگ و آب
شایاں ہے تجھ کو سرورِ کونین کا لقب　　نازاں ہے تجھ پہ رحمتِ دارین کا خطاب
خیر البشر ہے تو، تو ہے خیر الامم وہ قوم　　جس کو ہے تیری ذاتِ گرامی سے انتساب

صدہا تیرے غلام نصاریٰ کی قید میں — دن زندگی کے کاٹ رہے ہیں بصد عذاب
حق سے یہ عرض کر کہ تیرے ناسزا غلام — عقبیٰ میں سرخرو ہوں تو دنیا میں کامیاب

(۵) ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء — ہیکلِ تفرنج کے پرستار

اس درجہ نصاریٰ کی وہ تعظیم کریں گے — خود اپنی شریعت ہی میں ترمیم کریں گے
کہہ دیں گے جو اغیار کہ اسلام ہے ناقص — بے چون و چرا اس کو وہ تسلیم کریں گے
دنیا کے مسئلہ پر ہو گی اگر بحث — قرباں یہ وہاں دین کی تعلیم کریں گے

دوسرے اشخاص کی نظموں میں فتح مکہ از اثر خامہ محمد فصیح، پیش کش بحضور سرورِ کائنات از مرزا بیضا خاں ایرانی اور مولانا محمد سعید عثمانی، حکیم نیّر واسطی، محمد اسد خاں ملتانی، قابلِ ذکر ہیں۔ جن کی ادبی اور سیاسی نظمیں زمیندار کے لیے ممد رہیں اور خود ایسے لوگوں کے کلام کی اشاعت اور اس کی مقبولیت کی ضمانت خود زمیندار کا نام رہا۔ مولانا ظفر علی خاں کی نظم نگاری کے نئے انداز میں لوگوں کو پورے طور سے اس نئے اندازِ فکر کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور وہ اسی انداز میں اپنا کلام پیش کرتے رہے۔ مثلاً حکیم نیّر واسطی کے چند شعر:

(۱) میں اب کہاں وہ دینِ الٰہی کے پاسباں — روشن تھا جن کا دل غمِ اُمت کے داغ سے
خم خانۂ حجاز کے مے خوار اب کہاں — پیتے تھے جو لہو کبھی دل کے ایاغ سے
جو ہو سکا نہ توپ سے، شیطاں نے کر دیا — ان شورہ پست مولویوں کے دماغ سے
تاراج کر کے گلشنِ دیں کو یہ بدنصیب — بیٹھے ہوئے ہیں نظر آئے فراغ سے

(۲) از مولوی الف دین وکیل ڈسکا

غمِ آزادیٔ ہندوستاں یارب عطا کر دے — یہ گنجِ شائیگاں دے دے غنی الاغنیا کر دے
یہ مسلم ہے، وہ ہے ہندو، مزاجب ہے کہ دونوں کو — دو قالب ایک جاں حُبِّ وطن حبِّ خدا کر دے

مضامین:

مضامین میں حسبِ ذیل مضامین نگار اور ان کے مضامین قابلِ ذکر ہیں:

"زمیندار اور وابیت" از مولانا اللہ دتہ۔ ایک شاعر بادشاہ سلطان علاء الدین جہاں سوز۔ ایشیا کی تاریخ کا ایک تابناک صفحہ۔ احمد شاہ ابدالی کے کارنامے۔ جرنیل نادر خاں، اور دعوتِ لامرکزیت از مولانا نور الحق۔ خطبۂ صدارت جمعیتِ اشاعتِ اسلام، آسام از مولانا سید غلام بھیک نیرنگ۔ فخر الدین ابراہیم عراقی۔ تاتاری عہد کا ایک صوفی شاعر۔

سارد ابل کی حقیقت۔ رزم گاہ طرابلس میں عربی فصاحت کے جوہر، از مولانا محمد فضل قدیر ظفر ندوی، باشندگانِ ہند کی ذہنیت اور ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات از پنڈت جواہر لال نہرو۔ کرنل لارنس کے سوانح حیات کا ایک باب۔ عہدِ تیموری کا مشہور ظریف شاعر۔ روس اور افغانستان از "ٹائمز آف انڈیا ۱۹۲۹ء" آج سے سو سال کے بعد کیا ہوگا۔ علومِ جدیدہ کے حیرت زدہ کرشمے۔ اہلِ جرمنی کو اصنام پرستی کی دعوت اور مسیحیت کا جنازہ تہذیب مغربیت کے کندھے پر۔ عنایت اللہ خاں کے سوانح حیات (از سول اینڈ ملٹری گزٹ)۔ مصر میں برطانوی استعمار کے کرشمے۔

یہ وہ چند علمی اور ادبی اور سیاسی مضامین میں سے چند عنوانات ہیں جن سے پورے طور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زمیندار نے اپنے ناظرین کے سیاسی و علمی ذوق کو جلا بخشنے کے لیے نئے نئے مضامین اور پُر از معلومات مقالوں سے فارسی اور عربی کے ممتاز شعرا کے واقعات اور تاریخ ادب سے پورے طور سے مضامین لے کر مسلسل شائع کیے۔ ان میں سے بعض مضامین خود مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بھی نکلے۔

مولانا ظفر علی خاں کے اہم مضامین میں حسب ذیل مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ (۱) خسرو پرویز کے عروج و زوال کی داستان۔ (۲) عرب طبیعت کے فطری جوہر۔

خبریں اور ان پر تبصرہ:

۱۹۲۹ء میں افغانستان کے انقلاب، امان اللہ خاں کی تخت سے دست برداری اور بچہ سقہ کی بغاوت پر اور جنرل نادر خاں کی آمد پر مشتمل خبریں زور و شور سے اور دو دو کالمی جلی قلم سے شائع ہوتی رہیں۔ اس طرح زمیندار کی پوری دلچسپی افغانستان کے حالات کی درستگی کی طرف رہی اور خود مولانا ظفر علی خاں نے افغانستان ریلیف فنڈ کھول کر افغانوں کی مدد کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد امان اللہ خاں دوبارہ تخت پر بیٹھ جائیں، تاکہ ایک ہمسایہ اسلامی ملک کو استقلال نصیب ہو۔ اس لیے انھوں نے افغانستان کے مسائل پر اپنے قلم سے خصوصی اداریے بھی لکھے اور جنرل نادر خاں سے مل کر ان پر زور دیا کہ چوں کہ ان کو امان اللہ خاں نے خاص طور سے تار دے کر بلایا ہے اس لیے وہ امان اللہ خاں کو دوبارہ کامیاب کرنے کے لیے اپنی پوری ہمت صرف کر دیں۔ اور جب انھوں نے یہ حالات دیکھے کہ جنرل نادر خاں کچھ اپنے لیے یہ راستہ ہموار کر رہے ہیں تو انھوں نے ۱۲ر مارچ ۱۹۲۹ء کو اور اس سے قبل کم سے کم مسلسل تین اشاعتوں میں جنرل نادر خاں کے عزائم پر "چند کھری کھری باتیں" کے عنوان سے مسلسل اداریے لکھے اور یہ امر بھی ہمدرد دہلی اور زمیندار لاہور میں پوری مناقشت کا

سبب بن گیا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا ظفر علی خاں نے اپنے قلم سے ایک پُر زور اداریہ "خالصہ جی کا نفیر عام اور فرزندانِ اسلام کو دریائے خون میں شناوری کی دعوت" کے عنوان سے لکھا۔ یہ اداریہ اخبار "اکالی" کے اس افتتاحیہ کا پُر زور جواب ہے کہ جس کا لب و لہجہ اشتعال انگیز تھا۔ اور بقول مولانا اس قدر اشتعال انگیز تھا اور اس کی عبارت کا ایک ایک فقرہ زہرِ عناد میں اس قدر آلودہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے، جن کی طرف ان کا روئے سخن ہے اگر وہ اپنی یثربی فطرت کے سیزدہ صد سالہ جوہر بالکل ہی نہیں کھو چکے تو اس کا خاموشی سے برداشت کر لینا قطعاً ناممکن ہے۔ مسلمانوں کی غیرت کا یہ امتحان اگر کسی غیر ذمہ دار فرد یا مجموعۂ افراد کی طرف سے ہوتا تو اسے جوشِ از خود رفتگی کا غیر مآل اندیشانہ مظاہرہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر "اکالی" پنجاب کے سکھوں کی آواز ہے۔ ان کے صحیح جذبات کی ترجمانی کا مدعی ہے۔ اس نے جو خوفناک ایلٹی میٹم مسلمانوں کی کسی ایک جماعت کو نہیں بلکہ مسلمانانِ پنجاب اور تمام مسلمانانِ ہند کو دیا ہے۔ وہ ایک سوچی ہوئی حکمتِ عملی کا بے جگرانہ نتیجہ ہے۔

"اکالی" کہتا ہے کہ "پنجاب میں سکھوں کی ہستی ہی اسلامی راج کی تباہی پر قائم ہے۔ اگر سکھ ہیں تو یہ راج نہ ہوگا۔ اور اگر یہ راج قائم ہو گیا تو سکھ دنیا میں موجود نہ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کو للکارتا ہے کہ اگر تم پنجاب میں اپنا راج قائم کرنا چاہتے ہو تو تمھیں اوّل خالصہ جی کے خون کی ندیوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ اور اگر یہ امتحانِ خونی مقصود ہو تو میدان میں آؤ اور دیکھو کہ کیا ہوتا ہے" مسلمانوں کے لیے یہ دشمنی نئی نہیں ہے۔ وہ تیرہ سو (۱۳۰۰) سال سے خون اور آگ کے ساتھ کھیلتے چلے آئے ہیں۔ اور اُندلس سے لے کر چین تک انھوں نے مشرق و مغرب کو اپنی خوں آشام تلواروں کی برقی تڑپ کا تماشا دکھایا ہے۔ وہ آج تک ہزاروں خون کی ندیوں میں سلامتی کے ساتھ تیر کر دوسرے کنارے تک پہنچنے کا کرتب دنیا والوں کو دکھا چکے ہیں۔ اس لیے ان آزمائی ہوئی ارغوانی موجوں میں انھیں صلائے شناوری دینا تحصیلِ حاصل ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ جس چیز کو اکالی اسلامی راج کہتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس راج کا مفہوم کچھ اور نہیں کہ جس طرح آزاد ہندوستان کے آئندہ دستورِ اساسی کے تحت ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہر قوم کی نمائندگی اس کی آبادی کے پیدائشی تناسب سے ہو۔ اسی طرح پنجاب میں بھی، یہ فطری حق بحصۂ رسد مل جائے اور آنے والی کونسلوں میں ان کا عنصر آبادی کے لحاظ سے ہو۔ اس فطری حق کو نہرو رپورٹ نے "حقِ رائے دہندگی کا ہمہ گیر اصول" کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب رائے کا معیار کرپان یا لٹھ یا روپیہ نہ ہوگا بلکہ صرف بلوغ ہوگا تو مسلمان، جنھیں قدرت نے غیر معمولی

فیاضی سے کام لے کر پنجاب کے امتحانِ پیدائش میں سو میں سے چھپن نمبر دیے ہیں۔ کونسلوں کے اندر بھی خود بخود اسی تعداد کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ اگر یہ اسلامی راج ہے تو پھر اکالی، پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے رفیقوں کو پیغامِ جنگ دے جنھوں نے لکھنؤ میں اس راج کی بنیادیں قائم کر دیں، یا نیشنل کانگریس کو موجِ خون میں ڈبو دینے کی دھمکیاں دے کہ جس نے پنڈت جی اور ان کے ساتھیوں کے لکھنوی فیصلے پر کلکتہ میں مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ غریب مسلمانوں پر اکالی کا صاعقۂ غضب کیوں گر رہا ہے۔ جن کا قصور بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان کا شمار پنجاب میں ۲۵ لاکھ نہیں بلکہ سوا کروڑ ہے۔ مجھے 'اکالی' کے احساسِ خودداری کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور میں سچے دل سے اس مقدس جذبے کی قدر کرتا ہوں کہ سکھ پنجاب میں اپنی ہستی کو محسوس کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ لیکن اس تفوق کی نمائش کی بدنصیب ہندوستان میں ایک شکل رہ گئی ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو کرپان کی مہیب دھمکیوں کے بل پر ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے۔ کیا 'اکالی' اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی خونی کتاب کا ایک ورق پھاڑ کر بہار اور آگرہ، اودھ اور بمبئی اور مدراس کے مسلمان یہ ڈانٹ بتانے میں لگ جائیں کہ اگر ان صوبوں میں ہندوؤں کا راج قائم ہو گیا تو ہم اپنی تلواریں ان کے جگر میں پیرا دیں گے۔ کیا 'اکالی' کے نزدیک اخلاق و احسان اور انصاف سے کوئی قلیل تعداد قوم اپنی برتری اکثریت سے نہیں منوا سکتی۔ معاصر ممدوح از برائے خدا یہ غور کرے کہ جو رویہ اس نے مسلمانوں اور لگے ہاتھوں ہندوؤں کے خلاف اختیار کیا اور سکھوں کی قوم نیشنل کانگرس کے مسلّمات کی جس طریقے سے خلاف ورزی کر رہی ہے، اس میں کیسے کیسے مہیب فتنے چھپے ہوئے ہیں۔"

۶ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو "مسلمانوں کا افتراق و تشتت" کے عنوان پر دو کالمی طویل اداریہ لکھا گیا۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں کی دونوں جماعتوں کو حقوقِ ملّی کی حفاظت کے لیے اور استخلاصِ وطن کے مقصد پر جمع ہو جانا چاہیے تاکہ وہ قوتیں جو ایک دوسرے کے تخریب پر صرف ہو رہی ہیں، وہ تعمیر کے لیے کارآمد ہو سکیں۔ اسی طرح ۳ر نومبر ۱۹۲۹ء کو "مسلم آؤٹ لک" کے مقالۂ افتتاحیہ پر، کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی ہے۔ زمیندار نے لکھا کہ یہ کانفرنس ان سرفروشوں کی قیادت اور رفاقت کی محتاج ہے جو ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر حریتِ طلبی کی منازل کو طے کر سکیں۔

اداریے۔ ۱۹۳۱ء

(۱) ۲۵ر جون ۱۹۳۱ء۔ "زعمائے ملّت کے گفت و شنید کا انقطاع اور مفاہمت کی توقعات کا افسوس ناک انجام۔"

اُس وقت مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم اختلافی مسئلہ طریقۂ نیابت تھا۔ مولانا شوکت علی، سر شفیع اور ان کے دوسرے ہم خیال اصحاب انتخابِ جداگانہ کی حمایت میں تھے، اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں تھی جو مخلوط انتخاب کی ترویج کو قومیتِ متحدہ کے قیام کا بہترین ذریعہ اور استخلاصِ وطن کا موثر ترین حربہ خیال کرتے تھے۔ اس اداریے میں مسلمانوں کی ان دونوں جماعتوں کی گفت و شنید اور مذاکرات کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس میں ان کوششوں کا ذکر ہے جو ہز ہائی نس والیٔ بھوپال نے ایک روشن ضمیر فرماں روا ہونے کے ساتھ ملت کا درد رکھنے کے باعث دونوں فریقوں کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ اور آخر کار یہ کانفرنس دو مرتبہ بھوپال میں ہو کر ناکام ہو گئی۔ اس طرح سے اس اداریے میں یہ واضح کیا گیا کہ جب تک کوئی ایک جماعت دوسری جماعت سے ملنے کے لیے چند قدم آگے نہیں بڑھتی، مذاکرہ قطعاً بے سود رہتا ہے۔

چوں کہ اس کانفرنس کی دوسری نشست شملے میں ہوئی تھی اور اس سلسلے میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر زمیندار نے لکھا تھا کہ پرمانندی ذہنیت ہندوؤں کی چیرہ دستی، اور ان کی چیرہ دستی پر اتحاد اتحاد کے نعرے لگانے والے کانگرسیوں کی خاموشی سے پنجاب کے قافلہ سالار بھی اب یہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثریت مسلمانوں کے جائز حق سے تلعب کرنے پر اتر آئی ہے اور وہ ان جماعتوں کی پیٹھ ٹھونکنے کو اپنا محبوب ترین اور مقدس ترین فرض سمجھنے لگی ہے۔ جو مسلمانوں کے واجبی مطالبات کے استخفاف کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ذاتی عقیدہ یہی ہے کہ انتخابِ مخلوط کو رواج دیے بغیر نہ تو مسلمانوں میں صحیح سیاسی بیداری پیدا ہو سکتی ہے نہ قومیتِ متحدہ کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے لیکن جب دوسری جماعتوں کے نزدیک قومیتِ متحدہ کے یہ معنی ہوں کہ وہ سب مل کر مسلمان کو اس کے حقوق سے محروم کر دیں اور جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں بھی اسے حقوقِ اکثریت سے محروم کر دیں تو ہم اپنے میں یہ کہنے کی جرأت نہیں پاتے کہ ان خطرات کو مسلمان نظر انداز کر کے محض حریت پروری کا ثبوت دینے کے لیے اس راہ پر گامزن رہے۔"

(۲) اداریہ ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء

"مہاتما گاندھی کی فہرستِ الزامات کا جواب"

اس اداریہ میں مہاتما گاندھی اور لارڈ اروِن کے مابین ۱۹۳۱ء میں معاہدۂ مفاہمت ہوا تھا اور اس تکمیل کے بعد کانگرس میں تحریکِ عصیان مدنی یک قلم ترک کر دی تھی لیکن حکومت نے فراہمیٔ مالیہ کے سلسلے میں اکثر و بیشتر مقامات پر نہایت سختی سے کام

لیا اور جن قصبات میں، جہاں کے باشندوں نے تحریک میں زیادہ سرگرمی سے حِصّہ لیا تھا تعزیری پولیس کی چوکیاں بٹھا دیں اور بعض وظیفہ یاب اشخاص کے وظائف بند کر دیے۔ اور بعض وہ طلبا جنھوں نے اپنی قابلیت سے مقابلے کے امتحان میں شرکت کر کے وظائف حاصل کیے تھے ان کے وظائف بند کر دیے گئے۔ سرحد میں مظالم شروع ہو گئے اور یُوپی سے خواتین کی ہتکِ حرمت کی خبریں آئیں تو مہاتما گاندھی نے ایک غیر جانب دار کمیشن کے ذریعے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ جس کو گورنمنٹ نے قبول نہیں کیا اور مہاتما گاندھی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے جواب میں حکومت نے مہاتما گاندھی کی فہرستِ الزامات کا جواب دیا۔ اس طرح زمیندار نے دوبارہ اپنے اس اداریے میں اِس امر پر اصرار کیا کہ اگر حکومت کو یقین ہے کہ الزامات کے جواب میں جو کچھ اُس نے کہا ہے، وہ دُرست ہے تو غیر جانب دار کمیشن مقرر کرنے میں آخر کیا حرج ہے؟

(۳) ۱۵ر نومبر ۱۹۳۱ء

"حکومت سے دو دو باتیں"

اس اداریہ میں مسئلہ کشمیر کے اس اہم موضوع کے متعلق گفتگو کی گئی ہے کہ جب احرار کے سرفروش جیلوں میں جانے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ زمیندار نے لکھا کہ دُنیا سمجھ سکتی ہے کہ جب ملّتِ اسلامیہ اس جذبے سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں نکلی ہے تو اس استبداد کی قوتیں ہمیشہ غائب و خاسر ہو گئیں اور حکومت اس غلط خیال میں مبتلا نہ ہو کہ اس کے پاس عقاب پرور طیاروں اور اژدرم توپوں کی فراوانی ہے اور جو دولتِ بہیہ برطانیہ کے حِصّہ میں آئی ہے اس کے عزائم پر چند ہزار شوریدہ سر غوغائیوں کی غوغا آرائیوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پرستاروں کے مشورے اس جذبے کو دبانے میں جو مسلمانوں کے سینے میں پرورش پا رہا ہے، اسی طرح ناکام رہیں گے جس طرح اس کے اعضا و ارکان کا جبر و استبداد ناکام رہا۔ بلکہ آگے چل کر مسلمانوں کا یہی ابھرتا ہوا جذبہ اس قفل کی کلید ہو گا جس کی کشاکش سے مایوس ہو کر گاندھی جی بھی صوبہ وار آزادی کا فارمولا پیش کرنے اور قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

تبصرہ:

ستمبر اور اکتوبر کا مہینہ مسلمانانِ پنجاب کے لیے ایک آزمائش کا زمانہ تھا۔ ستمبر میں مغل پورہ کالج پر پکٹنگ ہوئی۔ مولانا احمد، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری

کی گرفتاری، پُرامن مستعفی طلبا اور ہجوم پر پولیس کی لاٹھیوں کی بارش۔ زمیندار نے اس سلسلے میں خصوصی نمبر شائع کیے۔ مولانا ظفر علی خاں لاہور سے باہر تھے اور ۱۲ ستمبر ہی کو واپس آئے تھے۔ انھوں نے اور ان کے اخبار نے اس تحریک میں مسلمانوں کے حق کی حفاظت کے لیے جرأت مندانہ مظاہروں سے کام لیا۔ (اس ہنگامے کی تفصیل ہم مولانا کی سیاسی زندگی کے تحت بیان کر چکے ہیں) مسلمان کامیاب ہوئے اور اس تحریک کے ختم ہوتے ہی تحریکِ کشمیر زوروں سے چل پڑی اور ہزاروں مسلمانوں نے اپنے آپ کو طوق و زنجیر پہن کر مصیبتوں کے حوالے کر دیا۔ زمیندار نے ان تمام واقعات پر مسلسل اسی طرح کے اداریے لکھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر زمیندار پر صبح سے لے کر ڈیڑھ بجے دن تک پولیس کا قبضہ رہا۔ اور پولیس قاضی احسان اللہ اور عبدالباقی صاحب سے مسلسل سوالات دریافت کرتی رہی اور تین گھنٹے تک مسلسل تلاشی لی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ سب انسپکٹر نے اس بات پر اصرار کیا کہ مولانا ظفر علی خاں کے زنانے مکان کی بھی تلاشی لی جائے۔ زمیندار نے اس سلسلے میں یہ لکھا کہ حیرت ہے کہ آخر زمیندار کی یہ تلاشی کیوں ہوئی۔ بہرحال زمیندار کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ آغازِ کار سے حکومت کے لیے زمیندار ایک خطرۂ عظیم اور شگون بد سمجھا جاتا ہے۔ وہ اعلانیہ کہتا ہے کہ اس سے پہلے بیسیوں بار زمیندار کی تلاشی ہوئی لیکن کچھ بھی نہ نکلا۔ آج بھی زمیندار کا دفتر تلاشیوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔" (۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء)

جس طرح یہ سال دہشتوں کا سال تھا (گورنر پنجاب پر یونی ورسٹی ہال میں حملہ ہوا، میاں میر میں برطانوی فوجی افسر کی میم کا بے دردانہ قتل ہوا) اسی طرح زمیندار پر گرفتاری، تلاشی اور ضبطیٔ ضمانت کے نادر شاہی وار ہوئے۔ زمیندار نے اپریل میں جو اداریے افغانستان اور امان اللہ خاں غازی کے متعلق لکھے تھے ان پر یہ گرفتاری اور ضبطیٔ ضمانت کی سزا عمل میں آئی۔

۱۹۳۲ء

۱۹۳۱ء میں تحریکِ کشمیر شروع ہو چکی تھی اور ہزاروں مسلمان گرفتار ہو چکے تھے۔ مجلسِ احرار کے رضا کاروں نے اس سلسلے میں بہت قربانیاں دی تھیں۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں ۲ فروری ۱۹۳۲ء کو زمیندار نے "مسلمانانِ کشمیر پر بے پناہ مصائب کا ہجوم" کے عنوان سے ایک زوردار اداریہ لکھا جس کی ابتدا اس شعر سے کی گئی تھی:

این ظلم دیگر است کہ آں تیغ آب دار
فرصت نمی دہد کہ شکایت کند کسے

دوسرا اہم اداریہ ۶ اگست ۱۹۳۲ء کو مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے نکلا۔ تیسرا اداریہ

۱۸ر اگست ۱۹۳۲ء کو امنی کے قلم سے " وقت کا راگ " کے عنوان سے نکلا جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں :

برطانیہ سے مانگ نہ ہندو سبھا سے مانگ
جو مانگنا ہے تجھ کو، وہ اپنے خدا سے مانگ
گر توڑنا ہے ناٹلہ و لات کا طلسم
یہ توڑ خواجۂ دوسرا کے عصا سے مانگ
جب تک نہ سربلند ہو اِسلام زندہ رہ
اِس زندگی کے واسطے مہلت قضا سے مانگ

اُردو صحافت میں یہ خصوصیت صرف زمیندار ہی کو حاصِل رہی کہ اس کے اداریوں میں کئی مرتبہ بجائے نثر کے مولانا ظفر علی خاں کے تازہ اشعار زیبِ قرطاس ہوتے رہے۔

چوتھا اداریہ بھی مولانا ہی کے قلم سے " دَرد کی دَوا - الیس اللہ بکاف عبدہٗ " کے عنوان سے نکلا۔ یہ اہم ترین اداریہ تھا جس میں نیشنل کانگریس کی پالیسی پر جامع تنقید و تبصرہ کیا گیا تھا۔

پانچواں اداریہ " بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان " کے عنوان سے نکلا۔ جس میں مسلمانوں کے ساتھ آئینی اکثریت کے باوجود ناانصافیوں کے خلاف ایک پُر زور اظہار کیا گیا تھا۔

چھٹا اداریہ " ہندوستان " کے عنوان سے امنی کے قلم سے نکلا۔

ساتواں اداریہ " بڈھلاڈہ کا حادثۂ خونیں اور مقامی حکّام و حکومتِ پنجاب کی پُراسرار خاموشی " کے عنوان سے تھا۔

حِصّۂ نظم :

مارچ ۱۹۳۲ء - عنوان " پیامِ صبا " از مولانا ظفر علی خاں - چند شعر درجِ ذیل ہیں :

ہے تاج کی خواہش نہ تمنّا ہے نگیں کی — اِسلام کا مقصد بخدا اور ہی کچھ ہے
مغرب میں بھی اچھّوں کو بُرا کہتے ہیں لیکن — اِس جرم کی مشرق میں سزا اور ہی کچھ ہے
مانا کہ ہیں ٹیگور کے اشعار دِل آویز — اِقبال کے نغموں میں مزا اور ہی کچھ ہے
توحید کے پرچم کو جھکانے وہ چلے ہیں — پر فیصلۂ کلکِ قضا اور ہی کچھ ہے

(۲) خونِ جگر کی چند بوندیں

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھُول — تڑپی ہے تجھ پہ نعش جگر گوشۂ بتولؑ

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی　　آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر　　لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

۱۷ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو "نظام کا فیضِ عام" کے عنوان سے ایک طویل نظم نکلی۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۲ء ویر بھارت اخبار کے لیے چراغاں پر ارتجالاً تین شعر کہے گئے جو درجِ ذیل ہیں :

نکلنے کو ہے استعمار کا کچھ دن میں دیوالہ　　یہ مژدہ لے کے اندر سے آئی ہے دیوالی
لگا کر آج آزادی کی پھلواری سے لایا ہوں　　میں شیخ و برہمن کے واسطے اخلاق کی ڈالی
حقیقت کوئی مجھ سے پوچھ لے رجعت پسندوں کی　　یہ حبس تھالی کے بیگن ہیں وہ ہے انگریز کی تھالی

مضامین : (اراکین ادارہ اور مولانا کے قلم سے)

قادیانیت اور دوسرے حضرات کے متعلق مختلف مضامین اراکین ادارہ اور مولانا کے قلم سے نکلتے رہے۔ مثلاً ایک مضمون بشکل انٹرویو سر اقبال مرحوم کا شائع ہوا۔ کہ شمالی ہند کی صحافت ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور اس کی اصلاح کے متعلق کیا تدابیر کرنی چاہئیں۔

(۲) سر ذوالفقار علی خاں کا معرکۃ الآرا بیان اعلانِ حقوق کے اضطراب افزا عواقب و نتائج (انتشار و افتراق و خانہ جنگی اور جدال و قتال)

(۳) مختلف اخبارات (ملاپ، پرتاپ، انقلاب، الجمعیت) کے تراشوں پر تبصرے کیے۔ سکھ مسلمانوں کی آبادی اکثریت کو ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ ہندو اخبارات ان کی مسلسل تائید کر رہے ہیں اور زمیندار نے ان تمام تراشوں پر یہ کہہ کر تبصرہ کیا کہ بقول "انقلاب" سکھ پنجاب میں فرقہ وارانہ راج برداشت نہیں کریں گے۔ تو سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ہندوؤں کا راج کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی اکثریت پنجاب کے ہندوؤں کے لیے زہر ہے تو کیا مدراس، یوپی، بمبئی، اڑیسہ اور سی پی، کے مسلمانوں کے لیے ہندو اکثریتیں زہر نہیں ہیں۔ سکھ کہتے ہیں کہ وہ جمہوری حکومت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ حالاں کہ پنجاب میں وہ ہی حکومت جمہوری ہوگی جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ اس طرح مسلمانوں کی اکثریت کو زائل کرنا ناممکن ہے۔ یہ تقدیر کے خلاف جنگ ہے جس میں ہندو سکھ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

(۴) فکاہات میں حسب دستور نقاش کے قلم سے "باپ اور بیٹا" کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا نظم شائع ہوئی جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں :

معنیِ لیس کمثلہ آپ ہیں　　یعنی آپ اللہ میاں کے باپ ہیں

عرش کو جس نے کیا ہے بے سپر — آپ اس گھوڑے کی برقی ٹاپ ہیں
جو سبق دیتا ہے ابلیسِ لعین — سو سیو محمود دیتے چھاپ ہیں
ابتلاء کی انگیٹھی گرم ہے — آگ اس کی آپ لیتے تاپ ہیں
قادیاں ہے چشمۂ آبِ حمیم — باپ پانی تھے تو بیٹے بھاپ ہیں
دیکھیے کب ان سے ملتی ہے نجات — اور کب کٹتے ہمارے پاپ ہیں

اسی طرح ایک اور نظم قصرِ آزادی کی بنیاد، نقشِ تہذیبِ یہود اور خالصہ جی ۲۵مہ ۲، اگست کو صفحۂ اوّل پر نکلی۔

منتخب اداریے:

ذیل میں ہم ان اہم اداریوں میں سے ۶، اگست ۱۹۳۲ء کا ایک اہم اداریہ جو ان کے اپنے قلم سے ہے، درج کرتے ہیں:

"اگر کرشن کی تعلیم عام ہو جائے
تو کام فتنہ گروں کا تمام ہو جائے

میں اپنے اس عقیدہ کا طول و عرض ہند میں رہ رہ کر اعلان کر چکا ہوں کہ باوجود ایک کٹر مسلمان ہونے کے میں سری کرشن کا صدقِ دل سے ادب کرتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے میرے مذہب نے یہی تعلیم دی ہے۔ ہندوستانِ قدیم کے اس مقدس بزرگ کو ان بڑے بڑے انسانوں کے زمرہ میں شمار کرتا ہوں جنھیں خدائے عزّ و جل کی حکمت اپنے بندوں کی روحانی راہ نمائی کے لیے ہر زمانے میں منتخب کرتی رہتی ہے۔

مذہب کی اصطلاح میں ان ہادیانِ زمانہ کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے اور ہندو اپنی اصطلاح میں انھیں رشی اور اوتار کہتے ہیں۔ سری کرشن کی تعلیم سے مجھے بقول حضرت جانِ جاناں بوئے نبوت آتی ہے۔ اگرچہ یہ نبوت اس زمانے کی نا ترقی یافتہ حالات کے لحاظ سے جس میں سری کرشن کا ظہور ہوا، اپنے عہدِ طفولیت میں تھی اور اسے ریعانِ بلوغ و منتہائے شباب کی منازل طے کرنے کے لیے ہنوز کئی ہزار سال کی منازل طے کرنی تھیں۔ پچھلے دنوں ایک ہندو نوجوان نے حضور ص کی شان میں ایک لطیف نظم لکھی جو مہاشہ کرشن مدیر پرتاپ پر اس بنا پر گراں گزری کہ مسٹر امر چند نے ہندو ہو کر عرب کے عالی مقام پیغمبر ص کو پیغمبر کیوں تسلیم کر لیا۔ اور غریب امر چند کی خوب ہی گت بنائی۔ اس سلسلے میں مہاشہ کرشن، جن کے ساتھ میرے ۲۵ سال کے دوستانہ تعلقات اور برادرانہ مراسم چلے آتے ہیں، اس دیرینہ رسم و راہ کے تمام مقتضیات کی طرف سے آنکھیں پھیر کر بلا بات مجھ غریب پر بھی برسے۔ میرے قلم میں خدائے بزرگ و برتر

کے فضل سے اتنی قدرت ہے کہ مَیں ان کے ناروا الزامات کا جواب ایسے سخت الفاظ میں دُوں کہ مہاشہ کرشن اور ان کی آئندہ نسلیں قیامت تک ان کی سختی محسُوس کرتی رہیں۔ مَیں اُس پیغمبرِ عالی مقام ؐ کا دامن گرفتہ ہوں جو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اس لیے مَیں مہاشہ کرشن کے اس گناہِ عظیم کو بنظرِ اغماض دیکھتا ہُوا بارگاہِ ربّ العالمین میں دست بدُعا ہوں کہ وہ ان سے اپنے نیازمندوں کے باب میں اس قسم کی بے بنیاد بدگمانیوں کی توفیق ہمیشہ کے لیے چھین لے۔"

(۲) اداریہ نمبر۲ - "درد کی دوا۔ الیس اللہ بکافٍ عبدہ"۔ ۲۷ر اگست ۱۹۳۲ء۔

ظفر علی خاں کے قلم سے۔

زمیندار کے افتتاحیہ دیروزہ میں وقت کا یہ سب سے بڑا سوال پیش کیا گیا تھا کہ ایسی حالت میں جب کہ وطن دشمن سِکھوں اور ہندوؤں کی ہِلی بھگت اس پشتینی عناد کی بنا پر جو انھیں اِسلام سے ہے۔ سیاسیات کے ہر شعبہ میں مُسلمانوں کے خفیف سے خفیف تفوق کو گوارا نہ کرنے کی قسم کھا چکی ہے۔ جو فرزندانِ توحید کو کبھی کبھی مل جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فرزندانِ توحید کو کیا کرنا چاہیے۔ سوال مشکل ہے اور جواب اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ لیکن کوئی مشکل ایسی نہیں ہے جسے قوم حل نہ کر سکے جس کا پہلا بھروسہ ربِّ کعبہ کے متناہی فضل وکرم پر ہے اور دوسرا اور آخری بھروسہ اپنے مرتضوی بازوؤں کی باطل افگن توانائی پر۔

پنجاب ہندوستان کے قفلِ وسواس کی کلید ہے کہ یہ کنجی اگر ہاتھ آجائے تو اس تالے کا کھول لینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ اس وقت تک کلید برداری کا خانہ ساز منصب مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے بادلِ نخواستہ خود اپنے لیے تجویز کر رکھا ہے۔ لیکن وہ یقین مانیں کہ پنجاب کا مُسلمان بحول اللہ وقوتہٖ اس منصب سے آپ کو بہت جلد سبک دوش کر دے گا۔ اور جو عقدۂ دشوار آپ کے ناخنِ تدبیر کا شرمندۂ احسان نہ ہو سکا۔ وہ مسلمان کی فراستِ ایمانی اور بے لاگ انصاف کی دوگونہ قوت کے بل پر دیکھتے دیکھتے آسان ہو جائے گا۔

نیشنل کانگرس ہندوستان کو مغربی ملوکیت کی آہنی گرفت سے چھڑانے کا عزم لے کر اٹھی ہے اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لیے مسلمان اپنے خون کا آخری قطرہ تک گرانے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کچلو کے مُنہ سے کانگریس کا یہ فیصلہ سُن کر کہ ہندوستان کے کسی نظم ونسق میں، جو کانگریس کا مرتب کیا ہوا ہو، مسلمان کو اس حیثیت سے کہ وہ مسلمان ہے، دخیل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ مسلمان اس حقیقتِ کبریٰ کے اعلان پر مجبور ہے کہ کانگریس بھی اس کے درد کی دوا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے درد کی دوا آپ ہے۔ وہ اپنے ہی درد کی بلکہ

سارے ہندوستان کے دردِ لادوا کی دوا ہے اور مسلمانوں کا نصب العین اس قدر بلند ہے کہ کانگریس کے طائرِ وہم کی بھی وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔

نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ آواز رہ رہ کر بلند ہوتی ہے کہ ہندوستان کو کوئی ایسا نظامِ حکومت منظور نہیں ہوگا جو خداوندِ فرنگ اس کی مرضی کے خلاف ترتیب دیں۔ اس آواز کو بلند کرنے والی وہ ہندو دُنیا ہے جس کے بہترین دل و دماغ اس وقت جیلوں میں بند ہیں۔ اور اس کو تقویت پہنچانے والے وہ ہزارہا فرزندانِ توحید بھی ہیں جو بلا امیدِ صلہ و بلا توقعِ مُزد محض آزادی کے یثربی جذبہ سے سرشار ہو کر خوشی خوشی جیلوں میں چلے گئے۔ یہ آواز بے اثر نہ جائے گی اور زُود و دیر انگریزوں کو اس آواز کو بلند کرنے والوں کے ساتھ کوئی با آبرو مفاہمت کرنی پڑے گی۔ مسلمان کے ساتھ ہندو کے تصفیے کی وہ آخری فیصلہ کن ساعت ہوگی جب ہندو سے پوچھا جائے گا کہ آیا مسلمان اپنے اسلام کے ساتھ، اپنی یثربی تہذیب کے ساتھ اپنے حجازی امیال و عواطف کے ساتھ آزاد ہندوستان کے نظم و نسق میں ایک مستقل اور غیر متغیر اور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو پھر ہندو دیکھ لے گا کہ خدا کی تقدیر کے بدلنے والوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب تک وہ ساعتِ موعود نہ آئے، مسلمان یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا کہ ریمزے میکڈانلڈ اور تارا سنگھ اور سوہن لال اس کی طبعِ غیرت کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگ جائیں جو چوگان گیند کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

مسلمان جو پنجاب کی آبادی کا جزوِ غالب ہے اس کشور کے نظم و نسق میں مرِ دست اپنا پیدائشی حق دو طرح سے ہی قائم رکھ سکتا ہے۔ یا تو دس سال تک جداگانہ طریقۂ نیابت کے تحت مجلسِ وضعِ آئین و قوانین میں اپنی آبادی کے لحاظ سے یا اس نمائندگی کو مخلوط طریقۂ انتخاب نیابت کے ساتھ حقِ رائے دہندگی بالغان کے تابع کرنے سے۔ شقِ ثانی سے ہندو سکھوں کو بادائے اختلاف نہیں۔ اس لیے کہ اگر اختلاف کریں تو وطن پروری یا قوم پرستی کے سارے دعوے گاؤخورد ہو جاتے ہیں لیکن وہ اس شق کی تائید بھی دل سے نہیں کرتے۔ پس مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں کہ پنجاب مخلوط انتخاب اور حقِ رائے دہندگی بالغان کی برکات سے بہرہ اندوز ہو۔ اب مسلمان کے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ اپنی انتہائی قوت اپنے اس مطالبے کی تکمیل پر صرف کر دے کہ مجالسِ وضعِ آئین و قوانین میں اس کی نمائندگی اس کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے طریقۂ انتخابِ جداگانہ کے ماتحت ہوگی تاکہ اس کی اکثریت ہندو سکھوں اور انگریزوں کی خود غرضیوں، دراندازیوں اور مصلحتوں کے گوناگوں خطرات

سے محفوظ ہو جائے۔

وقت آگیا ہے کہ پنجاب کے سارے مسلمان اپنے اختلافات مٹا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور حکومت انگریزی کو اپنے عزم کا ادب کرنے پر مجبور کر دیں۔ صرف احتجاج کی قرار دیں منظور کرنے سے کام نہ چلے گا اور یہ دل چسپ مشغلہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے عافیت کوش بزرگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے کہ جنھیں اپنا سیاسی تفوق جس سے ہندو مسلم سکھ کے واجبی حقوق کو گزند پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اپنے حق کو تسلیم کرانے کے لیے مسلمانوں کو ہر اس قربانی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے جو زندہ اور خود دار قوموں کو ایسے موقع دینی پڑتی ہے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہا است بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس سال زمیندار نے ماہ رجب ۱۳۵۱ھ کو ایک خصوصی نمبر قادیانیت کے متعلق قادیان نمبر کے نام سے شائع کیا۔ یہ نمبر اپنے علمی مضامین اور فلسفۂ قادیاں پر تبصرے اور قادیانیت کے متعلق مختلف علماء کے علمی مضامین اور مولانا ظفر علی خاں کے ایک معرکۃ الآرا اداریے کے ساتھ نکلا۔ صفحۂ اوّل پر ان کی ایک طویل نظم "قولِ فیصل" کے عنوان سے جلی قلم میں حسبِ دستور شائع ہوئی۔ نظم کے دو شعر یہ ہیں:

اے طبعِ رسا آج ترا رنگ جما دوں
اور شوخیِ تحریر کا اعجاز دکھا دوں

الملت لکم پڑھ کے زبانِ عربی میں
ظلی و بروزی کی نبوت کو مٹا دوں

فکاہات میں "باپ بیٹے" کے عنوان سے نقاش کے قلمی نام سے ان کی وہ نظم بھی چھپی جس کا ذکر ہم سابق میں کر چکے ہیں۔

اس قادیان نمبر کا اداریہ علمی اور ادبی لحاظ سے اہم ترین اداریہ تھا جو مولانا ظفر علی خان کے قلم سے قادیانیت کی تاریخ اور ان کے عقاید کے سلسلے میں مفصل انداز میں نکلا۔ اس اداریے کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"پاپائے قادیان کی شوخ چشمانہ جسارت (ایک آلودہ خطا انسان کو مسندِ اکملیت پر بٹھانے کی کوشش)"۔

ہماری باتیں موسیو بشیر اور ان کے خرد باختہ حلقہ بگوشوں کو کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے اقوال ان کو گراں گزرتے ہیں اور ہمارے ان فرقوں کی تفصیل بار بار گنائی جاتی ہے جو ہمارے دشنۂ استہزا نے قادیانیت کے جگر میں رہ رہ کر لگائے ہیں۔ اور ہم سے استدعا کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں طعن و تعریض بند کریں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ موسیو بشیر

اور ان کی اُمت کثیر الانفار کو تو یہ اختیار دیا جائے کہ اِسلام کا مُنھ چڑائیں، روایاتِ اسلام کا استخفاف کریں، رسُول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کی نقلیں اتاریں حضورِ سرورِ کائنات کے ناموس کو اپنے خاندان کی خواتین کے القاب و آداب کے لیے وجہ محاکات بنائیں۔ لیکن ہم کو یہ اجازت نہ ہو کہ اس بے باکانہ طرزِ عمل پر ایک حرف بھی زبانِ قلم سے نکالیں۔"

مولانا نے آگے چل کر اِس سلسلے میں لکھا کہ آپ (مُراد قادیانی) اس حقیقتِ کبریٰ سے دُور جا پڑے لیکن ہمارے دل کے پاک ترین گوشے اور ہماری آنکھ کے نازک ترین پردے میں اس کا جیتا جاگتا مفہوم ہر وقت موجود ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے بعد محمد مصطفےٰ و احمد مجتبیٰ ص خلاصۂ کائنات و زبدۂ موجودات ہیں جن پر انسان کے لیے حجتِ حق ختم ہو گئی۔ جن کی ذات عدیم المثال ہے اور جن کی صفات فقید النظیر ہیں۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیں، کہ ہمارے دِل کو کِس درجہ تکلیف پہنچتی ہے، ہماری روح کو کس قدر صدمہ پہنچتا ہے، ہمارے جذبات کس حد تک مجروح ہوتے ہیں جب آپ مرزا غلام احمد جیسے آلودۂ خطا و نسیان انسان کو حضور ص جیسے انسانِ کامل کی مسندِ اکملیت پر بٹھا کر اسلام کا مُنھ چڑاتے ہیں اور کہتے ہیں:

(۱) "ہم بغیر کسی فرق کے بلحاظ نبوّت انھیں (مرزا غلام احمد کو) ایسا ہی رسول مانتے ہیں جیسا کہ پہلے رُسول مبعوث ہوتے رہے"۔

(۲) "ہم مانتے ہیں اور صِدق دل سے مانتے ہیں کہ رسُولِ کریم صلّے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت اوّل جیسے کے پانچویں ہزار سال میں ہوئی ایسے ہی چھٹے ہزار سال کے لیے مقدر تھی۔

(۳) حضرت مرزا صاحب کی صداقت کے اس قدر نشانات ظاہر ہوئے کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کر دیے جائیں تب بھی ان کی نبوّت ثابت ہو سکتی ہے۔

(۴) پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ (مرزا غلام احمد) تمام انبیاء کا نمونہ تھے۔

(۵) آپ نے (یعنی مسلمانوں نے) اس کو (مرزا غلام احمد) کو نہیں پہچانا مگر ہم نے تو اسے دیکھنے کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ یقیناً سیّدنا محمدؐ رسُول اللہ کے جمیع کمالاتِ قدسیہ کا جامع ہے اور مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ کا مصداق۔

(۶) جس بات نے حضرت محمد مصطفےٰ ص کو حضرت محمد مصطفےٰ ص بنا دیا، وہی بات اس میں موجود تھی۔

(۷) اس کے اقوال و تصانیف کا ایک ایک لفظ ہمارے لیے تو ایسا ہی حجّت قوی ہے اور قیمتی ہے، جیسا کہ کِسی اور نبی کا۔

(۸) جب ایسے شخص کی بھی تعظیم کی جاتی ہے جو دو چار خادم رکھتا ہو اور کوئی مہذب آدمی اس امر کو پسند نہیں کرتا کہ ایک معمولی وجاہت کے انسان کو بھی بُرا کہے اور اس کی توہین کرے، تو آپ کے لیے یہ کیوں کر جائز ہو گیا کہ اس خدائے برگزیدہ وجاہ و جلال کے نبی عظیم الشان نبی، اور ایک لاکھ چوبیس ہزار کی شان رکھنے والے نبی" انت منی وانا منک ظہوری ظہوری" کے مخاطب نبی کو کھلم کھلا الفاظ میں گالیاں دے۔ (الفضل قادیان ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۷ء)

مولانا نے اس عبارت پر جو کچھ نہایت زور دار اور بلیغ انداز میں تبصرہ کیا وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہے اور اس سے بہتر اور تبصرہ کیا کیا جا سکتا ہے۔

ہز ہائی نیس موسیو بشیر اور ان کے عقیدت کیش یقین مانیں کہ الفضل کے محولۂ فوق اقتباس کے الفاظ پڑھ کر فرطِ غیض و غضب سے ہماری حالت دِگرگوں ہو جاتی ہے۔ اور ہمارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے ان کا منصب چھین کر کسی نا اہل کو دے دینا مُسلّم آزاری کا ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب کی جرأت اس سوا تیرہ سو سال کے عرصے میں قادیان والوں ہی کو ہوئی ہے۔ مسلمان باقی تمام حرکات مذبوحی برداشت کر سکتے ہیں لیکن اس کی تاب نہیں لا سکتے کہ ہر ایرے غیرے کو محمد مصطفےٰ ؐ بنا دیا جائے۔ اگر موسیو بشیر جنھیں اپنے لاکھوں مریدوں کے ایثار و فدویت پر گھمنڈ ہے اور ہم چالیس کروڑ جاں نثارانِ محمدؐ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو بھی کسی قطار میں نہیں سمجھتے اور ہمارے جذبات کی بھی پرواہ نہیں کرتے تو ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:

"می خورد مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ہر چہ خواہی کن ولیکن مسلم آزاری مکن

غضب خدا کا کہ آپ غلام احمد کو محمد مصطفےٰ ؐ بنائے دیتے ہیں۔ جو جو القابات حضور ؐ سرورِ کائنات کے لیے لسانِ شرع میں مخصوص ہو گئے ہیں وہ ان سے چھین کر مرزا غلام احمد کو علیہ الصلوٰۃ والسّلام لکھتے ہیں۔ اور اس بے محابانہ نقالی میں یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ آپ گھر کی ہر بی بی کو ام المومنین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ ذرا آپ اپنے آپ کو 'ہز امپیریل میجسٹی امپیرر آف انڈیا' تو لکھ دیجیے اور اپنی زوجہ محترمہ کے لیے 'ہز امپیریل میجسٹی' کا خطاب تو تجویز کر دیجیے۔ سیاستِ برطانیہ کا آہنی ہاتھ آپ کو کسی سال کوٹھری میں نہ بند کرے تو سہی۔

للہ اس مسخرگی سے باز آیئے اور ہم مسلمانوں کے مقدس ترین جذبات کو سرِ بازار استہزا سے نہ ٹھکرایئے۔ گھر میں جو چاہے آپ کر لیجیے لیکن سرِ بازار اسلام کی عزیز ترین روایات کو

رُسوا نہ کیجیے۔ ہمارا آپ سے کوئی عناد نہیں، کوئی شخصی جھگڑا نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہم مسلمانوں کے عقائد کا استخفاف نہ کریں اور جو روایات ہمیں مدینے سے ملی ہیں، ان کی نقلیں نہ اتاریں۔ ہماری التماس آپ کی خدمت میں صرف اسی قدر ہے۔"

۱۹۳۳ء۔ اداریے :

۲۲ر جنوری ۱۹۳۲ء کا اداریہ۔ از ظفر علی خاں۔

"دعوتِ عمل۔ فلاحِ دارین کی ایک ہی سبیل۔" (نماز اور تجارت)

یہ حقیقت بار بار دہرائی جا چکی ہے اور اب پھر دہرائی جاتی ہے کہ جب تک مسلمانانِ ہند کی اقتصادی حالت درست نہ ہوگی اور وہ خوش حال و فارغ البال نہ ہوں گے۔ ان کا سیاسی وقار جو اس مُلک میں ان کی ہزار سالہ خسروانہ عظمت کا گواہ ہے، بحال نہ ہو سکے گا۔ اسلامی بازار کی تحریک نے بروئے کار آ کر اس حقیقت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے، اور طول و عرضِ کشورِ ہند میں مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس تحریک کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے صاف اور غیر مشتبہ الفاظ میں مان لیا۔ اگر ہمیں عزّت اور آبرُو کی زندگی بسر کرنی ہے تو پہلے ہمیں اپنی مالی حالت سدھارنی ہوگی۔ ان قرضوں سے نجات حاصل کرنی ہوگی جن کے بارِ گراں میں سُود در سُود سے لمحہ بہ لمحہ ایک مہیب اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی صرف ایک یہی شکل ہے کہ تجارت پر جو ہمارا آبائی پیشہ ہے، از سرِ نو ہمارا قبضہ ہو جائے۔

وقت کی سب سے بڑی ضرورت کا احساس دلوں میں پیدا ہونا ملّت کے درخشاں مستقبل کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ پس مَیں تمام اس قوت کے ساتھ جسے میرا خلوص، قلم اور زبان میں پیدا کر سکتا ہے، برادرانِ اسلام سے التجا کرتا ہوں کہ کسبِ معاش کے سلسلے میں وہ تجارت کو دوسرے تمام مشاغل پر ترجیح دیں۔ مُلک کی تجارت میں اپنا جائز اور واجبی حصّہ لیتے ہوئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ سربرآوردہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہر شہر، ہر قریہ اور ہر بستی میں حسبِ ضرورت نئی اسلامی دکانیں کھلوائیں۔ انفرادی یا مشترکہ سرمائے سے آڑھتیں قائم کرائیں۔ تھوک فروشی کے مرکزوں کی رونق قائم رکھنے کے لیے کارخانے خصوصاً پارچہ بافی کے کارخانے جاری کریں۔ اسی طرح عام اسلامی آبادی کا فرض ہے کہ وہ تا بہ حدِ امکان مسلمان تاجروں اور دکان داروں سے اپنی ضروریات خریدے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور مسلمانوں میں تجارت کا شوق پھیلے۔ اس سے میری مُراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ برادرانِ ہند کے ساتھ تجارتی لین دین کا سلسلہ مطلقاً منقطع ہو جائے۔ اس قسم کا مقاطعہ کسی طرح بھی حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان تاجروں کے ساتھ

جن کی حالت اس اقتصادی تباہ حالی کے دَور میں خاص توجہ کی مستحق ہے۔ کم از کم اس وقت تک ترجیحی سلوک کیا جائے کہ مُسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ مَیں نامسلمانوں کے تجارتی مقاطعہ کا سخت مخالف ہوُں۔ صِرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب مسلمان اپنی ضروریاتِ زندگی خریدیں تو روپے میں سے بارہ آنے کا مال لازمی طور سے اپنے برادرانِ دین ہی سے خریدیں"۔

مولانا نے اسی سِلسلے میں آگے چل کر تجارت کے بعد نماز کے سلسلے میں یوں لکھا:

"جہاں دنیوی کامیابی کا بھید تجارت میں چھپا ہوُا ہے جس کی نسبت ہماری مقدس روایات میں آیا ہے کہ من اراد الدنیا فلیتجر۔ وہاں فلاح دینی کا راز نماز میں مضمر ہے۔ جسے خلاصۂ اسلام و غازہ ایمان کہنا چاہیئے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر مسلمان صرف دو کام اختیار کریں۔ یعنی پنج وقتہ نماز خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کر لیا کریں۔ اور تجارت کو کسبِ معاش کا وسیلہ بنا لیں تو آج ان کی دُنیا بھی سُدھر سکتی ہے اور عاقبت بھی سنور سکتی ہے۔ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے اکلِ حلال اور صدقِ مقال کی کفیل اگر نماز اور تجارت ہو جائے تو ہندوستان تو کیا چیز ہے، آدھی دُنیا ان کے قدموں پر جھک سکتی ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی انقلاب انگیز لائحہ عمل نہیں"۔

۴ مارچ ۱۹۳۳ء - قادیان نمبر

اداریہ نمبر ۲۔ (مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے یہ انتہائی مختصر لیکن پُر مغز صلائے عام پر مبنی اداریہ ہے جس میں انھوں نے خدا اور رسول کے نام پر مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی ہے۔ جو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں)۔

صُورِ اسرافیل۔

باز گل بانگِ پریشان می زنم
آتش اندر عندلیبان می زنم

وہ آخری فتنہ جس کی رسُول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلّم نے خبر دی تھی مشرق میں قادیان کی شکل پکڑ کر ظاہر ہو چکا ہے اور ان کو جنھیں دیدۂ بینا دیا گیا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی غیرتِ دینی اپنی پوری بدنی استقامت کے ساتھ نہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تو اسلام کا ہندوستان میں خدا ہی حافظ ہے۔

ہر مسلمانوں کو اللہ کے نام پر جو لم یلد ولم یولد ہے اور محمد مصطفےٰ کے نام پر جو خاتم النبیین ہیں اور اسلام کے نام پر کہ اللہ کے نزدیک وہ ہی دین ہے، درد بھرے دل سے صدائے صلائے

عام دیتا ہوں کہ مجلسِ مرکزیہ دعوت و ارشاد لاہور کی شاخیں ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر ضلعے اور قریے میں قائم کرے، اور اپنے تمام جزئی اختلافات کو اس مجلسِ عالیہ کے ان دو بڑے مقاصد کی تکمیل کی خاطر مٹا دیں۔ (۱) فتنۂ قادیان کا استیصال۔ (۲) فتنۂ تفریخ کی بیخ کنی۔ اگر مسلمان ان دو گونہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو گئے تو دنیا بھی ان کی ہے ورنہ پھر خسران مبیں یعنی دینوی اور دنیاوی رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

۱۹ر مارچ ۱۹۳۳ء

(۳) اس نمبر میں ادارے کی طرف سے "مداخلت فی الدین" کے نام سے اداریہ لکھا گیا اور اس اداریے کو ایک آیت کریمہ سے شروع کیا گیا تھا۔

۲۳ر جولائی ۱۹۳۳ء
اداریہ۔ "پنجاب کا مفلس اور مقروض کسان۔"

۱۵ر اگست ۱۹۳۳ء
اداریہ۔ "سکھوں اور ہندوؤں کے دعاوی و عزائم کی بے حقیقتی۔"

دونوں اداریے ادارۂ زمیندار کی طرف سے لکھے گئے۔

۵ر ستمبر ۱۹۳۳ء۔

اداریہ۔ "پنڈت جواہر لال نہرو کا زاویۂ نگاہ۔" (سیاسیات میں تبدیلی کے آثار)۔ (جواہر لال نہرو کے اقتصادی خیالات پیش کرنے کی توقع)۔

علمی مضامین:

(۱) مسئلۂ بعثت مجددین از قلم ظفر علی خاں۔ (یہ مضمون دراصل خواجہ کمال الدین کی اس تحریر کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس اُمّت پر ہر سو سال کے بعد ایک ایسا مجدد بھیجتا ہے جو دین کی تجدید کرے۔

(۲) ۱۹ر مارچ ۱۹۳۳ء (قادیان نمبر) مشائخ قادیان کی علمیّت۔ ظفر علی خاں کے قلم سے۔ یہ علمی مضمون دوبارہ شائع ہوا۔ اس سے پہلے یہ مضمون ستارۂ صبح میں شائع ہو چکا تھا۔

(۳) اِسلام اور مرزائیت کا تضاد۔

(۴) دعوتِ حفظِ ایمان۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کا معرکہ آرا بیان۔ بہاول پور کے معرکۃ الآرا مقدمہ میں مرزائیوں پر باطل شکن جرح اور اس کے علاوہ دوسرے کئی آدمیوں کے علمی مضامین تھے۔

حصۂ نظم :

(۱) مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے صفحۂ اول پر جلی قلم کے ساتھ نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً ۲ر مارچ ۱۹۳۳ء کو جو نظم شائع ہوئی اس کا عنوان تھا "فتنۂ قادیان" (چند اشعار ملاحظہ ہوں)۔

گہر کی قدر ہو کس طرح کوئی جوہری بھی ہو ۔۔۔ نہیں فرق اب رہا کچھ ٹھیکروں میں اور نگینوں میں
مثالب کا مجھے کیا ڈر میرا ایماں ہے قرآں پر ۔۔۔ کہ حق تک عین سے پہنچا ہوں میں اپنے یقینوں میں
کہاں پنجاب میں اسلام تیری اُٹھ گئی غیرت ۔۔۔ بٹھایا کفر کو لا کر نبی کے ہم نشینوں میں
کھلونا قادیاں کی بن گئی وہ سطوتِ کبریٰ ۔۔۔ ہے اب تک شور جس کا آسمانوں اور زمینوں میں

(۲) ۱۹ر مارچ ۱۹۳۳ء - سر مستان بادۂ یثرب کا پیغام

کرنے دے انھیں جفا تو مگر نہ ہاتھ اُٹھا ۔۔۔ خواہ کیسی ہی قوی وجہِ اشتعال ہو
اک جہاں کے واسطے صدق کی تصویر بن ۔۔۔ اک زمانہ کے لیے صبر کی مثال ہو
حق کی جلوہ گاہ میں شانِ کردگار بن ۔۔۔ حق کی شاہراہ پر جاکے پائمال ہو

(۳) ۱۶ر اپریل ۱۹۳۳ء - ضمانت نمبر میں ایک نظم صفحۂ اول پر "دعوت دار شار" کے نام سے نکلی - (از قلم ظفر علی خاں)

شکر ہے میداں میں اترے ہیں ہمارے پیشوا ۔۔۔ تاکہ دنیا میں بلند اسلام کا جھنڈا کریں

فکاہات۔

فکاہات کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں جو قادیانیت کے بارے میں ہیں، وہ ان نمبروں میں خصوصیت کے ساتھ نکلیں۔

ان نمبروں میں خصوصیت سے قادیانیوں کی کتابوں سے پورے طور سے حوالے دے کر ان کے عقائد جو خدائے قدوس کے متعلق اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہیں، کی تفصیلات بہ تصریح صفحات بیان کی گئی ہے۔ اس طرح یہ نمبر اپنے علمی تاریخی مواد کے لحاظ سے بھی معرکۃ الآرا نمبر ہیں۔ اس میں اس تحریک کی پوری طرح بیخ کنی کی گئی ہے، جو عقائد کے اعتبار سے بنیادی طور سے اسلام کے خلاف اور سیاسی لحاظ سے بلاشبہ پوری طرح انگریزی حکومت کی موید اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت خطرناک تھی۔

تبصرہ :

اس نمبر (قادیان نمبر) کی اشاعت کا زبردست ردِ عمل ہوا اور یہ اخبار جبری طور پر کئی مہینے کے لیے بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ یہ دوبارہ جولائی ۱۹۳۳ء میں جاری ہوا اور اس کے اجرا پر

معاصر اخبارات ہمدم لکھنؤ، روزنامہ شیر زنگون، پیسہ اخبار لاہور، خلافت بمبئی وغیرہ نے خاص طور سے مبارک باد دی۔ اسی طرح لاہور کی مختلف ایسوسی ایشنوں نے بھی زمیندار کی خدمات کا اعتراف کیا۔ مارچ میں اس اخبار کو ایک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن نومبر میں بعض اسباب کی بنا پر کمپنی توڑ دی گئی اور مالکان کو اخبار و پریس کے حقوق واپس مل گئے۔

۱۹۳۴ء

یہ سال زمیندار کے لیے سالِ گزشتہ کی طرح امتحان کا سال تھا، اس لیے کہ نومبر ۱۹۳۴ء میں اخبار کی ضمانت بھی ضبط ہوئی اور پریس بھی ضبط ہوا۔ اسی سال تبلیغ کانفرنس کے سلسلے میں جو مرزائیوں کے خلاف کی گئی تھی۔ زمیندار نے "تبلیغ نمبر" بھی نکالا۔ اس کے نتیجے میں انھیں قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ اسی سال قرطاسِ ابیض شائع ہوا اور پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ نکلی۔ اسمبلی کے آئندہ انتخابات کے سلسلے میں مسلمانوں کو اپنا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لیے غور و خوض کرنے کی زمیندار نے دعوت دی۔ زمیندار کی خدمات کے سلسلے میں ہندوستان بھر کے مسلمان اخباروں نے زمیندار کی خدمات پر خراجِ تحسین ادا کیا اور قادیانیوں کی طرف سے قتل کی دھمکی پر کہ ان کو ۱۱ دسمبر کو قتل کر دیا جائے گا، مصر کے موقر روزنامہ البلاغ میں محمود فواد مصری کا ایک مضمون اور مولانا کے نام ایک خط ہمدردی کے طور پر شائع ہوا۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں غازی عبدالقیوم کی اپیل مسترد کر دی گئی۔ زمیندار نے اس سلسلے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو واضح طور پر پیش کیا۔

ذیل میں ہم اس سال کے حاصل شدہ جرائد کے اہم اداریے اور ان کی تفصیل لکھتے ہیں:

(۱) ۲۶ جنوری ۱۹۳۴ء - شرحِ سود انضباطِ حسابات کا قانون - (ادارہ کی طرف سے)۔

(۲) ۱۵ اپریل " ساہوکاروں کو انقلاب پسندی کی تلقین - "

(۳) ۱۳ اگست " اسمبلی کے انتخابات آئندہ اور مسلمانوں کا مسلک

(۴) ۱۴ نومبر " ناموسِ رسول کی قیمت - (از ظفر علی خاں)

(۵) ۲۲ نومبر " پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ - وفاقی نظام کا تاب ناک سراب - (ادارہ)

(۶) دسمبر " مجوزہ اصلاحات اور انگلستان کے لبرل "

(۷) " " غازی عبدالقیوم کی اپیل کا استرداد - سزائے موت کی بحالی پر احتجاج -

(۸) ۱۴ نومبر کا پرچہ اس لیے اہم تھا کہ مولانا نے اپنے قلم سے اداریہ میں اخبار کی ضبطی کے متعلق زبردست احتجاج کیا۔ اور ۲۴ نومبر کا پرچہ اس لیے اہم تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ایک مکتوب مفتوح تاج دارِ انگلستان اور ساری مسیحی دنیا کے نام اردو اور انگریزی میں

قادیانیت کے خلاف نکلا جس میں انھوں نے مختلف حوالوں سے بتایا کہ قادیانی (مرزا غلام احمد) حضرت مریم اور حضرت عیسےٰ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ کہ جو اُن پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے ۔ انھوں نے اس طویل مکتوب میں لکھا کہ مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب "آئینۂ کمالات" میں صفحہ ۵۴۷ پر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ کُل بنی نوع کی تواضع ذیل کے مغلظات سے کی ہے :

"تمام وہ لوگ جو میری بات کو قبول نہیں کرتے حرام زادے ہیں ۔"

قادیانیوں کے جھوٹے نبی کا موجودہ خلیفہ مرزا محمود احمد اس ساری خرافات کی حرف بحرف تصدیق کرتا ہے اور اپنی کتاب "آئینۂ صداقت" میں لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اور غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ تمام وہ لوگ جو میرے باپ کی نبوّت پر ایمان نہیں لاتے ، کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ۔"

مسٹر ظفر اللہ خاں جو مرزائے قادیان کے ایک راسخ العقیدہ مرید اور موجودہ خلیفہ قادیان کے دستِ راست ہیں ، تمام مسلمانانِ ہند کو کافر اور دائرۂ "اسلام" سے خارج سمجھتے ہیں ۔ حضور پر اب واضح ہو گیا ہو گا کہ سر سیموئیل مور مسٹر ظفر اللہ خاں کے لیے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا منصب تجویز کرنے میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ۔ حضور کی مسلمان رعایا کی مخلصانہ استدعا ہے کہ جو ظلمِ عظیم ان پر روا رکھا گیا ہے اس کی تلافی ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے فرمائی جائے ۔ دُنیائے اسلام نے اپنے خفیف بین الجماعتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرزا غلام احمد اور اس کے پیروؤں کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا ہے اور مسلمانانِ ہند کو حضور کی رعایا ہونے کی حیثیت سے یہ حق پہنچتا ہے کہ فرقۂ قادیانیہ کو ایک جداگانہ غیر اسلامی اقلیت قرار دیا جائے ۔ جس کو کسی حالت میں یہ اجازت نہ ہو کہ برطانوی ہند کے شہری ہونے کی حیثیت سے اسلام کو اپنے دنیوی مفاد کے حصول کا آلہ کار بنائیں ۔

بالآخر مسلمانانِ ہند کی طرف سے میرے معروضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) حضور حامیِ دینِ مسیحی ہیں اس لیے حضور کا مقدس فرض ہے کہ اس کی عزت کی حفاظت کریں جو بنی نوع انسان کا ایک بہت بڑا محسن اور ساری دُنیا کے احترام کا مستحق ہے ۔ قرآن مجید مریم صدیقہ اور مسیح علیہما السلام کو صدیقہ ، کلمۃ اللہ کے القاب سے یاد کرتا ہے اور ان کی نسبت مرزائے قادیان کی بکواس کی تاب مسلمانانِ ہند نہیں لا سکتے ۔ اس سلسلے میں جو انسدادی تدابیر حضور عمل میں لائیں ان کے لیے مسلمان سپاس گزار ہوں گے ۔

(۲) ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے مسٹر ظفر اللہ خان کے تقرر کے احکام پر خطِ تنسیخ کھینچا

جائے - اس لیے کہ یہ شخص اپنے مذہبی عقیدوں کی رُو سے مجبور ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھے۔

(۳) قادیانی ایک جداگانہ غیر مسلم فرقہ قرار دیے جائیں۔

(ظفر علی خاں) لاہور - ۲۲ر نومبر ۱۹۳۴ء

روزنامہ زمیندار - لاہور - چہار شنبہ - ۵ شعبان ۱۳۵۳ھ - (۱۴ر نومبر ۱۹۳۴ء)۔

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا سرکار نے جاتے جاتے

"اپنے سی سالہ دورِ حیات میں مسلمانانِ ہند کی صحیح ترجمانی کے لیے زمیندار کو جو قیمت قید، ترقی، جرمانہ اور ضبطی کی شکل میں ادا کرنی پڑی - اس کی تازہ ترین قسط اخبار سے تین ہزار روپے کی ضمانت اور اس کے پریس کی ضبطی ہے - مَیں خوش ہوں کہ جس جرم کی پاداش میں زمیندار پر اس مرتبہ یہ زد پڑی کہ وہ حضور آقائے دو جہاں کے ناموس کے تحفظ کا جرم تھا - اور مجھے یہ شکایت ہے کہ اس جرم کی اتنی کم سزا کیوں ملی - جرم بہت ہی سنگین تھا، سزا بھی اسی مناسبت سے ملنی چاہیے تھی - بہرحال یہ سعادت کیا کم ہے کہ جس بازار میں یوسفؑ کا نرخ خراج مصر تھا - وہاں سوت کی انٹی پیش کرنے والے بھی بہ نگاہِ حقارت نہیں دیکھے جاتے۔

پلول کا گدھا اب اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ اس کی معرفی کی رسم کے اعادہ کی مطلق کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو زمیندار کے فکاہات میں نقاش کے قلم سے ایک ظریفانہ مقالہ شائع ہوا تھا جس کا مقصد فقط اس قدر تھا کہ حضور سردارِ کونینؐ کے اسم گرامی کا استخفاف پلول کے محکمہ بیطاری کے ایک عاقبت نااندیش سرکاری ملازم نے کیا تھا، اس کے خلاف ایک مزاحیہ پیرائے میں صدائے احتجاج بلند کی جائے - جن لوگوں کو ذوقِ سلیم سے بھی کچھ حصّہ ملا ہے - وہ اگر اس مضمون کو سرسری نظر سے بھی دیکھیں گے تو انھیں اس میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آئے گی جس کا خمیازہ زمیندار کو اس شکل میں بھگتنا پڑے کہ حکومت اپنے اختیاراتِ فوق العادۃ سے کام لے کر اس مضمون کی اشاعت کی پاداش میں زمیندار سے تین ہزار روپیہ اور منصورا سٹیم پریس سے جس میں زمیندار چھپتا تھا، ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کرے - اگرچہ یہ مضمون ملک کے امن و امان کو ایسا ہی درہم برہم کرنے والا تھا تو حکومت کو اس کے شائع ہوتے ہی یہ سخت تہدیدی و تادیبی کارروائی کرنی چاہیے تھی لیکن حکومت کامل

ایک مہینہ تین دِن تک خاموش رہی۔ اور اس دوران مقالہ زیرِ نظر نے ملک کے طول و عرض میں کوئی ہنگامہ پیدا نہیں کیا۔ آخر ۱۸ر اکتوبر کو نامعلوم کیا سمجھ کر اور کن مصلحتوں کی بنا پر اس نے راقم الحروف کے نام یہ عتاب آمیز فرمان جاری کیا کہ نقاش کے مقالہ ۱۵ر ستمبر کی اشاعت کی علت میں تین ہزار روپے کی رقم زمیندار اور ایک ہزار روپیہ منصور اسٹیم پریس کی طرف سے بطور زرِ ضمانت ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۴ء تک داخلِ خزانۂ سرکار کی جائے۔ اس حکم کے ساتھ نقاش کے مضمون کا ترجمہ بھی منسلک تھا۔ ہم نے یہ سمجھ کر کہ ترجمۂ مضمون، جو حکم کے ساتھ منسلک ہے، حکم ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اور ضبط شدہ بھی نہیں ہے اور حکومت سارے مُلک کو بتانا چاہتی ہے کہ اس قسم کے مضامین میں جن میں پیغمبرِ قادیان کا ذکر مستہزیانہ انداز سے کیا گیا ہو، حکومت کو ناپسند ہے۔ اگلے دن کی اشاعت یعنی ۱۹ر اکتوبر کے زمیندار میں جس پر حسبِ رواجِ صحافت ۲۰ر اکتوبر کی تاریخ درج تھی۔ مسٹر گاربٹ چیف سیکرٹری کا مراسلہ مع ترجمۂ منسلکہ من وعن شائع کر دیا۔

ادخالِ زرِ ضمانت کے لیے سرکار کی طرف سے دس دن کی مُہلت دی گئی تھی۔ زمیندار کا آخری نمبر جو اس دہ روزہ مہلت کے سلسلے میں شائع ہُوا، وہ تبلیغ نمبر تھا جس پر ۲۱ر اکتوبر کی تاریخ درج تھی۔ یعنی یہ نمبر پریس میں چھپ کر ۲۰ر اکتوبر کی صبح کو شائع ہو گیا۔ از بس کہ یہ نمبر ۱۶ر صفحات کی ضخامت کے ساتھ غیر معمولی تعدادِ کثیر میں چھاپا گیا تھا۔ اس لیے اس کی تیاری ۱۶ر اکتوبر ہی سے شروع کر دی گئی تھی اور اس کے کئی فرمے ۱۷ر اکتوبر ہی کو چھپ چکے تھے۔

اس عرصے میں احرار کی تبلیغ کانفرنس مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صدارت میں بمقام قادیان منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد نے امتِ مرزائیہ کے حلقوں میں ایک کھلبلی ڈال دی اور مرزا بشیر الدین محمود خلیفۂ قادیانِ مسلمانوں کے اس اجتماعِ عظیم کے دُور رس مذہبی اثر کا اندازہ کر کے، جو اُن کی خلافت کے وقار کو خطرے میں ڈالتا ہُوا نظر آتا تھا، فرطِ غیض و غضب سے از خود رفتہ ہو گئے۔ زمیندار پر ان کا گوشۂ چشم آج سے کج نہیں بلکہ ان کے آرا و افکار کے ترجمانِ خصوصی 'الفضل' نے شور مچا دیا کہ زمیندار نے اپنی ۱۸ر اکتوبر والی اشاعت میں اسی مضمون کو جسے حکومت نے قابلِ گرفت قرار دیا تھا، دوبارہ شائع کر کے حکومت کے خلاف تمرّد کا مظاہرہ کیا ہے، اس لیے اس کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ حکومت قادیان شریف کے اس شور و غل سے متاثر ہوئی یا نہیں ہوئی۔ لیکن زمیندار کے ساتھ جو سلوک چند دن بعد یعنی ۷ر نومبر ۱۹۳۴ء کو اس نے روا رکھا،

اسے دیکھتے ہوئے عامۂ مسلمین کا یہ خیال ضرور یقین کے درجے کو پہنچ گیا کہ مرزائیوں کے تالیفِ قلب کے لیے حکومت کی مصلحتیں زمیندار پر کسی سخت تر عتاب کا نزلہ گرانے کے لیے مجبور تھیں۔ ۷ر نومبر کو مسٹر گاربٹ چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کا ایک تازہ مکتوب موصول ہوا جس میں راقم الحروف کو اطلاع دی گئی کہ منصور اسٹیم پریس، جس میں زمیندار چھپتا تھا، بحقِ ملکِ معظم ضبط کیا جاتا ہے۔ چناں چہ پولیس نے آکر مطبع ضبط کر لیا۔ اور مطبع کی عمارت میں قفل ڈال کر اس میں اپنا پہرہ بٹھا دیا۔

زمیندار کی ضمانت اور منصور اسٹیم پریس کی ضبطی کا حکومت سے مجھے کوئی گلہ نہیں، کیوں کہ اس قسم کی ضمانتیں اور ضبطیاں میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ گلہ اگر ہو سکتا ہے تو اس بات کا کہ حکومت نے اپنے احکام کے لیے جو دلائل دیے ہیں وہ بہت کچھ زیادہ وزنی نہیں اور اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ طول و عرضِ ملک میں صرف مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندوؤں نے بھی اس کے رویّے کو حق بجانب قرار نہیں دیا۔

میری حالت یہ ہے کہ جو کچھ پاس تھا، وہ سب سرکار کی نذر کر دیا۔ مَیں خدائے بزرگ و برتر کی رحمتوں سے نہ کبھی مایوس ہوا ہوں اور نہ ہو سکتا ہوں۔ اگر اس کا فضل شاملِ حال رہا تو جلد ہی تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ مَیں ان تمام احباب و معاصرین کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے اپنی ہمدردی بھرے مکاتیب اور مقالوں سے میری حوصلہ افزائی کی۔"

نظمیں:

۲۶ر جنوری ۱۹۳۴ء۔ "وقت کی راگنی" از ظفر علی خاں

رَبِّ کعبہ کے سوا جھکنا کسی کے آگے — دل سے محو اپنے بزرگوں کی روایات نہ کر
مشکلات اپنی اگر پیش ہی کرنی ہیں تجھے — تو بجز بارگہِ قاضیٔ حاجات نہ کر

۱۴ر نومبر ۱۹۳۴ء۔ "نقارۂ خدا" از ظفر علی خاں

جھوٹوں کی لگاتار یہ کوشش ہے کہ دب جائے — سچوں کی جماعت کے علم دار کی آواز
سن لیں وہ جنھیں بخشی گئی سننے کی توفیق — ہو گی نہ کبھی بند زمیندار کی آواز
باز آ نہ سکا حق کی حمایت سے زمیندار — صحرا کی صدا ہو گئی اشرار کی آواز

۱۲ر اگست ۱۹۳۴ء (سنڈے ایڈیشن) سر عبدالحمید دیوان کپورتھلہ اور زمیندار کی نوک جھونک۔ (بہ زبان نقاش)

عبدالحمید نے یہ بڑے فخر سے کہا — بخشی گئی ہے قفلِ قضا کی مجھے کلید
میرے لیے ہے خونِ مسلمان کا روا — میرے خدنگِ ناز کا اسلام ہے شہید

یہ لام کاف سن کے زمیندار نے کہا — اے سامری کے نسخے کے دیباچۂ جدید
میرا یہ کام ہے کہ کروں تجھ کو انتباہ — اللہ کی گرفت کا خمیازہ ہے شدید
دروازہ توبہ کا ہے ابھی تک کھلا ہوا — ایسا نہ ہو کہ مل نہ سکے مہلت مزید

۱۶ ستمبر ۱۹۳۴ء۔ "ملّت سوادِ اعظم کی آواز"

(اعلےٰ حضرت میر عثمان علی خاں تاج دارِ دکن کے گوش حق نیوش کے لیے)

اے کہ تیرے دِل میں ہے سودائے حُبِّ اہلِ بیت
اے کہ ترے دِل میں ہے پیوست عشقِ پنج تن
مجھ کو بھی آلِ عبا سے ہے ارادت بے حساب
میری گردن میں بھی ہے اُس کی عقیدت کی رسن
مَیں بھی ہوں ابن ابی طالب کا اک ادنےٰ غلام
میری آنکھوں میں ہے جس کی سطوت مرحب فگن
اور پکار اٹھتا ہوں مَیں بھی لا فتیٰ الا علی
جب کسی میدان میں گھمسان کا پڑتا ہے رَن
مَیں ابوبکر و عُمر پر بھی ہوں سو جاں سے نثار
مجھ سے پوچھے کوئی ان کے نام چمکانے کا فن
اس میں بوبکر و عُمر ہوں یا ہوں عثمان و علی
سب کی خوشبو سے مہکتا ہے خلافت کا چمن

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء۔ "تعزیرِ جُرمِ عشق"۔ (اس نظم کی اشاعت کے بعد منصور اسٹیم پریس ضبط ہو گیا)۔

فکاہات۔ (نقاش کے قلم سے)

(۱) ۱۵ اپریل ۱۹۳۴ء

لاہوری مرزائیوں کے پیشوائے اعظم جناب محمد علی کو اس دشمنی کے لحاظ سے، جو آپ کو روایاتِ اسلامیہ کے ساتھ ہے اور قرآن مجید کی اس تفسیر بالرائے کو سامنے رکھ کر جس کی سطر سطر میں یہودیانہ نہیں تو کم از کم راذول سیل یا مارگولیتھ کا مسیحیانہ تصرف ضرور ہے۔ یہ جملہ کہہ رہا ہے، جب مَیں پادری کہہ کر یاد کرتا ہوں تو جناب ممدوح غیض و غضب کے عالم میں خود بھی مجھ پر برس پڑتے ہیں اور اپنے سرکاری گزٹ "پیغام جنگ" اور اپنے بعض فرمانبردار حواریوں سے مجھ کو تمام وہ صلواتیں ایک سانس میں سنوا دیتے ہیں جو آپ

کو اپنے لاٹ پادری مرزا غلام احمد آں جہانی سے فخر کہیں ملی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میری ایک سیدھی سی بات پر مجھ کو ٹیڑھیاں کیوں سنائی جاتی ہیں۔ مَیں اگر جناب کو پادری کے لقب سے یاد کرتا ہوں تو یہ لقب تو خود قادیان کے پاپائے سمرہ سے آپ کو مرحمت ہو چکا ہے اور کلام اللہ کے معانی میں تحریف شدہ انجیل کی تاویلات رکیکہ کا پیوند لگا کر آپ اس لقب کے سرمدی اجارہ دار بن چکے ہیں۔ پھر نتھنے پھلا پھلا کر مونچھوں کے ہر بن مُو سے غصہ کی چنگاریاں اڑا اڑا کر مجھ غریب پر بگڑنا چہ معنی؟

جناب محمد علی اگر خرافات واہیہ کی اس پوٹ کو جو مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات و مکاشفات کا مجموعہ ہے، طاقِ نسیاں کا گلدستہ بنا چکے ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے اس کتابِ مقدس کو اس طاق سے نیچے اتار کر ذرا اس کی ورق گردانی فرمالیں۔ ایک مقام پر آپ کو مضمون ذیل کی عبارت بہ خطِ جلی لکھی ہوئی نظر آئے گی۔

"مَیں نے عالتِ کشف میں دیکھا کہ کمنٹرلوبی کے لاٹ پادری صاحب نے مجھے ایک فونٹین پین دیا۔ مَیں نے یہ قلم محمد علی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ محمد علی مغربی دنیا میں "اسلام" کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں گے۔"

اب آپ برائے مسیح موعود خود ہی انصاف فرمائیں کہ جب آپ کے ہاتھ میں کنٹربری کے لاٹ پادری کا قلم ہو تو مَیں نے کیا بُرا کیا اگر آپ کو پادری محمد علی کہہ دیا۔

(۲) ۱۲راگست ۱۹۳۴ء۔ (زمیندار سنڈے ایڈیشن)۔

انسان اشرف المخلوقات ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، فرشتے اسے سجدہ کر چکے ہیں، آفتاب کو اس کی آئینہ داری کی خدمت سونپی گئی ہے، ہواؤں کو اس کا فراش بنایا گیا ہے۔ ان ساری نورانی حقیقتوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردہ ڈالنے والے ہندوستان کے برہمن تھے جن کے نزدیک انسانیت کا شرف و مجد صرف ان لوگوں کے حصہ میں آیا تھا۔ جن کے ہاتھ میں طاقت تھی۔ جن کی ہمیانیاں درہم و دینار کے زور سے پھٹی پڑتی تھیں۔ یونان اور روما کے کاہن تھے۔ جنھوں نے اپنے کروڑوں ہم جنسوں کو بے نوا و بے کس ہونے کی خطا پر غلامی کی زنجیروں جکڑ رکھا تھا۔

رحمتِ عالمیان، صفوتِ آدمیان، تتمۂ دورِ زمان محمد مصطفےٰ با آبٹن ہو واہتا آئے اور اس سیاہ پردہ کو اپنی نورانی انگلیوں کی ایک جنبش سے اٹھا دیا اور ڈنکے کی چوٹ

اعلان کر دیا کہ تمام انسان خُدا کا کنبہ ہیں اور انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ نسل یا رنگ یا ذات یا پیشہ یا دولت کی بنا پر کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے کسی بنی نوع کو حقیر سمجھے۔ شرافت کا اصلی معیار یہ ہے کہ انسان نیک کردار ہو۔ یہ نہیں کہ وہ کسی سیّد کی صلب سے پیدا ہُوا ہے یا کسی برہمن کے گھر میں اس نے جنم لیا ہے۔ انسانیت کے ابتدائی حقوق سے کوئی شخص محض اس علّت میں محروم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا باپ بھنگی تھا اور وہ خود بھی خاکروب ہے۔

ایک کلمہ گو خاکروب نے (پنجاب میں انھیں مصلّی کہا جاتا ہے) جس کا نام خیر دین ہے، جامع منٹگمری کے خطیب مولانا عبدالجلیل سے جا کر فریاد کی کہ فلاں سقّے نے مجھے مسجد کے کنویں پر اپنے مشکیزہ سے یہ کہہ کر پانی پلانے سے انکار کر دیا کہ بھنگیوں کو پانی پلانے سے کنواں اور مسجد دونوں ناپاک ہو جاتے ہیں۔ مولانا نے اسے تشفی دی اور کہا کہ اب ایسا نہ ہوگا۔ چناں چہ سقّے کو تنبیہ کر دی گئی اور اسے اسلامی احکام بتائے گئے۔ یہ خبر عیدگاہ کے امام مولوی عبداللہ صاحب کو معلوم ہوئی جو مالوی جی کے درن آشرمی حلیف ہیں تو وہ پنجے جھاڑ کر مولانا عبدالجلیل کے پیچھے پڑ گئے۔ اور آج کل اس پروپیگنڈا میں مصروف ہیں کہ مسجد کی حُرمت اور جامع مسجد کے کنویں کی طہارت مولانا عبدالجلیل کی خاکروب نوازی کے ہاتھوں خطرہ میں ہے۔ اللہ بھلا کرے منٹگمری کی جمیعتِ دعوت و تبلیغ کے روشن خیال ارکان کا، جنھوں نے جلسہ کر کے مولوی عبداللہ کی سفیہانہ حرکت سے بیزاری کا اظہار کیا اور شریعت کی لاج رکھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اگر خطرہ ہے تو اس وضع و قماش کے جاہل اور بے خبر مُلّاؤں سے اور جتنی جلدی ملّت کا وجود ایسے نالائق دینی راہ نماؤں سے پاک ہو جائے اتنا ہی ملّت اور انسانیت کبریٰ کے حق میں اچھا ہے۔"

۲۴/ نومبر ۱۹۳۴ء

سیہ کدۂ یورپ کے گوشہ گوشہ سے لعنتیں انسانیت کبریٰ کے ناموس کو گھور رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شوخ چشم، سب سے زیادہ دیدہ دلیر برہمنگی کی لعنت ہے جس کے صدقہ میں ہٹے کٹے نوجوان اور مست شباب ہڑدنگیاں مادرزاد عریانی کا خلعت زیب تن کیے اور ایک دُوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے کلبوں اور تفریح گاہوں میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں اور یورپ کی تہذیب انھیں ذرا نہیں ٹوکتی۔ عریانی کی اس

لعنت نے عرصۂ مغرب کو اپنے لیے تنگ پاکر اب مشرق کا رُخ کیا ہے۔ ٹرکی پر، جو یورپ سے ملا ہوا ہے، اس کی پہلی نظر پڑی اور کچھ ترکنیں بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں۔ لیکن انقرہ برلن نہ تھا اور استنبول قسطنطینِ اعظم کی صلیبی یادگار ہونے کے باوجود لندن نہ تھا کہ اس کھلی ہوئی بے حیائی کی طرف سے آنکھوں پر تہذیبِ نو کی پٹی باندھ لیتا۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو جب اس حیا سوز واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے وہی کیا جو ایک باغیرت ترک کو کرنا چاہیے تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر، ایک دقیقے کے درنگ کے بغیر یہ فرمان قضا توامان صادر کر دیا کہ حدودِ ترکیہ میں جو عورت ننگی نظر آئے گی یا برہنگی کا اقدام کرے گی، اسے فوراً سُولی پر چڑھا دیا جائے گا۔

یورپ یقیناً کہے گا کہ یہ فرمان وحشیانہ ہے اور مصطفےٰ کمال بہت سی باتوں میں مغربیوں کی تقلید کرنے کے باوجود ابھی تک پوری طرح سے مہذب نہیں بن سکا، بلکہ ویسا ہی جانگلو ہے جیسا کہ اس کے آباو اجداد تھے۔ یورپ کو حق ہے کہ جو چاہے کہہ لے مگر اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک اسلام کی روح انقرہ کے کالبد میں جلوہ گر ہے، جب تک جامع ایا صوفیہ سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ "الحیاء شعبۃٌ من الایمان" اس وقت تک کوئی ترک اور کوئی ترکن باوجود کوٹ، پتلون اور سایہ پہن لینے کے، باوجود رواجی پردے کے اٹھ جانے کے، اپنے ننگے پن کا تماشا انسانیت کبریٰ کی عزت کو دکھلانے سے یکسر قاصر ہے۔

مسلم کانفرنس کا دعویٰ تھا کہ میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ ہوں۔ اس نمائندگی کا کشور گیر بوجھ اس بارِ امانت کا لاڈلا پہلو تھا جس کی تاب کبھی ارض و سما نہ لا سکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بوجھل نمائندگی کا جنازہ اٹھانے کے لیے بڑے بڑے چوڑے چکلے کندھوں کی حاجت تھی اور یہ وصف مبدا فیاض کی طرف سے طول و عرضِ ہند میں صرف مولانا شوکت علی کو ارزانی ہوا ہے۔ مسلم کانفرنس کے صدر ڈاکٹر شفاعت احمد خان کو شکستِ فاش دے کر جناب مولانا اس کی رسوائی کی بھاری بھرکم لاش اپنے طویل و عریض کندھوں پر لاد کر نکلے تو ماہ نے زہ نے کہا کہ فلک احسنت پکار اٹھا اور حلقۂ یارانِ سرِ پل سے یہ غوغا بلند ہوا کہ:

ٹوڈی کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

۱۹۳۵ء

(اس سال کے جو پرچے دستیاب ہو سکے ہیں یا زیرِ مطالعہ آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں)۔

(۱) جنوری ۱۹۳۵ء
(۲) یکم فروری ۱۹۳۵ء
(۳) ۳ر فروری ۱۹۳۵ء
(۴) ۲۳ر مارچ ۱۹۳۵ء
(۵) ۱۰ر اگست ۱۹۳۵ء
(۶) ۱۷ر اگست ۱۹۳۵ء

حسب ذیل اداریے قابلِ ذکر ہیں:

یکم فروری ۱۹۳۵ء سراب (دو کالمی اداریہ) ظفر علی خان کے قلم سے
(۲) ۱۰ر اگست ۱۹۳۵ء قائدینِ احرار کے کارنامے
(۳) ۱۷ر " " افغانستان آزاد

یکم فروری کو جو اداریہ مولانا کے قلم سے نکلا وہ سیاسی ہونے کے باوجود ادبی خوبیوں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس اداریے کی ابتدا فارسی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوئی۔

دور است سرابِ ازیں بادیہ ہشدار
تا غول بیاباں نہ فریبد بسرابت

جائنٹ پارلیمنٹری سیکرٹری کی سفارشات جو قرطاسِ ابیض کی تجاویز سے زیادہ رجعت پسندانہ ہیں اور جن کے سانچے میں ڈھل کر ہندوستان کا جدید دستورِ اساسی برطانوی پارلیمنٹ کے دروازہ پر دستک دینے والا ہے، کے متعلق ہندوستان کے طول و عرض سے شور بلند ہوا کہ ہمیں یہ سفارشات منظور نہیں۔ ہندوؤں کی انتہا پسندی اور اعتدال پسندی اور رجعت پسندی اس کی متفقہ مخالفت میں ایک ہو گئی۔ ہندوستان کے تمام سیاسی طبقوں نے بھی اپنے جزوی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر اعلان کر دیا کہ ہمیں یہ سفارشات کشاں کشاں غلامی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ یہ ابداً قبول نہیں۔ البتہ ان کے اس حصے کو جو مسٹر رمزے میکڈونلڈ کے فرقہ وارانہ فیصلے کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ ناقص ہونے کے باوجود ہم تسلیم کیے لیتے ہیں لیکن وہ بھی اس وقت تک کہ فرقہ وارانہ حقوق کے متعلق ہم اپنے ہندو ہم وطنوں کے ساتھ کسی قابلِ اطمینان مفاہمت پر پہنچ جائیں۔"

مولانا نے اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے یہ بات لکھی کہ یہ فرقہ وارانہ فیصلہ جس کے

ایفا کے بعد مسلمانوں کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوتا۔ کونسل کی چند زائد نشستوں یا وزارتوں کے مل جانے سے وہ اقتدار نصیب نہیں ہوتا جو ذمہ دارانہ نظامِ حکومت کا لازمہ ہے جن صوبوں میں ہندوؤں کو غالب اکثریت حاصل ہے، جب وہاں بھی اس اکثریت کا سیاسی ثمرہ یہ ہے کہ ان کے ہاتھ وائسرائے اور گورنروں کے فوق العادہ اختیارات اور آرڈی نینسوں نے باندھ رکھے ہیں تو پنجاب جیسے صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی بظاہر نام اکثریت ہے، فرقہ وارانہ فیصلہ انھیں خود مختاری کا کون سا نیا انعام بخش دے گا۔

اگر ہندو اس موٹی سی بات کو سمجھ جائیں اور مسلمانوں سے کہہ دیں کہ مغز اپنے پاس رکھ کر جو چھلکا تمھیں غیر نے دیا ہے وہ ہماری طرف سے تمھاری نذر ہے، تو چٹکی بجانے میں تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہندوؤں کی سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود اس عقل پر ہے جنھیں اس چھلکے کی مفارقت بھی گوارا نہیں۔ حالاں کہ یہ چھلکا بھی اس وقت تک بدستور انگریزوں کے قبضہ میں رہے گا جب تک دونوں میں کوئی سمجھوتا نہ ہوگا۔

کاش ہندوؤں کو پرماتما یہ سمجھنے کی توفیق دے کہ مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں ان کے حقوق مل جانے کے بعد بھی جو ریمزے میکڈونلڈ نے ان کے غلام ہندوستان نے دینے کا وعدہ کیا ہے، ہندوؤں کا تفوّق کسی طرح کم ہونے میں نہیں آئے گا۔ اور ان کی آئینی اکثریت ہر حالت میں غالب ہی رہے گی۔ بابو راجندر پرشاد، مسٹر جناح، مدن موہن مالوی اگر سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور تنگ دلانہ کج بحثی کو چھوڑ کر کشادہ دلانہ گفت و شنید سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں تو سراب سیراب ہو سکتا ہے۔

اسی اخبار میں فکاہات بھی نقاش کے قلم سے لکھے گئے۔

ماہ جولائی میں مسجد شہید گنج کا سانحہ پیش آیا اور سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ مجلسِ احرار جو اب تک ایک زبردست عوامی جماعت تھی، مسلمانوں کی قیادت کے لیے آگے نہ بڑھ سکی۔ جب کہ مولانا ظفر علی خاں کو اس تحریک کا قائد ہونے کے سلسلے میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔

۱۰ر اگست ۱۹۳۵ء کو ایک زبردست اداریہ قائدین احرار کے کارنامے پر مشتمل جو دو اقساط پر مشتمل تھا، دو مختلف اشاعتوں میں نکلا جس میں احرار کی خدمات کا طویل ذکر تھا۔ اور آخر میں کوئٹے کے ریلیف کیمپ میں ان کی خدمات کو سراہا گیا تھا اور یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ مسجدِ شہید گنج کی تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے مسجد کی بازیابی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ اسی سلسلے میں ایک اہم مضمون "اے معتکفِ

حجرۂ احرار کجاؤ" کے نام سے نکلا۔ اور اس طرح مجلسِ احرار کی خاموشی پر انتہائی تعجب کا اظہار کیا گیا تھا۔

اسی تاریخ کے اخبار میں ایک زبردست نظم " احرار کا جنازہ حبیب الرحمٰن اور چودھری افضل حق کی اسلام فروشی کے کندھوں پر " نکلی، جس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں :

احرار کا جنازہ منقول از زبانِ خلق

بیگانہ یہ بدبخت ہیں تہذیبِ عرب سے
ڈرتے نہیں اللہ تعالےٰ کے غضب سے

مل جائے حکومت کی وزارت کسی ڈھب سے
سرکارِ مدینہ سے نہیں ان کو سروکار

پنجاب کے احرار ہیں اسلام کے غدار

سوجھی شہدا پر انھیں مُردار کی پھبتی
سکھوں کی یہ پھبتی ہے نہ سرکار کی پھبتی

توحید کے بیٹوں پہ ہے احرار کی پھبتی
گمراہ ہیں خود اور ہمیں کہتے ہیں غلط کار

پنجاب کے احرار ہیں اسلام کے غدار

۱۹۳۵ء میں دو اہم واقعات پیش آئے۔ ایک جون ۱۹۳۵ء میں کوئٹے کا زلزلہ، جس میں گنجان شہر مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر میں بدل گیا۔ اور ساٹھ ہزار مکانات آن کی آن میں منہدم ہو گئے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۳۵ء مسجدِ شہید گنج کا حادثہ پیش آیا۔ مجلسِ احرار کے مسئلہ شہید گنج میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہونے کے باعث مولانا ظفر علی خاں نے زبردست اظہارِ ناراضگی کیا اور زمیندار اخبار کی تمام مسلمانوں نے تائید کی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں مولانا کو نظر بند کر کے کرم آباد بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب وہ رہا ہوئے تو ماہ نومبر ۱۹۳۶ء میں لاہور میں شہید گنج کانفرنس ہوئی، جس کے صدر مولانا شوکت علی تھے۔ اس کانفرنس میں یوپی، سرحد، صوبہ جات متوسط، بنگال اور برما کے ۵۰۰ نمائندوں نے شرکت کی۔ مجلسِ استقبالیہ کے صدر مولانا ظفر علی خاں تھے۔ جنھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ کانفرنس کی غرض و غایت اور مسجدِ شہید گنج کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مسجد کے گرائے جانے کے واقعات اور مسلمانوں کے حصولِ مسجد کے لیے اضطراب اور آئینی طور پر مسلمانوں کی عدالتی کارروائی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۳۶ء کو باتصویر شہید گنج نمبر شائع کیا گیا۔ جس میں زعمائے کانفرنس کی تصویریں تھیں۔ اس سے قبل ایک نہایت اہم نمبر ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو مسئلہ شہید گنج اور حالاتِ شہید گنج کے سلسلے میں مفصل طور پر شائع ہو چکا تھا۔ اس اخبار کے اداریے کا سیاہ حاشیہ تھا اور اداریے کا عنوان "مسجدِ شہید گنج کی تحریک کا مفہوم اتباعِ اسلام، خدمتِ خلق اور آزادی کامل تھا" یہ اہم نمبر اپنی خصوصیات قومی کے لحاظ سے انتہائی اہم تھا۔

اسے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۳۶ء

دستیاب شدہ اخبارات میں حسب ذیل نمبر زیرِ نظر ہیں :

(۱) ۲۸ر مئی ۱۹۳۶ء

(۲) ۳ر جون "

(۳) ۱۴ر " " (مجاہد نمبر)

(۴) ۹ر جولائی ۱۹۳۶ء

(۵) ۱۴ر " "

(۶) ۱۴ر اگست ۱۹۳۶ء

(۷) ۱۶ر " "

(۸) ۲ر اکتوبر "

(۹) ۱۵ر نومبر "

(۱۰) ۲۹ر " "

قابلِ ذکر اداریے :

(۱) ۲۸ر مئی ۱۹۳۶ء مطابق ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۳۵۵ھ ۔ طلوع صبح سعادت ۔

(۲) ۱۴ر جولائی ۱۹۳۶ء ۔ اداریہ "موت کے افق سے زندگی کے آفتاب کا طلوع"

(سر فضل حسین مرحوم ۔ ایک مہتم بالشان زندگی کا خاتمہ)

(۳) ۱۴ر جون ۱۹۳۶ء جہاد و شہادت ۔ مسلمانوں کی دو محبوب آرزوئیں ۔

(۴) ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء ۔ دیوِ استعمار کی کارگزاری ۔ غدّاری کا انجام ۔

(۵) ۹ر جولائی ۱۹۳۶ء ۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کا مفہوم ۔ اتباعِ اسلام، خدمتِ خلق اور آزادیٔ کامل ۔

(۶) ۱۵ر نومبر ۱۹۳۶ء ۔ شہید گنج کانفرنس نمبر ۔ آل انڈیا شہید گنج کانفرنس نمبر ۲

(یہ اداریہ دو مسلسل اقساط میں نکلا اور یہ اداریہ اس کا آخری اداریہ تھا ۔)

(۷) ۲۹ر نومبر ۱۹۳۶ء ۔ مصر و برطانیہ کا معاہدہ ۔ قوموں کی آزادی کے عنصر ۔

مندرجہ بالا اخبارات میں کوئی اداریہ مولانا کے قلم سے نہیں ہے ۔ صرف ۲۹ر نومبر ۱۹۳۶ء کے اخبار میں فکاہات "جوینده یابنده" کے نام سے شائع ہوئے ۔ جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

فکاہات :

سورج کو جس کے نور نے رخشندہ کر دیا
موتی کو جس کی آگ نے شرمندہ کر دیا

اسلام کے سپرد ہوا جس کا اہتمام
اس کارخانہ کا مجھے کارندہ کر دیا

ہوتا ہے جن میں نام رسولِ خدا بلند
ان محفلوں کا مجھ کو نمائندہ کر دیا

سردارِ دو جہاں کا بنا کر مجھے غلام
میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

مضمون کو گلہ ہے زمیندار سے تو ایک
ہر قسط کو حوالۂ آئندہ کر دیا

مضامین :

(۱) ایران کی جدید شاعری پر ایک نظر۔ (ایرج مرزا) از ظفر علی خاں۔

(۲) مسجدِ شہید گنج کانفرنس میں مولانا ظفر علی خاں صدر مجلسِ استقبالیہ کا خطبۂ صدارت۔

(۳) اس سال علمی مقالات اور دیگر مضامین لکھنے والوں میں مولانا خدا بخش اظہر امرتسری کا مقالہ علمی مسیلمہ کذاب پر مجاہد نمبر میں شائع ہوا۔ اسی طرح ان کی کئی نظمیں مختلف نمبروں میں نکلیں۔ مثلاً ایک نظم 'ظہورِ قدسی' دوسری نظم 'گلستانِ کابل'، تیسری نظم 'محسنِ عالم' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جولائی ۱۹۳۶ء کی شہید گنج کانفرنس میں دلبر حسین مسحور کا ایک معرکۃ الآرا طویل مضمون شہید گنج کی تاریخی کیفیت پر اور اس کے حالات پر مشتمل نکلا۔ جس میں مسجدِ شہید گنج کی بازیابی کے جذبے کی بنیاد اور اس کے اہم مفہوم پر اور مسلمانوں کی قربانیوں اور ان پر گولی چلنے کے واقعات مجلسِ مشاورت کے قیام اور فدایانِ مسجدِ شہید گنج کے نام اور ان کی پوری تفصیل کے متعلق شائع ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ایک اہم ادبی مضمون "یتیم کی جیت" بھی شائع ہوا۔

۱۹۳۷ء

۲۰ فروری ۱۹۳۷ء کو زمیندار کا "حج نمبر" جو ۳۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ ایڈیشن علمی اور تاریخی اعتبار سے مختلف مضامین پر مشتمل تھا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کے بعض پہلو اور کعبۃ اللہ کی مختصر تاریخ اور انتظامی اصلاحات پر مشتمل مضامین تھے۔ اسی طرح ہجرتِ انبیاء پر مدلل اور محققانہ مضمون کے ساتھ ساتھ حج اور قربانی کے اسرار اور رموز پر مشتمل کئی مضمون تھے۔ تاریخی لحاظ سے اس میں ایک اہم مضمون ڈکٹیٹر شپ کا تاریخی تخیل اور شہنشاہ پرستی کے جذبے کی فلسفیانہ تصویر کے علاوہ حسبِ معمول دلچسپ معلومات تھیں۔

اداریہ :

فلسفۂ حج ۔جمعیت اقوامِ اسلام کی تشکیل پر مشتمل تین کالمی اداریہ تھا جس میں ارکان اسلام کے فوائد، روزہ اور نماز کی حکمتیں، حج کی برکات ، مناسک حج، عشق الٰہی کی دیوانگی پر جامع طور سے لکھا گیا تھا ۔

حصّۂ نظم :

اس نمبر کا حصّۂ نظم خصوصی طور پر مولانا ظفر علی خاں کی نظموں پر مشتمل تھا ۔ ان کی یہ دونوں نظمیں دو مختلف عنوانات کے ساتھ تھیں (۱) مروارید کی بارش (تازہ کلام) (۲) میر عثمان علی خاں کا محبّت اندوز نام ۔

فکاہات کا حصّہ کا بھی ان کے اشعار سے مزیّن تھا ۔ ذیل میں ہم چند اشعار بطور اقتباس پیش کرتے ہیں ۔

(۱) مروارید کی بارش

کلام اللہ کو اس طرح کرتے تھے نبیؐ اذبر — کہ جو کچھ سن لیا روح الامیں سے پڑھ لیا فرفر
رسُول اللہ کی اُمّت کی رنگا رنگیاں دیکھو — کوئی ابیض، کوئی اصفر، کوئی اَسود، کوئی احمر

(۲) عثمان علی خان کا محبّت اندوز نام

ذکر آتا ہے جو عثمان علی خاں تیرا — نام لیتے ہیں محبّت سے مسلماں تیرا
تیرے خرقہ میں لگے دیکھے ہیں مَیں نے پیوند — گرچہ جم سے نہیں کم کچھ بھی ہے ساماں تیرا
حَرم و دَیر کو شامل ہے نوازش تیری — ساری اقوام سے برتاؤ ہے یکساں تیرا

فکاہات :

الٹ جاتی ہے جب تقدیر کام آتی نہیں طاقت — نہ چل سکتی ہیں بندوقیں نہ چل سکتے ہیں طیارے
بداوت سے حضارت کو پڑا پالا تو دیکھو گے — دھرے رہ جائیں گے تہذیبِ افرنجی کے پشتارے

اِسی نمبر میں ابنِ سعود شاہِ حجاز کے لیے بھی ان کی ایک طویل نظم ہے ۔ دوسرے شعرا میں اظہر امرت سری کی بحرِ طویل میں نظم سلام، علی ابراہیم حاجی سرحدی اور مرزا بیضا خاں مروی ایرانی کی فارسی نظم، اظہر حسین زاہدی کی نظم " سوزِ عشق " خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔ اس طرح یہ پرچہ علمی و ادبی لحاظ سے ایک اہم نمبر ہے ۔

۱۹۳۸ء :

۱۶ فروری ۱۹۳۸ء کے اخبار پر مدیہ مسئول مولانا ظفر علی خاں لکھا ہوا ہے ۔ اس سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں پورے طور سے اخبار کی ادارتی ذمّہ داریاں

سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اختر علی خاں بحیثیت پرنٹر اور پبلشر کے تھے۔

سرورق مختلف مقامی اور غیر مقامی خبروں سے پُر ہے پہلے صفحہ پر ۱۸ فروری کو یوم مسجد شہید گنج پورے اہتمام سے منائے جانے کی اپیل ہے۔ نیز آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ڈیلی گیٹوں اور ممبروں کے انتخاب کے متعلق مسٹر محمد علی جناح صدر لیگ کا اہم بیان ہے۔ اس کے بعد بھی یہ اخبار مسجد شہید گنج کے گرانے کے خلاف سدوستاں کے طول و عرض میں زبردست احتجاج اور جلوسوں کی اطلاعات پر مشتمل ہے۔

اداریہ صفحہ نمبر ۳۔

اس اداریے میں تحریک خاکساران اور ان کے ایثار اور اس جماعت کے فروغ کے متعلق اظہارِ خیال ہے۔ خاکسار تحریک کی طرف سے بیت المال کے قیام کے سلسلے میں جو مطالبہ تھا اور لاہور میں ایک براڈ کاسٹنگ اسٹیشن قائم کیے جانے کا مطالبہ، جس کے ذریعے قرآنِ حکیم اور حدیث شریف کی تعلیم کی نشر و تبلیغ کا انتظام ہو سکے۔ اس تجویز پر بلیغانہ انداز میں ایک جامع تبصرہ ہے۔ اور آخر میں ان سے مطالبہ ہے کہ انھیں مسجدِ شہید گنج کی بازیابی کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیئے اور یہ کہ اس تحریک کا منتہائے مقصود کیا ہے؟ کیا کانگرس کی طرح مکمل آزادی ہے یا مسلم لیگ کی طرح آزاد وفاقی نظام۔

فکاہات : بُت شکن کے قلم سے (مولانا ظفر علی خاں کا قلمی نام)

حسبِ معمول فکاہات میں معاصر ہندو اخباروں پر حریفانہ چوٹیں ہیں۔ جس کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں :

ہر طرف سانپوں کی پھنکار سنی جاتی ہے
بانبیوں سے نکل آئے ہیں ملاپ اور پرتاپ

راہ رو کو ہے سرِ راہ سے گزرنا مشکل
ان کے حملوں سے بچ سکتے ہیں ہم اور نہ آپ

اس اخبار کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں "نغمۂ فردوس" از چودھری خوشی محمد ناظر کے کلام پر ریڈیائی تنقید ہے کہ جس میں ان کے ناظم یا شاعر ہونے پر ادبی بحث ہے۔ اسی سلسلے میں وہ اس سے قبل عرش تیموری کی کتاب قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیوں پر بھی ریڈیائی تنقید نشر کر چکے تھے۔ اسی طرح اردو کی ہستی کو مٹانے کے لیے یوپی میں جو کوششیں جاری تھیں اس پر بھی خبروں کے ضمن میں تبصرہ ہے۔

خبروں کے سلسلے میں یہ اخبار زیادہ تر ملک کی سیاسی اور غیر سیاسی خبریں خوب دیتا ہے۔ اسی اخبار میں ایک خط امریکہ کے مسلمانوں کی طرف سے ہے جس میں اہ کی قومی اور ملی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے اور زمیندار کی خریداری کے لیے خاص طور سے دریافت کیا

گیا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں اور قومی دل چسپیوں کا پتا دُور و دراز کے باشندوں کو چل سکے۔

۱۹۳۹ء

۲۸ر فروری ۱۹۳۹ء۔ یہ نمبر ہفتہ وار زمیندار کا ایک خصوصی نمبر ہے جو محرم کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔

اداریہ۔ اس نمبر کا اداریہ "اسوۂ حسینؑ" کے نام سے مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے لکھا گیا ہے جس کا آغاز اور اختتام شعر ہی پر ہُوا ہے۔ سرِ آغاز یہ شعر درج ہے:

نہ زیاد کا وہ سِتم رہا نہ یزید کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

اور آخر میں یہ شعر درج ہے:

حسین کا سر ہے آسمان پر جو رہ چکا تھا کبھی سناں پر
تو کم سے کم سَر مکیف تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو

۶ر جون ۱۹۳۹ء۔ سنڈے ایڈیشن۔

صفحۂ اوّل پر "حیاتِ جاوید" کے نام سے مولانا ظفر علی خاں کی ایک طویل نظم ہے جس کے تین منتخب شعر یہ ہیں:

رحمتِ باری کم اپنا جوش کر سکتی نہیں — یہ چڑھی ندّی قیامت تک اُتر سکتی نہیں
کُفر سے مجھ کو ہے لاگ اور دِیں سے ہے مجھ کو لگاؤ — کوئی اور الزام دُنیا مجھ پہ دھر سکتی نہیں
مَیں حَرم سے اڑ کے جا بیٹھوں گا شاخِ سدرہ پر — میرے پر تثلیث کی قینچی کتر سکتی نہیں

اداریہ:

لکھنؤ کی شیعہ سُنی مناقشت کے سلسلے میں دو کالمی اداریہ ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی تائید کی گئی ہے۔ حصّۂ نظم میں علّامہ رشدی کے قلم سے ایک نظم اور اصغر حسین نظیر لدھیانوی کے قلم سے ایک نظم ہے۔ حصّۂ مضامین میں مولانا ظفر علی خاں پر ایک چھ کالمی مضمون محمد شریف چشتی کے قلم سے اور سیّد اظہر حسین زاہدی کا ایک افسانہ قابلِ ذکر ہے۔

یہ اخبار خبروں کے سلسلے میں سیاستِ یورپ کا صحیح مرقع، زمیندار کا مکتوب برلن اور عربی اخبارات میں سے بعض خبریں اور ملک معظّم کے سفر کینیڈا پر دِل چسپ کوائف اور اسی طرح مُلکی اور غیر مُلکی خبروں پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ اخبار ادبی اور سیاسی معلومات کا ایک

جامع مرقّع ہے جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دو خاص حصّے ایک شرح تبادلۂ زر کے متعلق مفید معلومات، دوسرے خواتین کی تعلیم پر بھی مشتمل ایک مضمون ہے۔ یہ حصّۂ اخبار اشتہارات کے لحاظ سے تقریباً خالی ہے۔ اور اپنی دِل چسپ معلومات، سیاسی خبروں، ان پر تبصرے، مضامین اور مولانا ظفر علی خاں کے اشعار اور دوسرے شعرا کے کلام پر مبنی ہونے کے باعث قابلِ ذکر اور وقیع پرچہ ہے۔

۱۹۴۷ء :

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے، تقریباً ۱۹۳۲ء کے بعد سے اداریہ لکھنے چھوڑ دیے تھے۔ اور بقول بیگم اختر علی خاں مرحوم مولانا نے ۱۹۳۶ء سے زمیندار اخبار کی اداریہ نویسی ترک کر دی تھی۔

یہ بات صحیح ہے کہ زمیندار کے مدیر کا نام مختلف اوقات میں بدلتا رہا اور خود زمیندار کو ایسے صاحبِ قلم صحافی اور ادیب ملتے رہے جنھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے نقطۂ نظر کو پوری ذمّے داری کے ساتھ زمیندار کے صفحات پر پیش کیا۔ ان ممتاز لوگوں میں مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولانا خدا بخش اظہر، سیّد اظہر حسین زاہدی، قاضی احسان اللہ اور شروع کے دَور میں مولانا عبداللہ عمادی، وجاہت حسین جھنجھانوی شامل ہیں۔ درمیانی دَور میں مولانا مرتضیٰ احمد میکش، چراغ حسن حسرت، اشرف عطا قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہ بات قطعی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے ہمیشہ اس اخبار کی صحافتی اور ادبی حیثیت اور سیاسی اہمیّت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی براہِ راست نگرانی سے کام لیا۔ ان کے لیے تمام اداریوں کو پڑھنا، ان کی نوک پلک کو درست کرنا اور اخبار کے معیار کو قائم رکھنا سب سے اہم کام تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے بعض عزیزوں کی لاپرواہی تک کو برداشت نہیں کیا۔ چناں چہ لالہ مہدی علی خاں کو اسی قسم کی غلطی کے باعث اخبار چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح مدیر اداریہ بھی پوری طرح ان کی نگرانی میں تھے۔ اس لیے یہ کسی طرح بھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ اخبار سے انھیں عملاً کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی لیے ہم نے ان کے اہم مضامین اور نظموں کا انتخاب بھی کیا ہے اور ان کے اداریوں کو خصوصیت سے شامل کیا ہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں ان کا ایک اہم بیان، جو اپیل کی شکل میں تھا، شائع ہوا۔ یہ بیان ۲۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا :

"لاہور میں صبر آزما صورتِ حال رونما ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی پنجاب کو نئی زندگی کے دروازہ پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔ حکومتِ پنجاب کی تشدد فرمائیاں

صبر و شکیب کی قوتیں مغلوب کرنا چاہتی ہیں تاکہ فرزندانِ توحید کے صبر و ضبط کا بھرا ہُوا پیمانہ چھلکنے لگے اور وہ اضطراب و ہیجان سے بدنظمی اور افراتفری میں مبتلا ہو جائیں۔ فرد کا وہ ہی کام نتیجہ خیز ہوتا ہے جس کا رشتہ جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا مسلمانانِ پنجاب تائیدِ غیبی حاصل کرنے کے لیے کسی صبر آزما حرکت سے متاثر نہ ہوں، اور اسی راہ پر چلیں جس پر مسلم لیگ چلنے کی ہدایت کرے۔ مسلمانوں کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ہندو، سکھ اور اچھوت اور عیسائی ہمسایوں کے محافظ ہیں اور ان کی دوستی کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتے۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ یہ اپیل مقبولیت کے کانوں سے سُنی جائے گی۔"

(ظفر علی خاں)

صحافتی اصطلاحیں :

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی قوتِ اجتہاد سے صحافت کے ذریعے زبان میں نئے الفاظ، نئی تراکیب کے ساتھ تراش کر داخل کیے۔ جس طرح ان کی زندگی میں بوقلمونی ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری اور صحافت میں بھی ان کی ذاتی جدّت طرازی ہے۔ وہ پُرانے لکیر کے فقیر نہیں بلکہ زبان کی وسعت کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں اس لیے کہ ان کی تخلیقی قوت کی طاقتِ پرواز کبھی سلب نہیں ہُوئی۔ انھوں نے غیر زبان سے اُردو الفاظ لے کر اپنائے اور اس طرح اصطلاح سازی کرتے وقت اُردو کی تہی دامنی کا علاج فارسی عربی سے کیا۔ ان کے ہاں مرکّب اصطلاحیں بہت زیادہ ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حالات کے مطابق الفاظ کو بدل بدلا کر ان کو ایک نیا رُوپ دیا اور اس طرح اصطلاح سازی میں انھوں نے عربی اور فارسی کے علمی ذخیروں سے فائدہ اٹھایا اور اُردو کی کم مائیگی کا علاج عربی، فارسی اور ہندی کے مرکّب الفاظ کے استعمال سے کیا اور اس طرح اپنی صحافت کے ذریعے ان الفاظ کو عام بول چال کی زبان میں بار بار استعمال کر کے جاری کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ذریعے نئے نئے الفاظ عوام کی زبان میں شامل ہو گئے اور وہ ہی اردو زبان کا سکّہ رائج الوقت بن گئے۔ اصطلاحی الفاظ کی اختراع میں انھوں نے صوتی لحاظ کو قواعد و زبان اور دلالتِ معنی کے لحاظ سے خاص طور سے مدِّنظر رکھا۔

ذیل میں ہم اُن (صحافتی) مخصوص اصطلاحوں کو بیان کرتے ہیں جو ان کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں :

کاسہ لیسان ازلی۔ فتنۂ تفرنج۔ جنگِ فرنگ۔ ٹوڈی۔ یارانِ سرپل۔ جانگلو۔ عطوفت بنیاد۔ حرکتِ مذبوحی۔ ٹوڈیانِ کرام۔ موسیو بشیر الدین۔ ملّتِ بیضا۔ قادیانی بھیڑیں۔ معاشرتی

مغالطہ۔ حسابی ہتھکنڈے۔ مقاصدِ مزعومہ۔ مجاہدانہ عزیمتیں۔ یثربی جذبہ۔ خداوندانِ فرنگ۔ دلبستانِ فرنگ۔ حریفانِ فرنگ۔ یثربی تہذیب۔ مہمانِ فرنگ۔ نکتہ سنجانِ فرنگ۔ گاوانِ فرنگ۔ جورِ فراوانِ فرنگ۔ دکانِ فرنگ۔ میزانِ فرنگ۔ خدایانِ فرنگ۔ حجازی امیال و عواطف۔ بُت خانۂ تہذیبِ نو۔ عرقِ آہن۔ انسانیتِ کبریٰ۔ دیوِ استعمار۔ مشائخِ قادیان۔ قادیانی اندلسی و دمشقی طائفہ۔ امامیہ رنگ۔ رئیس المنطق۔ مراعاتِ منتقدہ۔ سرزمینِ بے آئین۔ حکمتِ عملی کا مدوجزر۔ شبابِ رفتہ کی رعنائیاں۔ مشتاقانِ جلوۂ دار و رسن۔ سہ گانہ مغالطہ۔ نشاۃِ ثانیہ۔ شانِ الوہیت۔ بادِ ذلالت۔ سامری پرست۔ مقراضِ جفا۔ طائفۂ مرزائیہ۔ دجّالی فتنہ۔ کرشنِ قادیان۔ استعمار پسند۔ کٹھ حجتی۔ ہفوات۔ صریرِ قلم۔ مصلحت کے گوناگوں خطرات۔ لندن کے جلاپے۔ شوخ چشمانہ جسارت۔ آلودۂ خطا و نسیان۔ صلیب آلود۔ خاکِ مذلت۔ خِرد باختہ۔ دُشنۂ استہزا۔ کثیر الانفار۔ خس بہ دندان۔ داغِ جمود۔ فقید المنظر۔ اختیاراتِ فوق العادہ۔ زندانیانِ حق۔ حکومت کی شیطنت۔ رخنہ در ایمان۔ کاغذِ زر۔ استعمارِ مغرب۔ مدبرِ مخابرات۔ تابناک سراب۔ درجۂ مستمرات۔ وفاقی نظام۔ قرطاسِ ابیض۔ ارکانِ حزب العمال۔ بہشتی مقبرہ۔ دُنیا کا دلچسپ قبرستان۔ کوتہ قبا۔ تحریکِ عصبانی۔ ہرڈنگیاں۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۲) صحافتی شاعری میں مختلف اصطلاحوں کا استعمال۔ ظفر علی خاں نے عوامی اصطلاحوں کو شعر کی دُنیا میں لاکر ان کو نئے سیاسی معنی بخش دیے۔ اور ان اصطلاحوں کی ایہامی اور ابہامی صنعتوں سے زبان میں رنگینی اور بیان میں توانائی پیدا کر دی۔ اس قسم کی حسب ذیل اصطلاحوں کو انھوں نے وضع و استعمال کیا۔

پتنگ کی اصطلاحیں۔ کھانے کی اصطلاحیں۔ رنگ کی اصطلاحیں۔ گاڑی بیل کی اصطلاحیں۔ ناچ کی اصطلاحیں۔ شطرنج کی اصطلاحیں۔ لباس کی اصطلاحیں۔ پہلوانی کی اصطلاحیں۔ تجاری کی اصطلاحیں۔ سواری کی اصطلاحیں۔ طب کی اصطلاحیں۔ جانوروں کی بولیاں۔ اور مذہب کی اصطلاحوں کو جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔

پتنگ کی اصطلاحوں میں مانجھا اور ڈور اور تکل لڑانا۔ کھانے کی اصطلاحوں میں پکوان پھیکا ہونا، گھی کے چراغ جلانا، مونگ کی دال دلنا، نیبو اور اچور، دال ماش بھگارنا، کھیر کا ابیر ہونا، بور کے لڈو، پال کے آم، گھی سے چپکے چپڑنا، کھچڑی کھانا وغیرہ وغیرہ۔

جتنی اصطلاحوں کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے ان سب کے مناسبات کا شعر میں استعمال ان کی خاص ایجاد ہے۔ اور بہارستان اور نگارستان کے مجموعے ان اصطلاحوں سے پُر ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے فوجی اصطلاحوں کو مثلاً دبل بول دینا کو بھی خوب استعمال کیا ہے۔

مذہبی اصطلاحیں :

ہمہ اوست ۔ ہوالکل ۔ توکل و قناعت ۔ تسلیم و رضا ۔ عشق ۔ ظلی و بروزی ۔ حدیثِ خاسئین ۔ حریمِ مصطفےٰ ۔ ابیض و اسود و احمر ۔ جالوتی و غفار ۔ ملہم ۔ خیر البشر ۔ مسندِ مجد دیت ۔ اخوجوالیہود ۔ ازرہِ تحکیم ۔ کن فیکون ۔ نشہ کون و مکاں ۔ یثرب کی گھٹا ۔ ابطالِ جہاد ۔ تثلیث کے پھندے ۔ ہیکلِ قادیاں ۔ مشئی فی النوم ۔ نبوتِ ظلی ۔ حشرِ ثمود ۔ انجامِ عاد ۔ رسوائے الی یوم التناد ۔ صحیفۂ اعمال ۔ برقِ کلیسا ۔ خدا کا حلول ۔ ربِّ کعبہ ۔ توحید کا الم ۔ کفر کا سانچہ ۔ درایت ۔ روایت ۔ ناشیۃ الیل ۔ خیرِ کثیر ۔ خاورِ حجاز ۔ سیف یداللّٰہی ۔ ایمان بالغیب ۔ عالمِ حال و قال ۔ بوالہبی شراب ۔ خم کدۂ حجاز ۔ رابطۂ ملتِ بیضا ۔ دیدۂ ہرقل کی تیرگی ۔ حبل المتین ۔ گنبدِ خضرا ۔ غازیانِ نجد ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

ظفر علی خاں کے اہم مضامین :

ظفر علی خاں کے اہم علمی، ادبی اور سیاسی و تنقیدی مضامین جو زمیندار کے ذریعے اشاعت پذیر ہوئے :

(۱) سائنس کا ایک نیا کرشمہ ۔ (دکن ریویو ۱۹۰۵ء)

(۲) فلسفۂ بو علی سینا ۔ (۴۲ صفحات)

(۳) تاریخ فلسفۂ اسلامیہ ۔

(۴) عبید زاکانی ہزل نگاران عجم کا پیشوا ۔ } ۱۹۲۸ء

(۵) کشفِ غطا ۔ } ۱۹۲۸ء

(۶) ازالۃ الخفا ۔ (ذاتی حالات پر ایک طویل مضمون) } ۱۹۲۸ء

(۷) دکن اور برطانیہ کے تعلقات پر ایک لمحۂ فکریہ ۔ } ۱۹۲۸ء

(۸) ادبیاتِ عرب (پہلی صدی ہجری کی شاعری) ۔

(۹) ایشیا میں برطانیہ کی حکمتِ عملی کا مدّ و جزر ۔

(۱۰) کلام الیل ۔ (مارک ٹویم کے قلم سے) ترجمہ ۔ ۱۹۲۷ء

(۱۱) چچا بھتیجا (مغربی معاشرت کا پر لطف نظارہ ۔

(۱۲) مریم عیسیٰ (قادیانیت پر ایک پر لطف افسانہ)

(۱۳) فسانۂ مجاز (جیل کی یکسوئی کے افکار) ۔

(۱۴) یہودی ترکش کا آخری تیر (۶ قسطیں) ۔

(۱۵) نسلی امتیاز ۔ (مغربی ملوکیت کی سب سے بڑی لعنت) ۔

(۱۶) کیا اسلام فنا ہو جائے گا؟ (۳ کالم)
(۱۷) اِسلام اور قتلِ مرتد - (۲ کالم)
(۱۸) اِسلام کی شانِ جلالی و جمالی کے دو منظر - (۳ کالم)
(۱۹) عید الضحیٰ و اسوۂ ابراہیمی - (۴ کالم)
(۲۰) افغانستان اور اٹلی - (طویل سات اداریے)
(۲۱) مولانا ظفر علی خاں کا خطبۂ صدارت - (۹ کالم)
(۲۲) کوئٹہ میں مشعلِ ہدایت کی نورُ افگنی - بصیرت افروز خطبہ -
(۲۳) ایران کی جدید شاعری پر ایک نظر -

ظفر علی خاں بحیثیت نقّاد :

حسب ذیل مضامین پر خصوصیت کے ساتھ ان کے نقد و تبصرات شائع ہوئے -

(۱) رقعاتِ شاد پر تبصرہ -
(۲) دیوانِ حمید پر تبصرہ -
(۳) محل خانہ (ناول) علی سجاد دہلوی کے ناول پر تنقید اور محاورے کی غلطیاں -
(۴) نخلِ تمنا پر بھرپور ریویو -
(۵) حالی کے کلام پر تبصرہ -
(۶) نقاد کے قلم سے محمد احمد علی کا جواب -
(۷) ظہیر دہلوی اور ان کی خدمات -
(۸) خواجہ غلام الثقلین اور ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات -
(۹) عبد الحلیم شرر کی خدمات پر تبصرہ -
(۱۰) دیوانِ وحشت پر تبصرہ -
(۱۱) نغمۂ فردوس - چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم نگاری پر تبصرہ -
(۱۲) علامہ شبلی کی علمی خدمات کا جائزہ -

ایک اہم سوال اور اس کا جواب :

سوال : کیا صحافتی ادب معیاری ادب نہیں ہے ؟

کہا جاتا ہے کہ صحافتی تحریروں میں اکثر عوام کے جذبات کے برانگیخت کی ضرورت پیش آتی ہے - اس لیے صحافتی تحریریں ہنگامی اثر رکھتی ہیں اور وقت گزر جانے پر ان کی کوئی اہمیت نہیں رہتی -

یہ بات ان صحافتی تحریروں کے متعلق تو صحیح ہو سکتی ہے کہ جن تحریروں کا مقصد ہنگامی خبروں کی اشاعت، ہنگامی واقعات پر تبصرے اور مقامی مسائل پر گفتگو ہو۔ لیکن جب اَدب اپنے مضامین علمی بحثوں، علمی خطبات، علمی مقالات سے پُر ہو اور وہ قانون کی ہمہ گیری کے پیشِ نظر مسائل مسلمہ پر گفتگو کرے تو ان مضامین اور ان خطبات کی اہمیت کبھی بھی ہنگامی نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم یہ بیجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ظفر علی خاں کا ادب صحافتی اَدب نہیں تھا۔ بلکہ جو علمی شہ پارے، جو ادبی مضامین اور علمی خطبات اسلام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی عید الضحیٰ، یومِ میلاد اور محرم نمبروں میں ایسے علمی مضامین تھے جو آج بھی اسلام کی بنیادی اقدار کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے لیے علمی شہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مسئلۂ قادیانیت یا ختمِ نبوت پر ان کے مضامین آج بھی علمی حیثیت سے اُردو اَدب کا اہم حصّہ ہیں۔ سیاسی اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں کے مضامین آج بھی مغرب کی سیاست کو سمجھنے کے لیے تاریخ کے طالب علم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسئلۂ خلافت، قتلِ مُرتد، دستور سازی کے اصول، ہندوستان کی آئینی کش مکش پر ان کے خطبات اور اداریے۔ اگر ان کو پورے طور سے جمع کر دیا جائے تو وہ بھی تاریخ و سیاسیات کے طالب علموں کے لیے رہبری کا کام کرتے ہیں۔

(۲) مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں جو حمد و نعت اور اسلام کے واقعات اور تبصروں پر مشتمل ہیں اور تصوّف اور قادیانیت پر بحث، تخلیقِ کائنات کی گفتگو اور زبان کے مسائل، ادبیاتِ عرب، لطائف الادب وغیرہ مسائل ہنگامی نہیں ہیں بلکہ صاحبانِ فکر کے لیے ان کی ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے ایک مستقل نظامِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ ادب کا ذوقِ جمال ان کی فطرت میں رَچا بَسا تھا۔ اس لیے ان کے ذوقِ سلیم نے کوئی غیر معیاری چیز پیش ہی نہیں کی۔ انھوں نے خود صحافت کے اندازِ فکر اور نقطۂ نظر اس کے ساتھ دلائلِ ختمِ نبوت جیسے اہم مسائل کو علمی دلائل کے ساتھ اشعار میں بلاغت کے ساتھ پیش کرنا ان کے ذوقِ سلیم کی بیّن دلیل ہے۔ مسئلۂ قادیان نہ اُس وقت ہنگامی مسئلہ تھا اور نہ آج ہے۔ یہ مسئلہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، مولانا ظفر علی خاں کی بالغ نظری کا ثبوت ملتا جائے گا۔ ان کی صحافت کوئی چٹپٹا کھانا نہیں تھا۔ انھوں نے حسن و عشق کے افسانوں، لاطائل کہانیوں اور بے کار قصّوں کو اپنے دائرۂ اَدب میں شامل نہیں کیا۔ انھوں نے ادبِ عالیہ کے وہ نادر مضامین پیش کیے جو اُن کے برس ہا برس کے مطالعے کا نچوڑ تھے۔ ان کے زورِ قلم

نے ان میں لطف بیان پیدا کر کے دِل چسپ بنا دیا۔ ان کی صحافت میں جنسی تلذذ کی طرح کی کوئی چیز نہ تھی۔ البتہ اگر مائدۂ فکر کے لیے کچھ طنز و ظرافت کی چٹپٹی چیزیں ہوتی تھیں تو اس لیے کہ انسان فلسفیانہ اور علمی مباحث میں بے لطفی اور خشکی محسوس نہ کرے۔

(۳) یہ صحیح ہے کہ ان کی صحافتی شاعری میں ابہام نہیں اور یہ کہ صحافت میں خارجی تحریک نشانِ منزل کا درجہ رکھتی ہے اور ایک خاص مقصد کے حصول کی خواہش ہی تحریر کے لیے تحریک کا کام دیتی ہے۔ لیکن خارجی تحریک بھی ایک باطنی تحریک کے لیے ایک محرک کا کام کرتی ہے اور باطنی تحریک کو پھیلانے کے لیے جن ذرائع سے کام لیا جاتا ہے، ان ذرائع میں سے صحافت بھی ایک ذریعہ ہے۔ باطنی تحریک اپنے میں ایک مستقل اور دوامی کیفیت رکھتی ہے اور اس مستقل کیفیت کو تحریر کے مختلف طریقوں سے پیش کیا جاتا ہے اور بار بار ایک نقطۂ نظر کو تحریر کے ذریعے پیش کرنا کوئی ہنگامی بات نہیں۔ صحافت ہنگامی چیز تو ہو سکتی ہے لیکن جن مضامین کی بنیاد تاریخی اسباب و علل پر ہو ان کو کبھی ہنگامی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر قاری کا ذہن اور مبلغِ علم یکساں نہیں ہوتا بلکہ ہر قاری اپنے نقطۂ نظر سے اخبار کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اخبار کے رئیس التحریر کی عظمت یہ ہے کہ وہ اخبار اپنی وقیع تحریر اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اس قدر عام فہم اور آسان زبان میں ہو کہ قاری اخبار کے نقطۂ نظر کو پورے طور سے سمجھ سکے۔ اس سے اتفاق کرنا یا اختلاف رکھنا ہر قاری کا اپنا نقطۂ نظر ہے جس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے جب کوئی صاحبِ قلم اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے تو اس کے قدرتِ کلام سے اس کی شخصیت اور تحریر کا حسن، ذہنِ انسانی میں نقش ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظفر علی خاں کی تحریر میں یہ ایک بامقصد انفرادیت تھی کہ انھوں نے اپنے مستقل نظامِ فکر یعنی اسلام کی اشاعت ایک ایسی مستقل زبان کے ذریعے کی جس نے ایک ہزار برس میں جا کر اپنا روپ دھارا تھا۔ اس لیے جب شاعر "سلطان ٹیپو" کے مزار پر پہنچتا ہے تو جو کیفیت وہ بیان کرتا ہے، وہ کوئی ہنگامی صورت نہیں بلکہ ایک دائمی حقیقت کا اظہار ہے جس میں ریا کا کام نہیں ؎

اے سرنگاپٹم اے گنجِ شہیدانِ کرام
تیری آنکھوں میں ہے اپنوں کا عروج اور زوال
کشورِ ہند کا رنگ ہی ہوتا کچھ اور
قوتِ بازوِ اسلام تھی اُس کی صولت
اس کے اٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ہبوط اور صعود
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبود
اس کی دولت کے دُعاگوں میں شامل تھے ہنود
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

یہ صحیح ہے کہ اَدب میں کنایاتی انداز مضمر ہے لیکن صحافت میں یہ ممکن نہیں۔ البتہ صحافت اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا نام ہے جس کی اشاعت کے لیے صحافت نے اپنے عَلم کو اٹھایا ہے۔ اِس لیے صرف نقطۂ نظر کے آفاقی یا غیر آفاقی ہونے پر صحافت کی مستقل یا ہنگامی اقدار کا انحصار ہے۔ ظفر علی خاں کی صحافت نے ہنگامی اقدار کو کبھی نہیں اپنایا بلکہ وہ تہذیبِ نو کے ہنگامی جلووں سے متنفر ہی رہے۔ انھوں نے کہا ہے :

تہذیبِ نو کے مُنھ پہ وہ تھپّڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حُلیہ بگاڑ دے

اگر ادب اجتماعی اور ازلی اقدار کی پیش کش کا نام ہے تو ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ظفر علی خاں کا صحافتی ادب (نثر و نظم) دونوں کی حیثیت آج بھی باقی ہے۔ ان کے یہاں تخیّل کا ملکہ موضوع کے اعتبار سے یقیناً کارآمد ہے۔ ان کا صحافتی ادب ایک فنی تخلیق ہے جس میں تخیل سے بارہا کام لیا گیا ہے۔ ظفر علی کی صحافت سے خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، تخلیق کے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور اس کے چراغوں کی روشنی دوسروں کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور دعوتِ عمل بھی۔

جن کے دِل پتھّر کے ہیں ان پر تو کیا ہوگا اثر
میرے دِل کی یہ صدا ہے دردمندوں کے لیے
یا تو خود مٹ جائیں یا باطل کی شہ رگ کاٹ دیں
ایک ہی رستہ کھُلا ہے حق پسندوں کے لیے

ظفر علی خاں اکابر و معاصرین کی نظر میں

علامہ اقبال :

"میرے نزدیک مولانا ظفر علی خاں ایک غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کی ہمت بلند ہے اور ان کا قلم اپنی روانی میں بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔ یوں تو سارا ہندوستان ان سے متاثر ہوا ہے لیکن پنجاب کے مسلمانوں پر ان کا خصوصیت سے احسان ہے۔ کیوں کہ مذہبی، ادبی اور سیاسی اعتبار سے انھوں نے اس صوبے کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔"

(پیامِ اقبال۔ روزنامہ احسان لاہور۔ ظفر علی خان نمبر۔ ۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء)

علامہ سید سلیمان ندوی :

ظفر علی نے اپنے اخبار کے ذریعے علمی دعوت و تبلیغ کا ٹھوس کام انجام دیا اور پھر یہ کہ ان کے طریقۂ تحریر اور طرزِ تنقید نے اخبار کے دامن کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں بیسیوں علمی مضمون آ گئے۔ اس اخبار کے ذریعے انھوں نے علماء میں رشتۂ اتحاد بڑھانے اور اتحاد بین المسلمین کے لیے کوشش بھی کی۔ اور ایسی نظمیں لکھیں جن میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بھی اتحاد کی اہمیت کی طرف نہ صرف اشارے تھے بلکہ واضح طور سے دعوتِ فکر بھی تھی۔ اور ان کا عملی قدم اس طرف آگے ہی بڑھتا رہا۔ ظفر علی خاں اسلام کے سپاہی ہیں اور ان کا قلم ان کی تلوار، نیزہ اور ڈھال کا کام دیتا ہے۔ آگے چل کر ان کا دفتر علماء اور عوام کی تحریکات کا مرکز بن گیا۔"

(حیاتِ شبلی۔ ص ۳۸ - ۳۹)۔

سر رضا علی :

ظفر علی کے ادبی مذاق کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے غلط کلام کو ضائع کر دیا۔ صحت کا خیال رکھا۔ اور منسوخ شدہ کلام پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا۔ (اعمال نامہ)

مولانا غلام رسول مہر :

مولانا ظفر علی نے کارکنانِ ادارہ کی اتنی دل داری کی جتنی وہ کر سکتے تھے۔ مالکانِ

جرائد نے اتنی کبھی نہیں کی۔ وہ قدر شناس تھے اور ہمت افزائی کے لیے اچھی نظم یا اچھے مضامین پر فوراً انعام دیتے تھے۔ وہ ہمدردانہ رویہ رکھنے کے سبب ایک منفرد کردار کے مالک تھے کہ انھوں نے کبھی اپنے طور پہ کسی کانگرسی کو جواب نہیں دیا۔ اُن کے ذاتی کردار کی پاکیزگی میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ عوامی دائرے میں جو کام انھوں نے کیا وہ کسی نے نہیں کیا۔ یہ انھی کا کمال تھا کہ وہ دن دن بھر میں کئی کئی تقریریں کرتے تھے۔ اور لوگوں کو قائل کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی عظمت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا کہ جو چیز ان کے ذہن میں آگئی۔ انھوں نے اس کو عوام تک کامیابی سے پہنچا دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح طور سے صحافت کے بانی ظفر علی خاں ہیں۔ وہ گویا اس خیرِ کثیر کے بانی ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کی تنظیم و اتحاد اور آزادی میں مسلمانوں کی پیش قدمی ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق مسلمانوں کی ترجمانی، عام مسلمانوں کی بہبود کے لیے مستقل کام کیا اور بین الملکی فوائد کے لیے اور مسلمان ممالک کی آزادی کے لیے مختلف طور پہ کام کیے اور ان تمام مسلمان ممالک کے افکار کو علمی نقطۂ نگاہ سے عام لوگوں تک پہنچانے کا کام زمیندار نے انجام دیا اور ادب میں بھی ایک ایسا معیار قائم کیا کہ اس کی حیثیت نقشِ اوّل کی حیثیت ہے۔"

عبدالمجید سالکؒ :

ظفر علی خاں کی سیاسی زندگی اور اس کے اتار چڑھاؤ سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن ان کی زبان دانی، ان کی انشا پردازی، ان کی شاعری اور خطابت کے کمالات سے کسی دشمن کو بھی انکار نہیں۔ ان کے اسلوبِ تحریر کی ایک خصوصیت نہایت عجیب ہے کہ وہ آورد اور تکلف کے اعتبار سے تو اُردو کے نعمت خاں عالی اور ابوالفضل معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کے ٹکسالی محاوروں کا اس قدر بے تکلف استعمال ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے مستند اہلِ زبان اور شاعر بھی کیا کریں گے۔ زبان دانی کا وہبی ملکہ ہونے کے علاوہ انھیں علی گڑھ و حیدر آباد میں ثقات کی صحبت بہ درجہ اتم حاصل رہی جس کی وجہ سے ان کے جوہر چمک اٹھے۔ قاری کو اُن کے موضوع سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن ایک دفعہ تو وہ ان کے بیان کی دِل فریبی میں کھو جاتا ہے۔

آلِ احمد سرورؔ :

"وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نعرۂ مجاہدین دلوں میں گھُستا جا رہا ہے۔ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف سے سُتھراؤ کرتی جا رہی ہے اور نظم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کے چشمے اُبل رہے ہیں۔" (نئے پُرانے چراغ)

ظفر علی اگر سیاست سے ذرا الگ رہتے تو دوسرے اقبال ہو سکتے تھے۔ ظفر علی کی شخصیت میں اسلام سے بے پناہ محبت کی استواری تھی اور اس کی تہذیبی بنیادوں پر انھوں نے اپنا سرمایہ شعری پیش کرنا شروع کیا۔ ان کی طبیعت میں ایک مقصد کی لگن تھی یعنی ہندوستان کی آزادی اور اسلام کا فروغ۔ ان میں تخلیقی صلاحیتیں بے انتہا ہیں۔ ان کی قدرتِ بیان، زورِ کلام، ہر جگہ، ہر انداز سے، ہر نہج سے چمکتا ہے۔ جذباتیت کی کثرت ہے لیکن یہ جذباتیت ہی ہمارے عمل کی جان ہے۔" (نئے پرانے چراغ)

ڈاکٹر سید عبداللہ

اخبار نویسی میں قربانی زیادہ اور نفع کم تھا۔ انھی قربانیوں نے زمیندار، الہلال اور ہمدرد جیسے شجر لگائے۔ اس شجر سے پھل ملتے تھے۔ مگر قید و بند کے اور جرمانے اور ضبطی کی صورت میں۔ البتہ یہ بزرگ اخبار میں ادبی چٹخارے پیدا کرنے کے قائل تھے۔ شعر و غزل اور انشا پردازی کے زور سے تاثیر پیدا کرتے تھے اور اکثر حالات میں اندازِ بیان جذباتی ہوتا تھا۔ بایں ہمہ ظفر علی خاں کی شاعری کو صناعانہ بیان اور بعض دوسرے انفرادی پہلوؤں کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ یہ محض وقتی یا اخبار نویسانہ نظم گوئی ہے۔ ان کی شاعری میں کچھ ایسے جواہر بھی ہیں جو راکھ کے اندر سے چمک کر ادب کے ہر انصاف پسند مورخ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی:

ظفر علی خاں طنزیات میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں جن کے یہاں شدت تو ہے لیکن زہرناکی کا گزر نہیں۔ ان کی طنز میں عملاً قوت اور بیداری پائی جاتی ہے۔ وہ تپش کے قائل ہیں تپسیا کے نہیں۔ اس مزاج اور انداز کا نادر الکلام اردو شاعر اور نثر نگار اس صدی میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی پیروی کرنے والے چالیس پچاس سال میں جس کثرت سے پیدا ہوئے اور ان پر جتنی گہری چھاپ ظفر علی کے لب و لہجہ اور تیور و تحریر میں ملتی ہے، ہندوستان کی شاید ہی کسی اور زبان کی صحافت یا صحافیوں میں مل سکے۔

حکیم احمد شجاع:

ان کے کلام میں آمد ہی آمد تھی آورد نہیں تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ہم نے کئی مجلسوں میں انھیں دیکھا ہے اور ایسا صاحبِ کمال کسی کو نہیں پایا کہ سنگلاخ قافیے میں انھوں نے فی البدیہہ ایسے شعر کہہ دیے ہوں۔ ان کی محبتِ رسولؐ اظہر من الشمس ہے۔ شاعری میں ان کی ذہانت ایک ودیعتِ الٰہی تھی۔ نعتِ رسولؐ جو انھوں نے لکھیں، وہ ایسے صدقِ دل سے

لکھیں کہ ان کی ہر نعت نے مقبولیتِ عام کا درجہ حاصل کر لیا۔"

مولانا الطاف حسین حالی :

"ان کا قلم جادو رقم نہیں، اعجاز رقم بھی ہے۔"

داغ دہلوی :

"اردو زبان پر ظفر علی خاں کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔"

مولانا شبلی :

"انھوں نے مترجم کی حیثیت سے مصطلحاتِ علمی کے ترجمہ میں بہت سے الفاظ خود پیدا کیے۔"

رئیس احمد جعفری :

"ہندوستان کے اخبارات میں زمیندار نے قوم و ملک کی راہ میں جن شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا ہے اور جس حیرت انگیز استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ ہر شخص مانتا ہے۔" (سیرتِ محمد علی ص ۱۵۹)

مولانا صلاح الدین احمد :

"مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی سے متاثر ہو کر مسلمان سے مسلمان سودا خریدے کی تحریک، ختمِ نبوت کے عقیدے پر اپنے خیالات کا شدت سے اظہار کرنا، سرکاری کاسہ لیسوں کے بخیے ادھیڑنا، اس کے علاوہ ان گنت قومی مسائل میں دلیرانہ راہ نمائی کرنا۔ اس پر مستزاد علمی و ادبی میدان میں ہم عصروں سے نوک جھونک جاری رکھنا اور اپنی زبان کا سکہ جمانا انھی کا حصہ تھا۔ جب مستقبل کا کوئی انصاف پسند مورخ اس خطۂ ارض میں فرنگ کے زوال کی داستان لکھے گا تو ظفر علی خاں کا نام اس داستان کا عنوان بنے گا۔"

ہندوستان میں سنسر شپ کی تاریخ

اور

"زمیندار" کی ضبطیاں

۱۸۱۸ء سے قبل انڈین پریس لارڈ ولزلی کے حکم کے تحت سنسر شپ کی گرفت میں تھا۔ اور ہر اخبار کو اپنے مضامین شائع کرنے سے قبل چیف سیکرٹری کے دفتر میں بھیجنا پڑتے تھے تاکہ ان کے قابلِ اشاعت ہونے کے متعلق اجازت دی جائے اور ایڈیٹر اس امر کے لیے پابند تھا کہ جو کچھ حاکم اعلیٰ اس میں سے کاٹ دے، اس کو نکال دیا جائے۔ اور اگر وہ اس حکم کے بجا لانے سے انکار کرے تو اس کا ڈیکلیریشن منسوخ کر دیا جائے۔ اور اس کو ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حکم کا خوف کسی نافذ شدہ قانون سے زیادہ سخت تھا۔ اور چوں کہ اس کا اطلاق ہی اینگلو انڈین ایڈیٹروں پر ہوتا تھا۔ اس لیے کوئی ایڈیٹر اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکا۔ لیکن لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں یہ حالات بالکل بدل گئے اور ہفتہ وار بنگالی اخبارات کے اثرات زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ اس حقیقت نے لارڈ ہیسٹنگز کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ مقامی اخبارات انگریزی اخبارات کی مانند آزادانہ بحث میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اور ان سے یہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ سنسر شپ کا موجودہ قانون ہندوستانی اخباروں پر اس لیے لاگو نہیں ہو سکتا کہ ان کو ملک سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ایک یورپین نے ایک اخبار نکالا اور سنسر شپ کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایک نئے قانون کی ضرورت ہوئی۔ اور ۱۹ اگست ۱۸۱۸ء کو نئے قانون کو گورنر جنرل اِن کونسل کے حکم سے جاری کیا گیا اور ان کو ایسے مباحثہ سے روکا گیا جس سے آپس میں تلخی بڑھے اور نجی جھگڑوں، دھوکے بازی کے واقعات اور ذاتی حملوں سے عدم پرہیز ان سب باتوں کی اشاعت آرٹیکل میں ممنوع قرار دے دی گئی۔ البتہ شائع ہونے سے قبل مضامین کو دفتر میں دکھا دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس طرح سنسر شپ کے خاتمے کا خوش گوار اعلان ہوا۔ اور انگریزوں نے ایک جلسہ کر کے گورنر جنرل کو مبارک باد بھی دی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ایک وفد سے کہا تھا کہ ہمارا مقصد صرف اپنی رائے دینا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ایسا رواج معین ہو جائے

کہ ایڈیٹر پوری آزادی کے ساتھ اپنی صحیح اور رسمی رائے کا اظہار کر سکیں۔

لارڈ ہیسٹنگز کے بعد جارج کیننگ ممبر بورڈ آف ڈائرکٹرز نے لارڈ ہیسٹنگز کی اس رائے سے اصولی طور پر اختلاف کیا۔ لیکن یہی امر طے پایا کہ قرارداد ایک مدت کے بعد ہی تبدیل کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۲ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے استعفا دے دیا۔ اور اس موقع پر مسٹر سنسر شپ کا معاملہ بورڈ کے ڈائرکٹرز کے سامنے آیا جس میں انھوں نے (ممبران نے) چیئرمین سے اپیل کی کہ اس قانون کو دوبارہ جاری کر دیا جائے۔ چناں چہ یہ قانونِ سنسر شپ دوبارہ جاری کر دیا گیا۔

۱۸۲۵ء میں سر چارلس مٹکاف نے انڈین پریس ایکٹ کی پابندیوں کو کسی قدر کم کر دیا تھا لیکن لارڈ ٹلن (۱۸۷۵ء تا ۱۸۷۸ء) نے اس قانون کو اور زیادہ سخت کر دیا۔ اس وقت انگریزوں کی یہی پالیسی تھی کہ جب تک لوگوں کو سختی سے نہ مارا جائے اس وقت تک کوئی رعایت نہ کی جائے۔ ۱۸۹۱ء میں ایک نوٹی فی کیشن مورخہ ۲۵ جون ۱۸۹۱ء کے ذریعے پریس کی زبان بندی کر دی گئی۔ ۱۸۹۷ء میں سر جیمز اسٹیفن نے کہا تھا کہ تم انگریزی اخبارات کو دیکھو اور جو کچھ وہ کہتے ہیں تم بھی کہو۔ وہ چاہے کچھ بھی حالات ہو جائیں، وہ کبھی حملہ آور ثابت نہیں ہوئے۔

اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں پریس ایکٹ نافذ ہوا جس نے گورنمنٹ کو یہ اختیار دیا تھا کہ نئے پرنٹنگ پریس سے اور اخبارات سے دو ہزار روپے تک ضمانت مانگی جا سکتی ہے اور پرانے اخبارات سے پانچ ہزار روپے تک۔ حالاں کہ لارڈ ولنزی نے وعدہ کیا تھا کہ اس ایکٹ کا موجودہ پریس پر اطلاق نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ قانون کا انتظام پولیس کے ہاتھ میں نہیں دیا جائے گا لیکن یہ دونوں وعدے غلط ثابت ہوئے اور لارڈ سنہا لا ممبر نے اس کو قانون کی شکل دے دی۔ ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ پر بم کے حادثے کے بعد پریس کی سختیاں اور زیادہ بڑھ گئیں اور جنگِ عظیم شروع ہونے کے بعد اس کے غلط استعمال کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔ چناں چہ مولانا محمد علی کا ایک پمفلٹ چھپا تھا جس کو بغیر وجوہات بتائے ضبط کر لیا گیا۔ حالاں کہ ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کی رُو سے اس کی وجوہات بتانا ضروری تھا، لیکن کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ بلکہ چیف جسٹس کلکتہ ہائی کورٹ نے مولانا محمد علی کو اس خوف سے نجات دلائی تھی کہ ان پر بغاوت کا کوئی مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اگر ایک آدمی کے متعلق کوئی حقارت کا لفظ ہو یا طبقے کے متعلق ملامت کا ذکر ہو یا حکومت پر نکتہ چینی ہو تو حکومت اس نکتہ چینی پر اس اخبار کو ضبط کر لینے کا حق نہیں رکھتی ہے۔ چیف جسٹس نے لکھا تھا کہ میں تو ایسی چیزوں سے غیر معروف ہوں بلکہ حکومتِ برطانیہ کے گزشتہ عہد میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ جب کہ صرف کاغذ پر کوئی فیصلہ کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف ملزم کو کوئی موقع بھی نہ دیا جائے کہ وہ کوئی گواہی دے

سکے اور کوئی اور جرح بھی نہ کی جا سکے۔

لیکن اس کے باوجود نیو انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر بیسنٹ کے ساتھ مدراس میں یہی واقعہ پیش آیا تو قائم مقام چیف جسٹس مدراس نے لکھا کہ اس طرح کوئی آدمی اس قانون کی زد سے پولیس نہیں رکھ سکے گا۔ اور اسی ایکٹ کے سبب مسٹر بیسنٹ کا ۱۹۱۷ء میں بیس ہزار روپیہ ضبط کر لیا گیا۔ اور جب لارڈ چیمس فورڈ سے ایک وفد نے ملاقات کی تو لارڈ نے وفد کو ڈانٹا اور جج صاحبان کو بھی تنبیہ کے احکام جاری ہو گئے۔

زمیندار کی ضبطیاں :

پہلی ضبطی مارچ ۱۹۱۲ء میں ایک ہزار کی ضمانت کی ہوئی۔ اور دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی (۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا محمد علی نے کامریڈ میں ایک زبردست احتجاجی اداریہ لکھا تھا کہ اگر زمیندار نے اٹلی یا روس کے رویے پر اور ان مسائل پر گفتگو کی تو ہم کنگ جارج کی رعایا ہیں، اٹلی یا روس کی نہیں اور پھر یہ کہ اگر لیڈران قوم پر کوئی تبصرہ کیا گیا ہے تو دفعہ ۱۲۴ اے کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس امر کی کوئی وضاحت بھی نہیں کی اور قابلِ اعتراض جملہ بھی ایسا مجمل ہے جس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ اس طرح ضلع مجسٹریٹ نے اپنی ذمہ داریوں کو دُہرا کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ اسے بحیثیت مجسٹریٹ ایک جرم کے متعلق تحقیق کرنا ہے حالاں کہ یہ ایک ادبی جرم ہے جس کی تحقیق ایک ادیب زیادہ بہتر طور سے کر سکتا ہے۔

ہم اس موقع پر تمام صحافیوں کو متحد ہو کر کھڑے ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں یا پنجاب گورنمنٹ سے کہا جائے کہ اس میں مداخلت کرے۔ اس طرح یہ زمیندار کی مدد نہیں ہے بلکہ ہماری مدد ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں "ٹریبیون" کے رویے کی بھی تعریف کرنی چاہیے کہ اس نے قانونی پہلوؤں کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا ہے۔

جنوری ۱۹۱۳ء کو زمیندار کا ذاتی پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اور دو ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی اور دس ہزار کی تازہ ضمانت طلب کی۔

۷ فروری ۱۹۱۳ء کو مولانا ظفر علی خاں نے لندن سے ایک خط کامریڈ کے ایڈیٹر کے نام لکھا جس میں تحریر کیا تھا کہ "ریوٹر نے ۱۴ جنوری ۱۹۱۳ء کو زمیندار پریس کی ضبطی کی خبر دی اور ایسے اخبار کی معطلی کی خبر دی جو ہندوستانی زبان میں سب سے کثیر الاشاعت اور تحریک پان اسلام ازم کا سب سے بڑا محرک تھا۔ ریوٹر کے الفاظ کے مطابق اس کی ضبطی کا سبب یہ تھا کہ اس میں ایک مضمون پان اسلامک تحریک پر شائع ہوا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس لفظ

کے متعلق ایسی غلط فہمی پھیلا دی گئی ہے کہ وہ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی ہر کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم ہماری کوششیں اس سلسلے میں برابر جاری رہنی چاہیئں کہ ہم اس غلط فہمی کو دُور کر دیں۔ زمیندار پر اس آہنی طمانچے کے بعد اب کامریڈ اور الہلال کی باری ہے۔ اس لیے کہ یہی آزاد مسلمان اخبار ایسے ہیں جو مسلمانوں کی برطانیہ کے زیرسایہ ترقی کے لیے سخت ترین جِدّوجُہد کر رہے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ بھی وہی ہُوا جو زمیندار کے ساتھ ہُوا ہے تو پھر مُسلمانوں کو اسی رجعت پسندانہ دَور میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہاں کی صُورتِ حال یہ ہے کہ کسی آدمی کو قطعی طور پر اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں کیا ظلم و سِتم ہو رہا ہے۔ اور یہاں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ہندوستان کے مسائل کے متعلق اور ہندوستانیوں کے عزائم سے ہمدردانہ رویّہ رکھتے ہیں۔ مَیں یہاں انگلستان کے دو چوٹی کے اخبار نویسوں ڈیلی نیوز اینڈ لیڈر اور مانچسٹر گارجین سے مِلا ہُوں۔ سابق الذکر اخبار برابر میرے ایسے خطوط شائع کر رہا ہے جو مَیں نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے لکھے اور جن میں پریس ایکٹ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی ضمن میں مَیں یہاں پارلیمنٹ کے کئی ممبران سے مِلا ہُوں اور وہ اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں میری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پروفیسر براؤن نے مجھے کیمبرج سے لکھا ہے کہ یہ امر انتہائی ضرُوری ہے کہ ان تمام پیراگرافس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے جو گورنمنٹ کی نگاہ میں قابلِ اعتراض تھے اور اس کے بعد آزاد اخبارات میں بحث کی جائے۔

زمیندار پریس کی ضبطی کے سلسلے میں سب سے پہلے انڈین نیشنل کانگرس نے فوری جلسہ کیا اور مجھے دعوت دی کہ مَیں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ چناں چہ مَیں نے ایک بیان تیار کیا جس میں مُسلم اخبارات اور مُسلم پرنٹنگ پریس کے خلاف ان تمام سختیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی جو ہندوستان میں کی جا رہی ہیں۔ چناں چہ یہاں کے نام وَر لوگوں نے یہ طے کیا ہے کہ ایک ایسا میمنی فیسٹو تیار کیا جائے جس میں ہندوستان کے حکّامِ وقت کے پریس ایکٹ کے سِلسلے میں جابرانہ احکامات کا جائزہ لیا جائے۔ یہ میمنی فیسٹو تیار ہو چکا ہے اور ہندوستان کے مقتدر لوگوں کے اس پر دستخط کرائے جا رہے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اگلے مہینے پارلیمنٹ میں اس موضوع پر بحث و مباحثہ ہوگا۔

اسی طرح انگلش پریس کا ایک حِصّہ بھی ہمارے ساتھ اظہارِ ہم دردی رکھتا ہے۔ اب یہ ہندوستانیوں کا کام ہے کہ وہ اپنی پوری ہمدردی کے ساتھ مناسب طریقے سے احتجاج کے ذرائع اختیار کریں۔ جہاں تک زمیندار کا تعلّق ہے مجھے یقین ہے کہ اِس کی ضبطی سے اِس کی

زندگی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ قوم کے بیدار جذبے نے اسی متحدہ عزم کے ساتھ قوم میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے اور مجھے امید ہے کہ قوم میری اس سلسلے میں پوری مدد کرے گی"

(زمیندار کی ضبطی پر انھوں نے ۲۵ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو لکھا تھا:

ہے کھٹکتا نگہِ برق میں خرمن میرا — خواب یہ ہے مگر اب دیکھیے اس کی تعبیر
آج ہے ناز مجھے اپنی گنہ گاری پر — مَیں کہاں ورنہ کہاں ان کا خیالِ تعزیر
مَیں جو وابستۂ فتراک ہوا خوب ہوا — اے خوشا بخت جو کہلاؤں تمھارا نخچیر
فائدہ اس سے اگر ضبط ضمانت کر لی — کاش بتلاتے مجھے ضبطِ فغاں کی تدبیر

لندن سے مولانا ظفر علی خاں نے اپنے بھائی چودھری غلام حیدر صاحب کو خط لکھا تھا کہ اپیل کی جائے چناں چہ چودھری صاحب کلکتہ گئے اور وہاں نارٹن صاحب بیرسٹر سے ملاقات کی اور راستے میں سر وزیر حسن سے بھی اس سلسلے میں ملے۔ دورانِ سفر ہی نواب وقار الملک سے نیاز حاصل کیا اور نواب صاحب نے انتہائی اخلاق کے ساتھ زمیندار کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس کے ساتھ مدد کا پورا پورا وعدہ کیا اور زمیندار کی مدد کے لیے ایک اپیل بھی جاری کی۔ لیکن پریس ایکٹ کی ناکامی کی وجہ سے زمیندار کا مرافعہ ناکام ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء میں واپس آئے تو اداریہ شائع ہوا جس کی بنا پر دس ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔

۱۹۱۵ء میں مسلم پرنٹنگ پریس کے نام سے دوسرا پریس قائم ہوا۔ یہ پریس بھی سر مائیکل اڈوائر کے حکم سے بند کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں اخبار دوبارہ نکالنے کی اجازت مل گئی لیکن دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی ضمانت داخل کر دی گئی۔

جولائی ۱۹۲۰ء میں سابقہ ضمانت ضبط کر لی گئی اور نئی ضمانت مانگی گئی اور اس کے ساتھ مسلم پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اسی سال وہ خود بھی گرفتار ہو گئے اور دسمبر ۱۹۲۰ء سے جب نیا اخبار نکلا تو نئی ضمانت طلب کی گئی۔

۱۹۲۵ء میں تیسرا پریس منصور اسٹیم پریس کے نام سے لگایا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں زمیندار کے نام نہاد ایڈیٹر سید لال شاہ کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور زمیندار سے پانچ ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

۱۹۲۷ء میں پلول کے ایک دریدہ دہن کی گستاخی پر انھوں نے ایک نظم "پلول کا گدھا" لکھی جس کے باعث پانچ ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ زمیندار کی ضمانت کی ضبطی کے بعد مولانا نے اکتوبر ۱۹۲۷ء کو حکم کا پورا متن مع ترجمہ اور وہ نظم دوبارہ زمیندار میں شائع کر دی۔ ان کی بنا پر

پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور مزید تین ہزار کی طلب کر لی گئی۔
۱۹۳۰ء میں تحریک نمک سازی میں مولانا ظفر علی خاں کو گرفتار کر کے گجرات جیل میں نظر بند کر دیا گیا اور زمیندار سے مزید تین ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ ؎

تم ضبط زمیندار کے نمبر نہیں کرتے
کرتے ہو حقیقت میں محمدؐ کا نشاں ضبط

(۱۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء)

۱۹۳۱ء میں کشمیر ایجی ٹیشن میں شہید الٰہی بخش کے نام سے نظم لکھی اخبار کے بارہ ایشوع ضبط کر لیے گئے۔ پھر پانچ ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی اور دس ہزار کی نئی ضمانت طلب کر لی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے مسئلے پر دس ہزار کی ضمانت ضبط کی گئی۔ ۱۹۳۴ء میں "تعزیر جرم عشق" نظم پر منصور اسٹیم پریس ضبط ہوا۔
۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تنظیم پر تین ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر کے پانچ ہزار کی نئی ضمانت طلب کی گئی جس کی وجہ سے اخبار چھ مہینے تک بند رہا اور پھر دوبارہ اپریل ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔
۱۹۴۰ء میں خاکساروں پر گولی چلی۔ زمیندار نے سر سکندر حکومت پر زبردست تنقید کی جس کی وجہ سے پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔
ٹوانہ وزارت نے زمیندار کی ضمانت ضبط کی اور پانچ ہزار کی دوسری ضمانت طلب کی۔
۱۹۴۶ء میں "فسادات بہار کا قاتل کون ہے"؟ یہ اداریہ لکھنے پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔
۱۹۴۷ء میں ممدوٹ وزارت نے ۱۵ دن کے لیے اخبار بند کر دیا۔
۱۹۵۲ء میں سرکاری اشتہارات دینے بند کر دیے گئے اور
۱۹۵۴ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ضمانت ضبط ہونے پر اخبار بند ہو گیا اور اس کے بعد جاری نہ ہو سکا۔

اس طرح زمیندار نے تنظیم ملی کے سلسلے میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں اور قومی تحریک اور اردو زبان کی خدمت کے لیے مسلم صحافت میں زمیندار ہی ایک ایسا اخبار تھا جو پے در پے ضبطیوں کے باوجود اور تین مرتبہ پریس ضبط ہونے کے باوجود برابر خدمت انجام دیتا رہا۔ اور پچاس سال سے زیادہ اس اخبار نے شعور ملی کے بیدار کرنے میں بھرپور کوشش کی۔ وہ خود بند ہو گئے لیکن ان کا اخبار بند نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے زمیندار کی قربانیاں اور اس کی خدمات عظیم الشان ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا ظفر علی خاں نے اس ضبطی کے سلسلے میں ایک نظم کہی تھی جو ایک اہم نظم تھی جس کے اشعار حسب ذیل ہیں:

دِل ضبط ، زباں ضبط ، فغاں ضبط ، قلم ضبط
دُنیا میں ہُوئے ہوں گے یہ سامان بھی کم ضبط

آنسُو مری آنکھوں کے گئے پہلے ہی سے سُوکھ
تھے ورنہ وہ اس فکر میں ان کا بھی ہو نم ضبط

پنجاب میں یُوں ضبط ہُوا آج زمیندار
بنگال میں جس طرح ہُوا کرتے ہیں بم ضبط

آزادیٔ اسلام کی ضبطی پہ ہے خوش تُو
ہو جائے کہیں یوں ہی نہ تیرا بھی دھرم ضبط

برطانیہ کا شیوہ رہا گر یہی کچھ روز
سُن لو گے عزیزو کہ ہُوئے دیر و حرم ضبط

(۱۹ر نومبر ۱۹۲۷ء)

لیکن اس کے باوجود ان تمام بندشوں نے ان کے کام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وہ ہر مرتبہ نئے ولولے اور جوش کے ساتھ کام شروع کر دیتے۔ گویا شاعر کا یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا ہے:

موجیم کہ آسُودگی ما، عدم است
ما زندہ از انیم کہ آرام نگریم!

۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۴ء میں "پلول کے گدھے" پر نظم کا ایک حصّہ کہا گیا ہے جس سے اخبار کی جُراتِ اظہار کا پتا چلتا ہے:

ناموسِ پیمبر کا نگہباں ہے زمیندار
پلول کے گدھے کو بھی ہے اس جُرم کا اقرار

اس عہد میں یہ جُرم نہیں عفو کے قابل
گھوڑے نہ اسے کیوں نگہ قہر سے سرکار

حیرت ہے کہ مانگی گئی کیوں اس سے ضمانت
جب ایسے گناہوں کی سزا ہے در و دیوار

حق بات کے کہنے سے یہ ہرگز نہیں ٹلتا
چھوڑے گا نہ اس اپنی روش کو یہ گنہگار

اب بھی یہی بہتر ہے کہ دیجے اسے سُولی
گولی سے اڑا دیجیے اس کو سرِ بازار

پہلی نظم شائع ہُوئی تو اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ اس نظم کی اشاعت پر منصُور اسٹیم پریس ضبط ہو گیا۔

زمیندار، الہلال اور ہمدرد

پاک و ہند میں تین ایسے صحافی تھے جو بہ یک وقت صحافی بھی تھے اور سیاست کے آزمودہ کار سپاہی بھی۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد، دوسرے مولانا محمد علی اور تیسرے مولانا ظفر علی خاں۔ تینوں نے اخبار بھی نکالے اور سیاست میں بھی عملی حصّہ لیا۔ یہ تینوں اخبارات اپنی خصوصیت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" وسط ۱۹۱۲ء میں جاری کیا جو نومبر ۱۹۱۴ء میں بند ہوا۔ ایک سال کے عرصے کے بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" کے نام سے جاری ہوا اور اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کی نظر بندی کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ دوسری مرتبہ جولائی ۱۹۲۷ء میں جاری کیا گیا۔ لیکن اب حالات پہلے سے مختلف تھے۔ "الہلال" بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ اب وہ سیاسی و مذہبی جریدے کی بجائے علمی و ادبی جریدہ تھا۔ اس دور میں مولانا آزاد بھی اس پر پوری توجہ نہ دے سکے اور وہ کبھی وقت پر نہ نکل سکا۔ آخر چھ مہینے جیسے تیسے جاری رہ کر بند ہو گیا۔[1]

شروع کے دور میں مولانا آزاد نے "الہلال" کے لیے بہترین آدمیوں کو بلانے کی بہت کوششیں کیں۔ مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور عبداللہ عمادی کچھ دنوں تک شریکِ ادارت بھی رہے۔ اس کا یہ دور داعیانہ اسلوبِ خطابت کا حامل تھا۔ اور اس کے مضامین علمی اصطلاحوں سے پُر ہوتے تھے۔ اس پرچے نے دنیا کی دوسری تحریکاتِ اسلامی کو عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ قرآنی مضامین اور بلند پایہ علمی مضامین کے سبب یہ عام لوگوں کی دسترس گاہ علمی سے بہت بلند تھا۔ مولانا کی رانچی میں نظر بندی نے "الہلال" کو بند کرا دیا۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں البلاغ جاری ہوا۔ اس کا خاص مقصد بھی قرآن و سنّت کے معارف و دعوت کو مخصوص طور پر پھیلانا تھا۔ اس کے ابواب، مقالات، اسوۂ حسنہ، مذاکرہ علمیہ، انتقاد و تاریخ و سیر وغیرہ پر مشتمل تھے۔ لیکن مولانا کے رانچی چلے جانے کے بعد کوئی پرچہ نہیں چھپا۔ تحریکِ ترک موالات کے دور میں ہفتہ وار "پیغام" بغرض دعوت و ارشاد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے تعاون سے نکلا تھا۔[2]

مولانا محمد علی کا اخبار "ہمدرد" پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا اور ۱۹۱۴ء

تک جاری رہا۔ دُوسری مرتبہ ۱۹۲۲ء میں جاری ہُوا اور ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ "ہمدرد" کو "کامریڈ" کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصِل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب خود ان کے طویل اداریے ہوتے تھے۔ اس میں طویل اختلافی مسائل اتنی تفصیل سے بیان کیے جاتے تھے اور اس قدر شعلہ بیانی سے لکھے جاتے تھے کہ اس جذبے کی شدّت نے خود مسلمانوں میں کئی مسائل پیدا کر دیے۔ اُردو اخبار میں طویل نویسی اور سیاسی کاموں میں گہری دِلچسپی نے "ہمدرد" کے کام کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اراکین ادارہ اسی سبب سے وقت پر اخبار شائع نہیں کر سکے۔ اسی لیے ان کے کئی ساتھی کام چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ بلند پایہ سیاسی اخبار سیاسی مسائل پر بے لاگ تبصرے کرتا تھا۔ مُسلمانوں کے حقوق کی حفاظت میں ہندو مُسلم جھگڑوں میں اور اتحادِ ملّی کے مسائل میں وقیع صورت اختیار کرتا لیکن نہ مولانا کو فرصت مِلتی نہ اداریہ لکھا جاتا۔ اِس لیے یہ بہت کم عرصے زندہ رہا اور مولانا محمد علی کی سیاست میں مشغولیت کے باعث مُسلم صحافت کا آزاد ترجمان اخبار بند ہو گیا۔ مولانا محمد علی کے بیان میں ایک خاص خوبی یہ ہوتی تھی کہ اُنھوں نے کبھی بھی اپنے کِسی حریف کی کمزوریوں کو اچھالنے کی کوشش نہیں کی۔ دلائل سے اور پوری وضاحت سے مسائل پر تبصرے کیے اور بے لاگ رائے دی۔ "ہمدرد" کے اداریے آج بھی پاک و ہند کی سیاست کو سمجھنے کے لیے اہم مقالے ہیں۔ اس لیے اس کا رنگ زیادہ تر سیاسی تھا اور "الہلال" کا رنگ زیادہ تر بلکہ بے حد علمی تھا۔ "زمیندار" ان دونوں اخباروں کے درمیان ایک وسطی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اپنی پالیسی اور باقاعدگی کے علاوہ عوامی مزاج سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ گویا عوام کی آواز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طویل عرصے تک ادبی، سیاسی اور صحافتی خدمت کرتا رہا۔

حواشی:

(۱، ۲) عبدالرزاق ملیح آبادی: ذکرِ آزاد، کلکتہ ۱۹۶۰ء۔ (۳) عبدالماجد دریا آبادی: محمد علی ذاتی ڈائری۔ اعظم گڑھ۔ (۴) بقول سید سلیمان ندوی: "انگریزی دانوں نے "کامریڈ" کی اس سے زیادہ قدر کی جتنی اُردو دان طبقے کو "ہمدرد" کی کرنی چاہیے تھی۔" "ہمدرد" جن وجوہ سے بند ہُوا، اُن کا دُہرانا ضروری نہیں۔ البتہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۴ء کے "ہمدرد" میں اگر کچھ فرق ہے تو وہی ہے جو ۱۹۱۴ء کے مسٹر محمد علی اور ۱۹۲۴ء کے مولانا محمد علی میں ہے۔"
(باب التقریظ والانتقاد، معارف، جنوری ۱۹۲۴ء)

خاتمۂ کلام

ظفر علی خاں بیسویں صدی کے ایک نام وَر شاعر اور صحافی باپ کے صحافی بیٹے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور آرنلڈ اور شبلی جیسے نابغۂ عصر کے زیرِ تربیت اپنی تعلیم مکمّل کی اور شبلی جیسے قادر الکلام اور نقّادِ سخن نے ان کے شعر و ادب کے ذوق کو جِلا دی۔ وہ شبلی ہی تھے جنھوں نے غزل گوئی سے انھیں روک کر نظم نگاری کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور اس طرح ظفر علی خاں کی صلاحیتوں کو ایک نئے راستے پر لگا دیا۔ ظفر علی خاں طبعًا برق جولاں تھے اور وہ اپنے ذہن اور عملی زندگی میں متوسّط طبقے کے تعلیم یافتہ حضرات سے بہت زیادہ آگے تھے۔ ان صلاحیتوں کے جوہر حیدر آباد میں آکر کھُلے اور ان کی طباعی اور فکرِ رسا نے وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں کو متاثر کیا اور ظفر علی کے مخلص احباب جیسے خواجہ غلام الثقلین، سیّد محفوظ علی، ڈاکٹر عبد الحق اور نام وَر شاعر داغ دہلوی، ظہیر دہلوی، نظم طباطبائی، میکش وغیرہ احباب نے ان تنقیدی صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں اُن کی ہمیشہ مدد کی۔ اس طرح ظفر علی خاں نے حیدر آباد کی اعلیٰ سوسائٹی میں ایک اعلیٰ مقام حاصِل کر لیا۔ وہاں انھوں نے انگریزی تحریروں کے فی البدیہہ معرکۃ الآرا ترجمے بھی کیے اور اپنی نظم گوئی سے آہستہ آہستہ لوگوں سے خراجِ تحسین بھی حاصل کرنے لگے۔ انگریزی پر عبور اور ترجمے میں مہارت نے ان میں نظم و نثر کا ایسا ملکہ پیدا کر دیا کہ انھوں نے دو مشہور کتابوں کا اردو میں ایسا نفیس ترجمہ کیا کہ داغ اور شبلی جیسے نقّادانِ سخن نے بھی ان کو داد دی۔

حیدر آباد کے علمی ماحول میں انھوں نے افسانہ اور دکن ریویو کے نام سے جو رسالہ جاری کیا تھا، وہ علمی و ادبی لحاظ سے بے حد وقیع ثابت ہوا اور ہندوستان کے مستند اربابِ قلم نے اپنی نگارشات سے دکن ریویو کی علمی و ادبی تحریک میں حصّہ لیا۔ اس طرح ان کے علمی اور ادبی مضامین اور اعلیٰ نظموں کے علاوہ مولوی عزیز مرزا، مولانا الطاف حسین حالی، ڈاکٹر عبد الحق، نواب معشوق جنگ، خواجہ غلام الثقلین، اکبر الہ آبادی، مولانا فضل حق بہاری جیسے مستند صاحبانِ قلم نے اپنے فیوضِ علمی سے دکن ریویو کے دامن کو مالا مال کیا اور اس طرح ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک دکن ریویو مختلف رکاوٹوں

کے باوجود نکلتا رہا اور ہندوستان کے مستند ادبی رسالوں میں اس کا شمار ہوا۔ اس کی کامیابی کا سہرا مولانا ظفر علی خاں کی علمی کوششوں کے سر ہے۔ مقالہ ہذا میں دکن ریویو کی ادبی خدمات اور مولانا ظفر علی خاں کے نگارشات کو واضح طور سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح دکن ریویو کی تاریخ سے اُن کی علمی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

حیدر آباد سے واپسی ان کے لیے نئی حوصلہ آزمائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور انھوں نے اپنے والد مرحوم کی ہدایت اور وصیت پر ملازمتوں کے ملنے کے امکانات کے باوجود اس اخبار سے اپنی ہمتوں کو مخصوص کر دیا جس کو ان کے والد نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اس وقت ایک معمولی درجہ کا اخبار تھا جس کی اشاعت آٹھ سو سے زیادہ نہ تھی۔ ظفر علی خاں نے یکم جنوری ۱۹۱۰ء سے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس طرح انھیں اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے کے لیے ایک نیا میدان مل گیا۔ اُن کا وطن کرم آباد اخبار کی اشاعت کے لیے ایک غیر موزوں مقام تھا۔ آخر کار چودھری شہاب الدین کے زرّیں مشورے پر سولہ مہینے کے بعد وہ کرم آباد سے لاہور آ گئے اور یہاں صحافتی برادری میں ان کا اخبار ایک نئی شان سے نکلا۔ اس میں نئے مضامین، دلچسپ خبریں، واقعات اور نظمیں اس انداز سے طبع ہوتی رہیں کہ ان کے ہم عصر اخبار وطن، ہندوستان، پیسہ اخبار، سب اپنی اہمیتیں کھوتے چلے گئے۔ بقول مولانا محمد علی "مولانا ظفر علی خاں نے اپنی انگریزی دانی اور زورِ قلم کی بدولت صحافت میں ایک اُونچا مقام حاصل کر لیا۔ وہ سب سے پہلے ادیب تھے جنھوں نے برطانوی امپیریل ازم کی اسلام دشمنی سے متاثر ہو کر اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنا اپنا قومی فرض سمجھا۔" ظفر علی خاں کا ہاتھ قوم اور سیاست کی نبض پر تھا۔ اور وہ زمانے کے تقاضوں کو نہ صرف یہ کہ جانتے تھے بلکہ ان کا قلم ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اہل بھی تھا اور تیار بھی۔ اس طرح ان کے اخبار نے ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کی تنظیم اور حمایت کے لیے عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ اس نے اپنے اداریوں کے ذریعے قوم کے شعور کو بیدار کیا۔ نئی سے نئی نظم لکھ کر شعر و سخن کی محفلوں کو گرمایا اور قارئینِ اخبار کے ذہنوں کو جلا بخشی۔ دُنیائے اسلام کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی محبت کا عملی ثبوت اس طرح دیا کہ وہ کئی لاکھ روپے چندہ جمع کر کے ترکی کی مدد کرنے کے لیے خود سلطانِ ترکی کی خدمت میں گئے۔ یہ عمل برطانوی سیاست کے اربابِ حل و عقد کو سخت ناگوار گزرا۔ ان کے اخبار نے پے در پے اور بے محابا حکومت پر تنقید کی، اور ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔ اس طرح "زمیندار" قوم کی آواز بن گیا۔

جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ آزادیٔ ہند

میں انھوں نے جس طرح عملی حصّہ لیا ہے ان تمام امور کو اس مقالے میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جیل میں اُن کی شخصیت اور کردار نے لوگوں کو متاثر کیا۔ زمیندار اخبار نے لوگوں میں آزادی کی لہر دوڑائی۔ نام ور لوگوں کو سیاست سکھائی۔ ایشیا میں برطانیہ کی حکمتِ عملی کا پردہ چاک کیا۔ ان سب چیزوں کا اس مقالے میں تفصیلی طور پر ذکر ہے اور ان اداریوں کو خاص طور پر لکھا گیا ہے۔ مولانا تاریخ و مذہب اور ادب کا بے حد اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ ہر کام نہایت سلیقے سے کرتے تھے۔ زبان و شعر پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وقت کے سیاسی مسائل، تحریکات اور حادثات و واقعات پر خصوصاً قادیانیت کے مباحث پر ان کی ایسی بلند پایہ اور دل چسپ نظمیں نکلتی تھیں کہ بقول نادم سیتاپوری ایک ایک روپے میں پرچہ بکتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ظفر علی خاں کے ہاں شعر کا تخلیقی فن صحافت کے ضمن میں اُبھرا لیکن ان کے ہاں تخلیقی شعور کا ایک ایسا مثبت پہلو ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ الفاظ کا ذکر ہو یا معانی کا، تشبیہات ہوں یا نئے استعاروں کی دریافت، نئی نئی تراکیب ہوں یا برجستہ قافیے، غرض نئے الفاظ اور اصطلاحیں سیکڑوں کی تعداد میں انھوں نے خود وضع کیں اور اظہارِ بیان کے لیے نئے نئے اندازِ بیان اختیار کیے اور عام الفاظ کو ایک نیا مفہوم بھی دیا۔ گھسے پٹے الفاظ کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا اور اس طرح انھوں نے شعر میں تاریخ، ادب اور سیاست کو اس طرح ملا دیا ہے کہ ان کا جُدا ہونا گویا گوشت سے ناخن کا جُدا ہونا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان کی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو حتی المقدور پیش کرنے کی ادنیٰ سی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ ان کی شاعری نے فکر کے نئے سانچے ڈھال کر اصطلاح سازی کی اور اس طرح ظفر علی نے میکالے کا جواب اپنی شاعری اور صحافت سے دے کر انگریزوں کو بتا دیا کہ اردو زبان کس قدر ذخیرۂ علمی سے مالا مال ہو کر دُنیا کی اہم ترین زندہ زبانوں میں اپنا مقام پیدا کر رہی ہے۔

ان کی شاعری میں اس بات کو خصوصیت سے واضح کیا گیا ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور اس پر عامل بھی تھے۔ انھوں نے اردو زبان اور ادب کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اُس کے دفاعی مورچوں کو اپنے سنگین قافیوں سے اور زیادہ مضبوط کر دیا۔

اس مقالے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کا سرمایۂ شعری تاریخی و ادبی تقاضوں سے پُر ہے اور انھوں نے اپنی عمرِ عزیز ایک بامقصد زندگی کے لیے صَرف کی۔ اور مسلمانوں کی ترقی اور احیاءِ اسلام کے لیے بدرجۂ کمال کوشش بھی کی۔ اس مقالے سے ان کی مجاہدانہ خدمات کا پوری طرح پتا لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ (خواہ وہ سیاست میں ہوں یا شاعری میں یا صحافت میں) چوں کہ ان کی نظمیں سماجی و ملّی مسائل کے متعلق غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، وہ تنقیدِ حیات بھی کرتی

ہیں اور تعمیرِ حیات بھی۔ ان کی شاعری نے عمل کی دُنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ اُن کی زبان دانی نے انگریزی ادب کے مختلف اثرات ہمارے ادب میں نمایاں کیے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے بلند پایہ ادب و افکار سے تمتع حاصل کیا تھا۔ مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے کر کے نئی نئی اصطلاحیں اردو شاعری میں داخل کیں۔ نیچرل شاعری پر فلسفیانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ اس لیے ان کی شاعری زندگی میں توانائی کا دوسرا نام ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار اخبار کے ذریعے جو صحافتی خدمات انجام دی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں :

(۱) انھوں نے صحافتی اصطلاحیں ایجاد کیں اور اپنے اخبار میں استعمال کیں۔

(۲) صحافتی شاعری میں انھوں نے مقامی ماحول کی مختلف ہزاروں اصطلاحوں کو ادبی سانچے میں ڈھال کر سیاست کی تعمیر کے لیے استعمال کیا۔

(۳) صحافتی ہنگامہ آرائیوں میں بھی شاعری کی اہمیت کو بدستور قائم رکھا اور ان کے ادبی ذوق نے مشکل اور کڈھب قافیے اس طرح استعمال کیے جس طرح کسی ماہرِ فن انجنیئر کے ہاتھ عمارتی سامان کو فنِ تعمیر میں استعمال کرتے ہیں اور اس چیز کے برمحل استعمال سے عمارت کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۴) ظفر علی خاں نے ستارۂ صبح کے ذریعے اپنے علمی مضامین میں مسئلہ قادیانیت کے سلسلے میں ختمِ نبوت، نبوت ظلی اور بروزی کے مسائل، مسئلۂ تصوف میں طریقت و شرع، مسئلۂ وحدت الوجود، مسئلۂ سماع پر بحث کی۔ اسی طرح فارسی شعرا کے کلام پر تبصرے کیے۔ ادبیاتِ عرب پر عالمانہ مضامین لکھے اور ادبی اور سیاسی مضامین شائع کیے۔ اس طرح زمیندار میں تمام اسلامی تحریکات پر اہم خطبے اور مضامین، جدید ایرانی ادب پر مضامین۔ اسی طرح طویل سیاسی مضامین اور ملک کے مجوزہ دستور اور مسلم حقوق کی پاس داری کے متعلق طویل اداریے۔ کانگرس اور لیگ کے سلسلے میں طویل مقالات، آزادیٔ صحافت کے لیے بے باکانہ اداریے۔ مسلم صحافت کی طرف داری پر ہائی کورٹ کے فیصلوں پر طویل تبصرے۔ تحفظ تہذیبِ اسلام اور تحفظِ مساجد کے لیے تنظیم قوائے اسلامیہ، نیز تحریکِ مسلم بازار کے لیے ان کے مضامین، نظمیں، اداریے اور تقریریں اس اخبار کی خصوصیات ہیں۔ زمیندار اخبار نے مختلف تحریکوں کے متعلق خصوصی ضخیم نمبر نکالے۔ یہاں تک کہ زمیندار اخبار کے ذریعے دو نئے اخبار (۱) ٹوڈی (۲) زمیندار انگلش ایڈیشن بھی نکلے۔

(۵) ان کی شاعری اور بدیہہ گوئی نے ان کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ فکاہات کے عنوان

سے دِل چسپ طنزیہ لکھے اور اس طرح مزاحِ لطیف کا مذاق عام کیا۔ اور ان کی زبان دانی نے بے شمار الفاظ ہماری زبان میں ایسے رائج کر دیے جو متروک ہو چکے تھے، وہ سِکّہ رائج الوقت بن گئے۔

(۶) اس طرح انھوں نے کھُلم کھُلا آزادیٔ فکر، آزادیٔ عمل، آزادیٔ زبان اور آزادیٔ تحریر کے لیے ایک عظیم جہاد پچاس برس تک جاری رکھا۔ مسلم لیگ کی تحریک کو اس شان سے آگے بڑھایا کہ اس میدان میں ان کا کوئی ساتھی اتنی دیر تک اور اتنی طویل مُدت تک ایسی عظیم الشان خدمات انجام نہ دے سکا۔

زیرِ نظر مقالے میں حتی الوسع کوتاہیٔ قلم و فکر کے اعتراف کے ساتھ پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی سعی کی گئی ہے۔ اور چوں کہ ان پر اب تک کوئی تحقیقی کام مفصّل و مکمّل طور پر نہیں آیا ہے اس لیے اس راہ پر قدم اٹھایا ہے۔ شاید یہ ادنیٰ سی کوشش اہلِ علم کے لیے قبولِ خاطر بن سکے۔

اس سلسلے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی نگرانی اور ذاتی دِل چسپی اور عِلمی لگاؤ نے "زمیندار" کو صحافت کا دبستان بنا دیا تھا۔ اور اس دبستان نے نہ صِرف صاحبانِ علم اور قلم کو اپنی صلاحیتوں کو پیش کرنے کے زرّیں مواقع دیے، اور ان کی علمی کاوشوں نے عِلمی، ادبی، سیاسی و ادبی و صحافتی مسائل و مباحث کو بہتر سے بہتر طور پر پیش کیا۔ اور ہر نئے آنے والے کی ہمّت افزائی کی گئی جس کے باعث سیکڑوں افراد صاحبِ قلم اور صحافی بن گئے۔

یہ بیان ایک مفصّل تشریح کا طالب ہے (جو ہمارے موضوع سے خارج ہے) لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ پنجاب میں مُسلم صحافت کا جو پودا پروان چڑھا وہ مولانا ظفر علی خاں کے ہاتھوں کا لگایا ہوا تھا۔ ان نام ور صحافیوں میں مولانا عمادی، مولانا غلام رسُول مہر، عبدالمجید سالک، وجاہت جھنجھانوی، مرتضیٰ احمد میکش، چراغ حسن حسرت، مولانا حسین میر کاشمیری، ممتاز ملک، خدا بخش اظہر، اظہر حسن زاہدی، دِلبر حسین مسحور، عبداللہ بٹ، شورش کاشمیری، نازش رضوی، قاضی احسان اللہ مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات ان کے ساتھ ان مجاہدانہ کوششوں میں برابر کے شریک رہے اور ان کا تعاون ناقابلِ فراموش ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ سب مولانا کی معنوی اولاد ہیں۔ "زمیندار" کا دبستانِ صحافت ان ہی حضرات کی کوششوں اور کاوشوں سے وجود پایا۔ اس مقالے سے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

ابوالکلام آزاد	غبارِ خاطر	مکتبۂ مصطفائی۔ کشمیری بازار۔ لاہور
احمد شجاع	لاہور کا چیلسی	(نقوش لاہور)
اے آر راجپوت	تاریخ مسلم لیگ	
اسلم پرویز	انشا اللہ خاں انشا	مکتبۂ شاہراہ۔ دہلی۔ ۱۹۶۱ء
اعجاز حسین (ڈاکٹر سید)	مذہب اور شاعری	اردو اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۵۵ء
	مختصر تاریخِ ادب اردو	
	نئے ادبی رجحانات	
احتشام حسین	تنقیدی جائزے	احباب پبلشرز۔ لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء (طبع سوم)
اشتیاق حسین قریشی (ڈاکٹر)	ملتِ اسلامیہ	کراچی یونی ورسٹی۔ کراچی۔
اختر انصاری	افادی ادب	مطبوعہ "امروز" کراچی۔ ۱۹۵۱ء
اختر جوناگڑھی	صحافتی ادب	ملتان۔ ۱۹۶۴ء
افضل حق چودھری	تاریخِ احرار	ادارۂ فروغِ اردو۔ لکھنؤ۔ ۱۹۵۴ء
آل احمد سرور	ادب و نظریہ	
	نئے اور پرانے چراغ	
امین زبیری	ذکرِ شبلی	مکتبۂ جدید۔ لاہور۔ نومبر ۱۹۵۴ء
اشرف عطا	ظفر علی خاں	سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔ ۱۹۶۶ء
	کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشان تذکرے۔	
آمنہ صدیقی	افکار عبدالحق	اردو اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۶۲ء
ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)	انیسویں صدی میں اردو صحافت۔	مجلسِ مصنفین۔ علی گڑھ
احسن مارہروی	تاریخ نثر اردو	مطبوعہ ۱۹۳۰ء

افتخار عالم	محمڈن کالج ہسٹری	مطبوعہ ۱۹۰۱ء
امداد صابری	تاریخ صحافت اردو (ہر سہ حصّہ)	
	فرنگیوں کا جال	چوڑی والان - دہلی
اشرف حسین	اختر شہنشاہی	۱۸۸۸ء
احمد علی مرزا	ذکر بہا	ادارۂ معارفِ اسلام - لاہور
الطاف حسین حالی	مقالات حالی	انجمن ترقی اردو - ۱۹۳۳ء
بدر شکیب	اردو صحافت	۱۹۵۲ء
برج موہن (پنڈت)	اب سے آدھی صدی پہلے کے اخبارات	رسالہ اردو ۱۹۳۵ء
تمکین کاظمی	داغ	آئینۂ ادب - لاہور-
حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	آگرہ - ۱۹۵۷ء
حسن نظامی	غدر کے اخبار	
حسن ریاض	پاکستان ناگزیر تھا	کراچی یونی ورسٹی - ۱۹۶۷ء (بار اوّل)
چارلس ایڈمنز (ڈاکٹر)	اسلام و تحریک تجدد مصر- (ترجمہ عبدالمجید سالک)	۱۹۵۳ء مجلس ترقی ادب لاہور
چراغ حسن حسرت	مردم دیدہ	لاہور
رحیم علی ہاشمی	فنِ صحافت	انجمنِ ترقی اردو - دہلی - ۱۹۴۳ء
رئیس احمد جعفری	رندِ پارسا-	
"	دید و شنید-	
"	قائدِ اعظم اور ان کا عہد-	
"	سیرتِ مولانا محمد علی	
رشید احمد صدیقی	(۱) طنزیات مضحکات- (۲) ہم نفسان رفتہ	
رضا علی (سر)	اعمال نامہ	ہندوستانی پبلشرز - دہلی - ۱۹۴۵ء
رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	
رشید احمد	مسلمانوں کے سیاسی افکار -	لاہور-
رشید احمد صدیقی	ہم نفسان رفتہ	
سیّد محمد عبداللہ	مباحث	مجلس ترقی ادب - لاہور- فروری ۱۹۶۵ء-
"	چند نئے پرانے شاعر	اردو مرکز - لاہور-
"	اشارات تنقید	مکتبۂ خیابانِ ادب - لاہور ۱۹۶۶ء (بار اوّل)

ساجد صدیقی	ارمغانِ نعت	لکھنؤ	۱۹۶۲ء
سید حسین	امام غزالیؒ کا فلسفۂ مذہب و اخلاق - ندوۃ المصنفین - اردو بازار جامع مسجد - دہلی - ۱۹۶۰ء		
سید سلیمان ندوی	حیاتِ شبلی	۱۹۴۳ء - دارالمصنفین - اعظم گڑھ	
سلام سندیلوی	ادب کا تنقیدی مطالعہ		
عبدالمجید سالک	(۱) سرگزشت	قومی کتب خانہ - بار دوم - (۱۹۶۶ء) لاہور	
"	(۲) یارانِ کہن	چٹان پرنٹنگ پریس -	۱۹۶۷ء
شبلی	مکاتیب شبلی	دارالمصنفین - اعظم گڑھ	
شورش کاشمیری	ظفر علی خان	لاہور	۱۹۵۷ء
"	نورتن	لاہور	۱۹۶۷ء
"	چہرے	کراچی	
"	قیدِ فرنگ	لاہور -	۱۹۶۷ء
"	عطاء اللہ شاہ بخاریؒ	لاہور -	
شاہ علی (ڈاکٹر)	اردو میں سوانح نگاری	ادارۂ فروغِ اردو - لکھنؤ -	۱۹۵۸ء
شبیہہ الحسن نونہروی	تنقید و تحلیل -		
شریف الدین پیرزادہ	پاکستان منزل بمنزل	کراچی	
شوکت سبزواری	نئی پرانی قدریں	کراچی	
"	اردو لسانیات -	کراچی	
شجاعت علی سندیلوی	حالی بحیثیت شاعر		
(محمد) طاہر فاروقی (پروفیسر)	اردو نثر کے نمونے		
ظفر الملک علوی -	الاشرار		
عبادت بریلوی (ڈاکٹر)	خطباتِ عبدالحق		
"	اردو تنقید کا ارتقا		
عاشق بٹالوی (ڈاکٹر)	اقبال کے آخری دو سال -	کراچی	
عبدالحق (ڈاکٹر)	چند ہم عصر	انجمن ترقیِ اردو - پاکستان	
"	مضامینِ محفوظ علی	" " "	
"	مقدماتِ عبدالحق	دہلی -	

عبدالرحمٰن (شمس العلما) "مراۃ الشعر" جدید برقی پریس - ۱۹۲۶ء

عبداللہ یوسف علی "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ" ۱۹۳۳ء

عبدالماجد دریاآبادی "محمد علی، ذاتی ڈائری" اعظم گڑھ۔

عبدالسلام خورشید کاروانِ صحافت انجمن ترقی اردو - کراچی - ۱۹۶۴ء

" فنِ صحافت مرکزی اردو بورڈ - لاہور - اگست ۱۹۶۶ء

" صحافت پاک و ہند میں مجلس ترقی ادب - لاہور - ۱۹۶۳ء

عقیل احمد جعفری ریاض خیرآبادی

علی جواد زیدی (جنگِ آزادی میں اردو ادب کا حصّہ) تعمیرِ ادب - ادارۂ انیس - ۱۹۵۹ء

عبدالقیوم (ڈاکٹر) حالی کی نثر نگاری مجلس ترقی ادب - لاہور - ۱۹۶۴ء

عبدالقادر سروری جدید اردو شاعری

عبدالسلام اقبال کامل دارالمصنفین - اعظم گڑھ - ۱۹۴۸ء

عبدالاحد اردو غزل کے پچاس سال

عبدالرزاق ملیح آبادی ذکرِ آزاد دفتر آزاد ہند - کلکتہ ۱۹۶۰ء (بار اوّل)

عبدالرزاق کانپوری یادِ ایام

عبدالغفار، قاضی حیاتِ اجمل انجمن ترقی اردو - علی گڑھ

عبیداللہ خاں مقالاتِ یومِ شبلی اردو مرکز - لاہور - ۱۹۶۱ء

عبدالوحید خاں مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ ۱۹۴۸ء

غلام حسین ذوالفقار (ڈاکٹر) ظفر علی خاں

غلام حیدر ظفر الملّت (مسوّدہ غیر مطبوعہ)

غلام السیدین، خواجہ آندھی میں چراغ

غلام رسول مہر (۱) تبرکات آزاد۔ (۲) نقشِ آزاد۔ لاہور۔

غلام مصطفےٰ خاں (ڈاکٹر) علمی نقوش

" حالی کا ذہنی ارتقا۔

فقیر وحیدالدین انجمن - کراچی۔ ۱۹۶۶ء

کشن پرشاد کول۔ ادبی و قومی تذکرے

کلیم الدین احمد سخن ہائے گفتنی ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ۔ ۱۹۵۴ء

گارساں دتاسی خطبات دہلی۔

گارساں دتاسی — مقالات گارساں — انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی (بار اول) ۱۹۴۳ء

محمد اویس صدیقی (ڈاکٹر) — شرح احوال و سبک اشعار کمال الدین وحشی (پایان نامہ بجامعہ طہران در ۱۹۶۹ء)

محمد یامین — نامۂ اعمال۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء

محی الدین زور — تاریخ ادبیات اردو

محمد سرور — مضامین مولانا محمد علی۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔ ۱۹۴۰ء

محمد احسن — ادبی تنقید

معین جذبی — حالی کا سیاسی شعور۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۹ء

مسعود حسن — ہماری شاعری

محمد جعفر ایڈوکیٹ — احمدیہ تحریک — سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔

محمد رفیق افضل — گفتار اقبال۔ ریسرچ سوسائٹی پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۶۹ء

نور احمد سید — مارشل لا سے مارشل لا تک (جلد اول)

نور الحسن ہاشمی — ادب کیا ہے

نظیر حسنین زیدی (مرتب) — غالب تاریخ کے آئینے میں۔ کراچی۔

انقلاب ایران۔

نہرو — کچھ پرانے خطوط۔ حصہ اول و دوم۔

وزیر آغا — اردو شاعری کا مزاج۔ جدید ناشرین۔ لاہور۔ مئی ۱۹۶۵ء (طبع اول)

اردو ادب میں طنز و مزاح۔ " اپریل ۱۹۶۶ء (طبع دوم)

"رسائل"

علی گڑھ انٹر کالج میگزین۔ جلد ۱۔ نمبر ۸۔ نومبر ۱۹۲۹ء

علی گڑھ میگزین۔ اپریل ۱۹۳۸ء و ۱۹۵۴ء

ماہ نو۔ کراچی۔ .. .. .. نومبر ۱۹۶۶ء

برگ گل۔ کراچی۔ (سرسید نمبر: اردو کالج)۔

نقوش۔ لاہور۔ شخصیات نمبر۔ آپ بیتی نمبر۔ خطوط نمبر۔ طنز و مزاح نمبر۔

ہمایوں۔ لاہور۔ ۱۹۵۲ء

چٹان (ہفتہ وار) لاہور۔ مختلف نمبر

الہلال۔ کلکتہ .. .. جون ۱۹۱۳ء
الحمرا۔ لاہور .. .. دسمبر ۱۹۵۶ء
معارف۔ اعظم گڑھ۔ .. .. .. مختلف نمبر
صحیفہ۔ لاہور .. .. جنوری ۱۹۲۸ء و مختلف نمبر
نئی تحریریں۔ لاہور .. .. .. حلقۂ ارباب ذوق۔ ستمبر ۱۹۵۳ء
ادبی دنیا لاہور .. (۱) مولانا تاجور۔ (۲) مولانا صلاح الدین احمد۔ مختلف نمبر ۱۹۵۳ء
الزبیر (بہاولپور) .. .. .. آپ بیتی نمبر
نگار۔ لکھنؤ .. .. حسرت نمبر
العلم۔ کراچی .. .. مختلف نمبر
ادب لطیف۔ لاہور .. .. .. مختلف نمبر
قومی زبان۔ انجمن ترقئ اردو۔ .. .. کراچی
اردو (سہ ماہی) .. .. کراچی
اردو نامہ .. .. کراچی
ہمدرد۔ دہلی .. .. ۱۹۲۶ء۔ ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۲۸ء
زمیندار۔ لاہور .. .. مختلف ایشوع
پیسہ اخبار۔ لاہور .. .. ۱۹۰۹ء۔ ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۲۰ء

انقلاب لاہور۔ سیاست لاہور۔ منادی دہلی۔ الصباح لاہور۔ مدینہ بجنور۔ مجاہد سکھر۔ الوحید (سندھی اخبار) کراچی۔ جنگ کراچی۔ نوائے وقت۔ لاہور۔ احسان لاہور۔ اور انصاف لاہور کے مختلف نمبر۔

ENGLISH BOOKS

B.Pattabhi Sita Ramaya — History of Congress Allahabad, 1935.

Annie Besant — How India Fought for Freedom. (Theosophical Publishing House, Adyar Madras, 1915)

Razi Wasti — Lord Minto & the Indian Nationalist Movement, 1905-1910. (Clarendon Press, 1st. Edition, Oxford University Press 1964).

Ram Gopal — Indian Muslim. Biography of Faizle Haq.

G.Allana	Qaid-Azam Jinnah. Karachi, 1967.
Rafique Afzal	Speeches & Statements of the Quaid-i-Azam. 1911-34, 1947-48 (Research Society of Pakistan, Lahore).
Dr.S.A.Latif	Influence of English literature on Urdu literature
Mohammad Latif	History of Lahore.
Dr.Ishtiaq Hussain Qureshi	The Struggle for Pakistan.
Dr.W.Zaman	Towards Pakistan
A.B.Rajpoot	Muslim League yesterday and today.
Choudry Khaliquzzaman	Pathway to Pakistan
Choudry Mohd Ali	Emergence of Pakistan
Mehdi Hussain	Bahadur Shah II (Delhi, 1958)
M.A.H.Isphahani	Quaid-e-Azam. As I know him.

MAGAZINES

1. Comrade — Moulana Mohd Ali
2. Indian Review
3. Hindustan Review